میرا گاؤں
غلام الثقلین نقوی

غلام الثقلین نقوی کا شاہکار ناول "میرا گاؤں" حقیقت نگاری اور اظہار بیانی کے حسین امتزاج کا ایک پاکیزہ اور جوہر نمونہ اور فن کا ایک شاہکار ہے۔ اس پلاٹ، کردار، نفسیاتی بصیرت، منظر نگاری، ادبی محاسن اور زبان و بیان کے لحاظ سے اُردو ادب کے صفِ اوّل کے ناولوں میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اس مقولے کے مصداق کہ "پکے سو میٹھا ہو" ناول نگار نے اس کی تصنیف پر جو پانچ سال صرف کیے ہیں اُن کے ایک ایک لمحے نے ناول کے انگ انگ میں فن کی جوت جلا کر اپنی پوری پوری قیمت ادا کر دی ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری

غلام الثقلین نقوی کے ناول "میرا گاؤں" کی خوبی یہ ہے کہ اس میں دیہات کو ایک زندہ کردار کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ نقوی صاحب نے پوری فضا کی عکاسی کے لیے ناول کے کرداروں کو سطح پر ابھارا ہے تو زرعی عمل، معاشرتی رسوم اور دیہات کی فطرت کو اجاگر کرنے میں بھی کمال چابک دستی سے کام لیا ہے۔ "میرا گاؤں" سے جو خوشبو اٹھتی ہے اُس میں پاکستانی دھرتی کی باس ہے۔ یہ ایک کشادہ نظر اور عالی ظرف پاکستانی ادیب کا ناول ہے جس میں پاکستانی دیہات کو اپنے اصلی رنگوں میں پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی قدر و منزلت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اس کی عظمت کو کسی دنیاوی انعام سے ماپنا ممکن نہیں۔

ڈاکٹر انور سدید

غلام الثقلین نقوی کے افسانوں میں کہانیوں کی بُنت کاری نہایت مضبوط اور دلچسپ، اُن کے کردار جیتی جاگتی تصویریں، زبان بامحاورہ، میٹھی اور ٹکسالی لفظوں کا استعمال برمحل، مکالمے برجستہ، تشبیہہ اور استعارہ سحر انگیز اور سب سے بڑھ کر فلیش بیک تکنیک کے استعمال میں ایسی چابک دستی کہ پیوند کاری کا کہیں شائبہ تک محسوس نہ ہو۔ خصوصاً دیہات نگاری میں انھیں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ جونہی قلم اٹھاتے "الفاظ سانس لینا شروع کر دیتے" مگر کیا مجال کہ ان کے قلم نے کبھی بہکنے کی کوشش کی ہو۔ یہی وہ "کمالِ فن" ہے جس کی بدولت انھیں فکشن لکھنے والوں میں نہ صرف الگ طور پر پہچان لیا جاتا ہے بلکہ ادبی دنیا میں انھیں ایک منفرد و ممتاز مقام بھی حاصل ہے۔ اُن کا ناول "میرا گاؤں" کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے جس کی مثال اُردو ادب میں شاید ہی مل سکے۔ پاکستان میں چین کے سابق سفیر او شوڈ لین اس انوکھے اور منفرد ناول کا ترجمہ چینی زبان میں کر چکے ہیں جسے حال ہی میں شائع کیا گیا ہے۔

شاہد شیدائی

میرا گاؤں

غلام الثقلین نقوی

ابلاغ پبلشرز ○ لاہور

دوسرا ایڈیشن ـــــ ۲۰۰۴ء

میرا گاؤں ـــــ دوسرا ایڈیشن

ناشر : محمد جمیل انبسی
طابع : منظور عام پریس، لاہور
سرورق : ریاظ
کمپوزنگ آرٹ : رضوان
قیمت : ۲۵۰/-

یکے از مطبوعات ـــــ

ابلاغ پبلشرز، مین مارکیٹ، اردو بازار
لاہور، فون: ۷۲۱۱۵۶۹

انتساب

اپنے پوتے پوتیوں کے نام!
اس امید کے ساتھ کہ اس ناول کی وساطت سے ان کا
تعلق اپنے دادا ابا اور اپنے گاؤں بھڑتھ سادات سے قائم
رہے گا جہاں سے دور نیلم کی دیواریں نظر آتی ہیں اور
سکون اور عظمت کی علامت بن کر دل میں اتر جاتی ہیں۔

مصنف کی دوسری تصانیف

۱۔ بند گلی (افسانے)
۲۔ لمحے کی دیوار (افسانے)
۳۔ نغمہ اور آگ (۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں افسانے)
۴۔ شفق کے سائے (افسانے)
۵۔ دھوپ کا سایہ (افسانے)
۶۔ سرگوشی (افسانے)
۷۔ نقطے سے نقطے تک (افسانے)
۸۔ اک طرفہ تماشا ہے (مزاحیہ مضامین)
۹۔ ارض تمنا (مکہ و مدینہ کا سفرنامہ)
۱۰۔ چل بلیا اگلے شہر (لندن اور ویلز کا سفرنامہ)
۱۱۔ ز مینس سے ز مینس تک (اندرون ملک سیاحت نامہ)
۱۲۔ تین ناولٹ (چاند کی بیٹا، شیرا اور شیر زمان)

لاہور سے چک مرلو تک

سمرسٹ ماہم نے اپنے کچھ ناولوں میں اپنے آپ کو کرداروں اور پلاٹ کے درمیان ایک کڑی بنایا ہے۔ جب وہ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو چھٹی دیتا ہے اور پیرس کے کسی تصویر خانے کی سیر کو یا دریائے سین کے کنارے ٹہلنے کو نکل جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں اس کی اپنے زیر تصنیف ناول کے کسی کردار سے اچانک ملاقات ہو جاتی ہے اور ناول کئی صفحے آگے بڑھ جاتا ہے۔ میں جب یہ ناول لکھ رہا تھا تو میرا بھی کئی بار جی چاہا کہ "چک مرلو" جا کر اپنے کسی کردار سے ملاقات کر آؤں۔ لیکن ناول کی تصنیف کے دوران مجھے "چک مرلو" جانے کا موقع نہ ملا۔

اچھا ہوا کہ موقع نہ ملا۔

میں نے اس ناول میں جس گاؤں کی تخلیق کی ہے اس کا حدود اربعہ اُس گاؤں سے بالکل مختلف ہے جسے میں نے چک مرلو کا نام دیا ہے۔ اس کی تصنیف کے دوران میں یہ گاؤں میرے تخیل میں آباد رہا۔ میں نے اس گاؤں میں پورے پاکستان کو آباد دیکھا یعنی قطرے میں دجلہ نظر آتا رہا۔ اس کی گلیوں میں چلنے پھرنے والے لوگ میرے ساتھ مصروف گفتگو رہے، میں ان کے دکھ درد میں شریک رہا۔ وہ میرا دل بہلاتے رہے اور میں اس چھوٹی سی دنیا میں مگن رہا۔

اس ناول کا پہلا لفظ میں نے ۲۹ دسمبر ۱۹۷۰ء کو لکھا۔ ۲۵ اپریل ۱۹۷۵ء کو آخری لفظ وجود میں آ کر کاغذ پر ڈھلک گیا۔ ترمیم و اصلاح کے بعد اس کی تکمیل ۹ دسمبر ۱۹۷۵ء کو ہوئی۔ پانچ سال کروڑوں لمحوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ دعویٰ تو سراسر جھوٹ ہو گا کہ ان کا ایک ایک لمحہ اس ناول پر صرف ہوا۔ زندگی کا ہر لمحہ اتنا قیمتی نہیں ہوتا جتنی کسی خاص لمحے کی وہ بصیرت جو لفظ میں ڈھل جاتی ہے۔ ایسے ہی لمحے زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ میں نے

انہیں اپنی بساط کے مطابق اس ناول کی تخلیق پر صرف کیا۔ میری زندگی کے یہ نہایت قیمتی لمے اس کتاب میں محفوظ ہیں۔

یہ ناول میں نے عبدالرحمٰن کی زبان میں لکھا ہے۔ وہی اس کا مرکزی کردار ہے لیکن ناول اس کے نہیں "چک مراد" کے گرد گھومتا ہے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں ہی اس ناول کا محور ہے۔ میں نے اس چھوٹی سی دُنیا کی ایک تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس تصویر میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی سعی کی ہے۔ لیکن چونکہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے' اسے اپنے اندر رچا کر صفحہ ء قرطاس پر منتقل کیا ہے' اس لئے شاید "حقیقت" کا وہ عریاں جسم آپ کو نظر نہ آئے جو معروضی حقیقت نگاری کا خاصا ہوتا ہے۔ تاہم اس زندگی میں طبقاتی تصادم بھی موجود ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو انسانی رشتوں کا وہ جذباتی آہنگ بھی جو ہمارے افسانوی ادب سے غائب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس تصادم میں دھماکے کی کیفیت موجود نہیں اور اس کے آہنگ سے کھرج کی سَر یقیناً غائب ہے۔

ہمارا گاؤں ایک سماجی اکائی ہے۔ اس میں ابھی تک آپ کو وہ انتشار نظر نہیں آئے گا جو شہر میں عام ہے۔ شہر میں ہر فرد ایک جزیرہ معلوم ہوتا ہے۔ گاؤں میں ہر فرد دوسرے سے زنجیر کی کڑی کی طرح وابستہ ہے۔ یہ رشتہ محبت کا بھی ہے اور دشمنی کا بھی۔ ممکن ہے کہ آئندہ پندرہ بیس سالوں میں وابستگی اور ہم آہنگی کی یہ کیفیت گاؤں کی سماجی زندگی سے غائب ہو جائے لیکن آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں' اس سماجی وابستگی کا یہ منظر ہر گاؤں میں واضح طور دیکھا جا سکتا ہے۔

"چک مراد" کسی جاگیردار کا گاؤں نہیں!

یہ چھوٹے چھوٹے کسانوں کا گاؤں ہے۔ اس گاؤں کا بڑا چوہدری بیس پچیس کھیتوں کا مالک ہے لیکن دو دو تین تین کھیتوں کے مالک بھی سماجی لحاظ سے اپنے آپ کو اس کے برابر جانتے ہیں۔ تاہم ان دو طبقوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ موجود ہے اور طبقاتی تصادم اسی فاصلے کی پیداوار ہے۔ ٹریکٹر اور ٹیوب ویل' بجلی اور کھاد کی وجہ سے ممکن ہے کہ یہ فاصلہ بڑھ جائے لیکن برادری اور اپنائیت کا رشتہ پھر بھی ختم نہیں ہو گا۔

اس ناول کے کردار بھی عام انسان ہیں جن میں اچھائی بھی ہے اور برائی بھی۔ اس میں نہ کوئی فرشتہ ہے اور نہ شیطان۔ کسی کی اچھائی اس کی برائی پر غالب ہے اور کسی کی

برائی کا پلڑا اس کی اچھائی کے مقابلے میں جُھک گیا ہے۔ میں نے خیر و شر کے تصادم کو کبھی اس حد سے آگے بڑھا ہوا نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کہ میرا مشاہدہ کسی فطری عصبیت یا خاص افتادِ طبع کا شکار ہو' تاہم اس ناول کے اندر خیر و شر کے تصادم میں آپ کو اُس گھن گرج کا احساس نہیں ہو گا جو پنجابی فلموں میں عام سنائی دیتی ہے۔

جب یہ ناول ختم ہوا تو مجھ پر مایوسی کی گھٹا چھا گئی۔ کسی کام کی تکمیل تک ہم ایک خواب کی سی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ جب یہ خواب حقیقت کی چٹان سے ٹکراتا ہے تو کرچی کرچی ہو کر بکھر جاتا ہے اور بکھرے ہوئے خواب کو سمیٹنا کس کے بس کی بات ہے!

چلئے دیباچہ تو مکمل ہو گیا!

ایک رسم ہے کہ دیباچے میں کچھ ہمدردوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو میرے سامنے جس غمگسار کا نام آتا ہے' وہ سجاد نقوی ہیں۔ وہ میرے چھوٹے بھائی ہی نہیں' میرے دوست بھی ہیں۔ اس ناول کی تخلیق میں وہ میرا ہر مرحلے میں جی بڑھاتے رہے۔ اس ناول کا ایک ایک لفظ انہوں نے دوبارہ پڑھا ہے۔ ایک بار تو اس کے کچے مسودے کی صورت میں اور دوسری بار کتابت کی تصحیح کے دوران میں۔

ناول کی عزیزم سید کلب عباس شیرازی نے جس محبت اور خلوص سے کتابت کی ہے اس سے میرے الفاظ کا ظاہری حُسن دوبالا ہو گیا ہے۔ اسی طرح برادرم ضیاء الحق قریشی صاحب نے ناول کو جس سلیقے اور اہتمام سے شائع کیا ہے' یہ بھی میرے لئے باعث مسرت ہے۔ میں ان دونوں حضرات کا قلب صمیم سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مدیر اوراق ڈاکٹر وزیر آغا بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ وہ اس ناول کو بالاقساط "اوراق" میں چھاپتے رہے۔ وہ اکثر ان ابواب کی تعریف کرتے رہے۔ ان کی وساطت سے میرا اور قاری کا رشتہ برقرار رہا ورنہ تخلیق سے اشاعت تک جو فاصلہ حائل ہو جاتا ہے' اس کی طوالت مصنف اور قاری دونوں کو طاق نسیاں کی نذر کر دیتی ہے۔

انور سدید' جواد حیدر نقوی اور صابر لودھی نے بھی مسودہ پڑھنے کی جو زحمت گوارا کی' اس مہربانی کا نقش میرے دل سے نہیں مٹ سکتا۔

اور آخر میں اوراق کے اُن قارئین کا ممنون احسان ہوں جنہوں نے اس ناول کی اقساط پڑھیں اور خطوط لکھ کر میری حوصلہ افزائی کی۔ پروفیسر صدیق جاوید' پروفیسر شاہد ملک'

پروفیسر زاہد نوید جو میرے رفقائے کار ہیں، اس ناول کی ہر قسط پڑھ کر خط لکھنے کی بجائے زبانی میرا دل بڑھاتے رہے۔ میں ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

میں برادرم ریاظ . کا بھی ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ اس ناول کو خوبصورت سرورق سے سجایا۔

غلام الثقلین نقوی

۲۵ فروری ۱۹۸۸ء — ۵۷، اے پونچھ ہاؤس سٹاف کالونی، لاہور

"میرا گاؤں"..... دوسرا ایڈیشن

"میرا گاؤں" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن سال دو سال کے بعد چھپ سکتا تھا لیکن بوجوہ نہ چھپ سکا۔ انیس بیس سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی تحریک چھوٹے بھائی سجاد نقوی کی طرف سے ہوئی۔ انہوں نے دلیل دی کہ لائبریریوں میں اس ناول کا کوئی نسخہ اگر موجود ہے تو اتنا بوسیدہ ہو چکا ہو گا کہ پڑھنے کے قابل نہیں رہا ہو گا یا اسے رائٹ آف کر دیا ہو گا۔

پاکستان میں ادبی کتاب کا چھپنا کبھی آسان نہیں رہا۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے تک پبلشر کوئی نہ کوئی ادبی کتاب چھاپ دیتا تھا۔ اب مصنف کو اپنے خرچ پر چھاپنی پڑتی ہے۔ مجھے ناشر سے کوئی گلہ نہیں، وہ مجبور ہے۔ ادب سٹال پر نہیں بکتا، سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کو گرانٹ نہیں ملتی یا ملتی ہے تو بہت کم ملتی ہے اور کوئی ادبی ادارہ، سرکاری یا غیر سرکاری — کتاب کے نکاس میں مدد نہیں دیتا۔ یوں میں محسوس کرتا ہوں کہ کتاب کی طباعت و اشاعت کوئی پبلشنگ ادارہ ہی بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ چنانچہ "میرا گاؤں" کا دوسرا ایڈیشن جناب جمیل الجسی صاحب کے تعاون سے طباعت و اشاعت کے مرحلوں سے گزرا ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

کبھی گاؤں ایک اکائی تھا اور زرعی معیشت اس کا محور تھی اور گاؤں کی پوری زندگی اس کے گرد گھومتی تھی۔ وہ لوگ جو کبھی کسان کے "سیپی" کہلاتے تھے، اب کارخانوں کے مالک ہیں اور کسان کے دست نگر نہیں رہے بلکہ کسان ان کا دست نگر ہو گیا ہے۔ میرے گاؤں کا نام چک مرلو ہے۔ وہ ٹیلی وژن کے ڈراموں کے وڈیروں اور زمینداروں کا گاؤں نہیں تھا، نہ اب ہے۔ اپنی کتاب "تین ناولٹ" کے ایک ناولٹ "شیرا" میں میں نے ایسے

گاؤں کی عکاسی بھی کی ہے۔ یہ کتاب حال ہی میں چھپی ہے۔
میرے اکثر دوست اور نقاد "میرا گاؤں" کو پڑھ چکے ہیں۔ میں اس کے دوسرے ایڈیشن کا ایک جواز یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اسے اپنے ہم عمر اصحاب سے بعد کی نسل تک پہنچاؤں۔

غلام الثقلین نقوی

۴۰۰۔ بلاک ۳ اے پنجاب ایمپلائز ہاؤسنگ سوسائٹی۔ لاہور

ایک گاؤں کی کہانی

ڈاکٹر وزیر آغا

اردو ناول کی داستانِ حیات کچھ ایسی قابلِ فخر نہیں، پچھلے ایک سو برس میں اردو زبان میں لکھے گئے اچھے ناولوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ انہیں بہ آسانی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ مرزا رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا" سے لے کر غلام الثقلین نقوی کے "میرا گاؤں" تک بمشکل چھ سات ایسے ناول ہوں گے جنہیں مغربی دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہمیں شاید ندامت کا احساس نہ ہو۔ ورنہ ہمارے بیشتر ناول ناقص مشاہدہ، فنی کمزوری اور تھکا دینے والے اسلوب کے باعث تیسرے درجے کی تخلیقات ہیں۔ یہ صورت حال مزید نازک اس وقت دکھائی دیتی ہے جب ہم اس بات کا احساس کرتے ہوئے کہ اس برصغیر کی ستر اسی فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے، یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے کل کتنے ناول نگاروں نے دیہات اور اس کی مٹی کو کہانی کا موضوع بنایا ہے کیونکہ ایسی صورتِ حال میں ہمیں پریم چند کے ناولوں کے بعد دیہات نگاری کے سلسلے میں غلام الثقلین نقوی کے علاوہ مشکل ہی سے کوئی اعلیٰ پائے کا ناول نگار دکھائی دیتا ہے۔ بے شک اردو افسانے نے بار بار گاؤں اور اس کی فضا کو چھوا ہے مگر اس صورت میں بھی گاؤں بطور ایک "کل" بہت کم افسانہ نگاروں کی گرفت میں آیا ہے۔ بعض نے گاؤں کو صرف اپنے کسی خاص نظریے کی عینک کے موٹے شیشوں سے دیکھا ہے اور بعض نے محض اس کے جلالی روپ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ پریم چند کے بعد اگر کسی کہانی کار نے گاؤں کو اس کے جمالی اور جلالی دونوں پہلوؤں سے دیکھا ہے اور اس مقام سے دیکھا ہے جہاں آسمان اور زمین، نر اور ناری کی طرح سدا ایک دوسرے کے روبرو ہوتے ہیں تو وہ غلام الثقلین نقوی ہیں۔ ان کا ناول "میرا گاؤں" گاؤں کو بطور ایک "کل" پیش کرتا ہے اور اگرچہ یہ ایک خاص گاؤں یعنی چک مراد کی کہانی پر محیط ہے لیکن اس میں دراصل پاکستان کی دھرتی پر اُگے ہوئے ہر گاؤں کا قصہ بیان ہوا ہے۔

وقت کی مسلسل یلغار کے آگے مشکل ہی سے کوئی دیوار ٹھہر سکتی ہے۔ لہٰذا ہر گاؤں داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے ایک مسلسل تغیر کی زد میں آکر تبدیل ہوتا رہتا ہے' مگر تمام تر تبدیلیوں کے باوجود ہر گاؤں کے عقب میں ایک مثالی گاؤں بغیر کسی تبدیلی کے سدا موجود رہتا ہے۔ غلام الثقلین نقوی نے چک مراد کی داستان کے سارے نشیب و فراز اور اس کے چہرے پر پڑنے والی ان گنت شکنوں اور لکیروں کے پیچھے اس مثالی گاؤں کی ایک جھلک دیکھ لی ہے جو گویا ازلی و ابدی ہے اور اگر کبھی کسی زبردست معاشرتی تبدیلی کے باعث جسمانی طور پر وہ باقی نہ رہ سکا تو بھی انسان کی روح کے اندر ایک سہانے موسم کی طرح ہمیشہ آباد رہے گا۔

"میرا گاؤں" اردو کے عام ناولوں کی طرح محض کرداروں کی کہانی نہیں گو اس میں متعدد نہایت دلکش کردار ابھرے ہیں۔ اگر قاری یہ سمجھے کہ "میرا گاؤں" ماہنے اور شیماں کی کہانی ہے جس میں چودھری اور اس کی توسیع یعنی سلی ویلن کا کردار ادا کرتے ہیں تو وہ اس ناول کے محض ایک پرت ہی سے آشنا ہو گا کیونکہ اس ناول میں ماہنا' شیماں اور سلی ہی نہیں مستری' بھا' حمیداں' ماسی ریشم اور چودھری رحمت خان بھی دراصل اس بنیادی اور مرکزی کردار کے دست و بازو ہیں جس کا نام چک مراد ہے۔ ناول دو طرح کے ہوتے ہیں یا تو وہ نظم کی طرح اتنے Compact اور مربوط ہوتے ہیں کہ ایک لفظ یا کردار کو بھی اپنی جگہ سے سرکا دیا جائے تو ساری عمارت ہی زمین بوس ہو جائے یا غزل کی طرح ہوتے ہیں کہ ان میں لاتعداد اکائیاں پلاٹ کے ردیف قافیے کی ڈوری میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں پروئی ہوئی ہوتی ہیں۔ "میرا گاؤں" ان میں سے کسی ایک سانچے کا ناول نہیں۔ اس میں بیک وقت نظم کا انضباط بھی ہے اور غزل کی ریزہ خیالی بھی' اس میں مختلف کردار اپنی اپنی کہانیوں کی خوشبو میں بسے ہوئے پورے پلاٹ کے ساتھ منسلک تو دکھائی دیتے ہیں مگر ساتھ ہی اس ناول میں گاؤں کا ایک مرکزی کردار بھی ابھرا ہے جس نے مرغی کی طرح گاؤں کے ان جملہ کرداروں کو اپنے پھولے ہوئے پروں کے نیچے چھپایا ہوا ہے۔ نٹ کھٹ چوزوں کی طرح ان میں بیشتر کردار پروں کے نیچے سے برآمد ہو کر آنگن میں آزادانہ گھومتے ہیں مگر جب ان پر کوئی سایہ جھپٹتا ہے یا فلک ناہنجار انہیں آنکھ دکھاتا ہے تو لپک کر دوبارہ پروں کی چھتری کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں وہ میلو ڈرامائی فضا موجود نہیں جو اس برصغیر

میں تخلیق ہونے والی بیشتر کہانیوں کا وصف خاص ہے۔ ہماری فلمی کہانیوں نے تو زیادہ تر میلو ڈراما پر ہی اپنی بنیاد رکھی ہے اور ہماری لوک کہانیاں بھی زیادہ تر میلو ڈرامائی کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں۔ ان میں نہ صرف کردار جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ پلاٹ کے اندر بھی نیکی اور بدی کی جنگ ایک انتہائی جذباتی اور رقت آمیز انداز میں ہوتی ہے' دوسری طرف "میرا گاؤں" میں زندگی کو بالکل اسی طرح پیش کیا گیا ہے جیسی کہ واقعتاً" وہ ہے۔ اس میں کردار ہلکی سی بغاوت تو کرتے ہیں اور سیدھی لکیر سے لحظہ بھر کے لئے منحرف بھی ہوتے ہیں لیکن جب انہیں گاؤں آنکھ دکھاتا ہے تو فوراً" وہ راہ راست پر آ جاتے ہیں۔ شیماں کو گاؤں بدر کیا جاتا ہے تو وہ آسمان کو سر پر اٹھائے بغیر ہی دھرتی سے اپنا بندھن توڑ کر چپکے سے چلی جاتی ہے۔ حمیداں کی شادی ہوتی ہے تو وہ ایک گمرے غم کو سینے سے لگائے گاؤں سے رخصت ہوتی ہے مگر جب چند روز کے بعد میکے واپس آتی ہے تو اپنی ازدواجی زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ ہو چکی ہوتی ہے۔ بھا کو چودھری جیل بھجوا دیتا ہے مگر جب وہ جیل سے واپس آتا ہے تو اس کی آنکھوں میں بس ایک معمولی سی چنگاری چمکتی ہے جو چند ہی روز میں راکھ ہو جاتی ہے' اور وہ کسی ایسی انتقامی کارروائی کا مرتکب نہیں ہوتا جو ہماری داستانوں اور فلموں کو بہت عزیز رہی ہے۔ اور تو اور ناول کا سب سے اہم کردار عبدالرحمٰن عرف ماہنا بھی تمام حالات و واقعات کو بٹ بٹ دیکھتا چلا جاتا ہے اور ہلکی سی بغاوت یا انحراف کے ضروری وقفوں کے بعد دوبارہ گاؤں کے پروں تلے سکون اور عافیت حاصل کرتا ہے۔ اردو کے شاید ہی کسی ناول میں زندگی کو اس کی واقعی صورت میں اس خوبی سے پیش کیا گیا ہو جیسا کہ "میرا گاؤں" میں! دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ "میرا گاؤں" کی کہانی مکانی اعتبار سے نہیں زمانی اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ یوں کہ اس میں رانجھا اور ہیر' مرزا اور صاحباں اور سوہنی اور مہینوال کے وہ کردار جو آرکی ٹائپس کی حیثیت رکھتے ہیں' جذباتیت کے عالم سے منقطع ہو کر ایک عام سی معاشرتی سطح پر بالکل عام سے کرداروں کی طرح سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کی نوجوان عورتوں میں ہیر' صاحباں اور سوہنی موجود تو ہیں مگر محض ایک جھلک کی حد تک! اسی طرح نوجوان مردوں کی آنکھوں میں رانجھا' مرزا اور مہینوال نظر تو آتے ہیں لیکن منفعل انداز میں! ویلن کے معاملہ میں بھی یہی انداز کارفرما ہے۔ مراد یہ کہ کرداروں کے اندر Proto-type ہر جگہ موجود ہے مگر اپنی تشدد

صورت میں ہرگز نہیں' چنانچہ غلام الثقلین نقوی کا کوئی بھی کردار نہ مجسم خیر ہے اور نہ مجسم شر بلکہ ان دونوں کا آمیزہ ہے۔ یہی اصل زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ مجسم خیر یا شر کے علمبردار کردار تو وہاں ابھرتے ہیں جہاں ان کا خالق ثنویت کی زد میں ہوتا ہے اور "میرا گاؤں" کا مصنف اس سے یکسر محفوظ ہے۔

غلام الثقلین نقوی کے اس ناول کا مرکزی کردار "گاؤں" ہے جو ایک فرد کی طرح خوشیوں اور غموں' برکتوں اور جنازوں' نفرتوں اور محبتوں سے بار بار آشنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے پیڑوں کے سائے میں کھڑے چوزوں کی چکار ہی نہیں سنتا بلکہ باہر کی آوازوں سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ یہ آوازیں کبھی تو بجلی کی گنگ گنگ اور ٹیوب ویل کی سسکار بن کر آتی ہیں اور کبھی سیلاب کے شور' رعد کی کڑک' خشک سالی کی سرگوشی اور بموں کے دھماکوں میں ڈھل کر نازل ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض آوازیں گاؤں کو صرف مس ہی کرتی ہیں۔ بعض سے اس کی دیواریں مسمار اور چادریں تار تار ہو جاتی ہیں اور بعض پورے گاؤں کو ایک ملبے میں تبدیل کر دیتی ہیں مگر گاؤں کو ختم نہیں کر پاتیں۔ دراصل غلام الثقلین نقوی کے گاؤں کے دو چہرے ہیں۔ ایک خارجی چہرہ جو کسانوں' کھیتوں' کھلیانوں' ڈھور ڈنگروں' پودوں' شاخوں اور خوشوں میں اپنا مظاہرہ کرتا ہے اور سدا فلک ناہنجار کی زد میں رہتا ہے اور فلک ناہنجار گاؤں کے اس چہرے پر خراشیں ڈالنے اور کبھی کبھی اس چہرے کو نوچنے اور بے ہیئت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ دوسرا چہرہ گاؤں کا داخلی روپ ہے۔ باہر کے طوفان اس کے پہلے چہرے کو تو ملیامیٹ کرنے کی سکت رکھتے ہیں اور بسا اوقات اسے تار تار بھی کر دیتے ہیں مگر اس کے دوسرے چہرے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ خشک سالی لمبے سانس بھر چکتی ہے اور سیلاب پیڑوں اور دیواروں کو منہدم کر چکتے ہیں اور جنگ کھیتوں اور مکانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر فارغ ہو چکتی ہے تو پہلے ہی نرم چھینٹے پر اجڑی ہوئی دھرتی کے اندر سے گاؤں کا یہ دوسرا روپ ایک بیج کی طرح اپنا اکھوا نکالتا ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئے عہد کا اعلامیہ بن جاتا ہے۔ یہ بات "میرا گاؤں" کے آخر میں ایک انتہائی فنکارانہ انداز میں سامنے آتی ہے۔

فنی اعتبار سے بھی "میرا گاؤں" ایک اعلیٰ پائے کی تخلیق ہے۔ اس کی ابتدا چڑیا کی چکار سے ہوتی ہے اور چڑیا انسانی بچپن کی علامت ہے۔ لہٰذا جب ناول اپنے بچپن کے ذکر

سے کہانی کی ابتدا کرتا ہے تو اس کے الفاظ بھی چڑیا کی چکار ہی کی طرح سنائی دیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بچپن جوانی میں قدم رکھتا ہے تو چکار کی جگہ منکار لے لیتی ہے اور پھر شہر کی طرف سے آنے والی بدبو اس شانگری لا میں نفرت اور منافقت کی تیز آندھی چلا دیتی ہے۔ ویسے تو اس بدبو کے کئی علامتی مظاہر ہیں مگر چکی شاید اس کا سب سے بڑا علامتی مظہر ہے۔ چنانچہ گاؤں میں نصب ہونے والی چکی پہلے تو گاؤں کی گندم کو پیستی ہے پھر اس کے کرداروں کو اور آخر آخر میں پورے گاؤں کو' اس کے بعد گاؤں تقدیر کی چکی کی گرفت میں آ جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظر نہ آنے والے دو پاٹوں میں پس کر بے جان اور بے ہیئت ہو جاتا ہے۔ تاہم آخر آخر میں جب چاروں طرف ملبے کے ڈھیر ابھر آتے ہیں' کھیت اور کھلیان اجڑ چکتے ہیں' اینٹوں کا ... زخمی اور ٹیوب ویل اپاہج ہو چکتا ہے تو یکایک بیری کے ایک مڑل سے سوکھے ہوئے پودے کی شاخ پر ہرے رنگ کی ایک چڑیا آ بیٹھتی ہے۔ (واضح رہے ہرا رنگ روئیدگی اور زرخیزی کی علامت نہیں پورے پاکستان کی علامت بھی ہے۔) شاخ جھول جاتی ہے اور جب چڑیاں چوں چوں کا نغمہ چھیڑتی ہیں تو "مٹھا" کنواں جنگنے لگتا ہے' ڈھول اور چرکڑ چلنے لگتے ہیں' کھیت جاگ اٹھتے ہیں اور گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ناول کے آغاز میں چڑیا کی چکار وہ "پہلا لفظ" ہے جس سے کائنات وجود ں آئی تھی اسی طرح ناول کے آخر میں چڑیا کی چکار صورِ اسرافیل کی طرح ہر شے کو دوبارہ جود میں لے آتی ہے۔ یہ فنی اہتمام Gone with the wind کے بعد پہلی بار مجھے کسی ول میں اس خوبصورتی اور لطافت کے ساتھ نظر آیا ہے۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں ایک آخری نکتے کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا وں۔ پچھلے ایک سو برس سے پنجاب ہی اردو زبان اور ادب کا سب سے بڑا مرکز ہے اور ی سرزمین پر اردو کی مختلف اصناف ایک ادبی نشاۃ ثانیہ سے آشنا ہوئی ہیں۔ مگر چونکہ خود جاب میں بھی زیادہ تر ادب شہروں میں تخلیق ہوا ہے اس لئے دیہاتی زندگی اس میں پوری ح منعکس نہیں ہو سکی' یعنی بیج کے کھلیان میں ڈھلنے تک کے جملہ مراحل اس میں ابھر ں سکے۔ پریم چند نے جب گاؤں کو اپنا موضوع بنایا تھا تو گاؤں' اس کی فضا' زرعی عمل ے مختلف مراحل اور ان سے وابستہ رسوم اور تہوار اس کی کہانیوں میں بڑے فطری طریق ے ابھرتے چلے آئے تھے' مگر پنجاب کے اردو مرکز بننے کے بعد پنجابی دیہات اردو ادب میں

دور دور ہی رہے۔ غلام الثقلین نقوی نے پہلی بار پنجاب کے گاؤں کو اس کی واقعی صورت میں اردو ادب میں منتقل کیا ہے تو بہت سے ایسے الفاظ جو پہلے اردو ادب کے لئے غیر مانوس تھے ایک نئی معنویت کے ساتھ ابھر کر اردو زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ جیسے پولا، سلا، بیساؤ، چک پھیریاں، بیبی، ملل، دھارنی، پھل چھلا، بنوں، سرلانا اور چر کڑ وغیرہ غالباً پہلی بار تجربے کے لمس سے آشنا ہو کر اردو ادب میں شامل ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں غلام الثقلین نقوی نے پنجاب کے دیہات کی اصل فضا، اس کی مٹی کی باس، دھوپ کی چمکاٹ، برکھا کی ٹھنڈی نمی اور خوشوں کی لہلاہٹ کو اس خوبصورتی سے گرفت میں لیا ہے کہ پورا گاؤں اردو ادب میں ایک انکھوے کی طرح نمودار ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ناول کی آمد کے بعد اردو ادب کی جڑیں یہاں کی دھرتی میں پوری طرح اترتی چلی جائیں گی۔

آخر میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ "میرا گاؤں" صحیح معنوں میں ایک پاکستانی ناول ہے کہ اس میں ہماری زمین کی بوباس ہی نہیں اس کے ستر اسی فیصد باشندوں کی خوشیوں، غموں، خدشوں اور امیدوں کو پہلی بار زبان عطا ہوئی ہے۔ ایسا ناول تو کبھی کبھار ہی تخلیق ہوتا ہے لیکن جب تخلیق ہوتا ہے تو اپنے عہد کا سب سے اہم واقعہ قرار پاتا ہے۔

وزیر آغا

باب ا

○

میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا جب ہمارے گاؤں میں آٹا پیسنے کی مشین لگی تھی! یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو اب تک میرے ذہن میں موجود ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ یوں بھی زندگی کی سیدھی لکیر پر کوئی ننھا سا موڑ آ جائے تو یوں لگتا ہے جیسے سفر کی ایک نئی منزل کا آغاز ہو رہا ہے اور میں جو زندگی کے سفر کا ایک معمولی سا راہی ہوں اور جس نے زندگی کے بہت کم اونچ نیچ دیکھے ہیں، اس موڑ پر کچھ دیر کے لئے ضرور ٹھٹکا تھا اور اس کے بعد سیدھی اور صاف پگڈنڈی کا رخ ذرا سا بدل گیا تھا۔

اب تو میرے گاؤں میں بھی پرائمری سکول قائم ہے لیکن میرے بچپن میں جب ابھی پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا، میں اپنے گاؤں سے تین میل دور گل بہار میں پڑھنے کو جایا کرتا تھا۔ میں پڑھائی میں اچھا تھا اور میرے استاد مجھ پر مہربان تھے، اس لئے بچپن کے اس زمانے کی یادیں اب بھی تازہ ہیں۔ یادیں کڑوی ہوں یا میٹھی، تازگی انہیں میں ہوتی ہے جو ـــــ نجانے کیا ـــــ آٹھویں جماعت پاس شخص کے پاس مناسب لفظ بھی کم ہوتے ہیں اور لوگ جب مجھے منشی عبدالرحمٰن کے نام سے پکارتے ہیں تو مجھے اپنی کم علمی پر شرم بھی آتی ہے۔ لیکن میں جو بات کرنا چاہتا ہوں اسے لفظوں کا لباس پہنانا بھی ضروری ہے ـــــ میرا مطلب ہے، اگر مجھے تصویر کھینچنی آتی تو کڑوی یادوں کو میں زمین کے اس ٹکڑے سے ظاہر کرتا جو ہرے بھرے کھیتوں میں ان سے الگ تھلگ نظر آتا ہے اور بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی جب اس ٹکڑے میں اگی جھاڑیوں میں سے گزرتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اس مایوس و نامراد بنجر ٹکڑے نے میری یادوں کو کڑوا بنا دیا ہو ـــــ یا انہیں کھیتوں کے درمیان سنگتروں اور مالٹوں کا وہ باغیچہ بھی تھا جس کی خوشبو اور جس کا رنگ اب تک میرے ذائقے میں مٹھاس گھولتا رہتا ہے اور اس سے دور شمال کی طرف نیلے پہاڑوں کی دیواریں ہیں۔ سردیوں کی بے

داغ دھوپ میں نیلے پربتوں کی چوٹیوں پر برف چمکتی ہے تو بچپن کی ساری یادیں اب بھی نیلے آنچلوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں ---

پر بات تو اسکول اور چلّی کی ہو رہی تھی۔

اُس دن سکول سے واپسی پر میں نیلے پربتوں کی طرف منہ کئے بیٹھا تھا اور سکول کا کام کر رہا تھا۔ گھر پہنچ کر کام کرنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ یوں بھی باغیچے میں بڑا سکون ملتا۔ چڑیاں چہچہاتیں اور تتلیاں اُڑتی پھرتیں۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ کوئی رنگ برنگی چڑیا میرے سر کے اُوپر کی شاخ پر بیٹھ کر مجھ سے ہم کلام ہو جاتی "ماہنے! او ماہنے!"

"کیا بات ہے منّی؟"

"ماہنے! او ماہنے!"

"کچھ کہو بھی --- نہیں تو مجھے کام کرنے دو۔"

"ماہنے! او ماہنے!"

"یہ تو نے ماہنے! او ماہنے کی کیا رَٹ لگا رکھی ہے؟" میں کونجی آواز میں کہتا اور چڑیا پھر سے اُڑ جاتی۔

اور چند لمحوں بعد ایک تتلی اُڑتی ہوئی آتی اور میرے سامنے سبز گھاس کے ایک تنکے پر بیٹھ کر پَر پھڑپھڑانے لگتی۔ تتلی کچھ نہ بولتی۔ ممکن ہے، وہ بھی مجھ سے ہم کلام ہوتی ہو پر میں اس کی آواز سن نہ سکتا تھا۔ میرا خیال ہے اُس کے پروں کی رنگ برنگی پھڑپھڑاہٹ میں کوئی آواز ضرور تھی اور اب جب میں قلم ہاتھ سے رکھ کر اُس کے متعلق سوچ رہا تھا تو مجھے رنگ اُڑتے ہوئے نظر آئے اور آواز کا جادو میرے دل میں نغمے جگانے لگا۔

یکایک گاؤں کی طرف سے ڈھول بجنے کی آواز آئی اور میرے کان کھڑے ہو گئے!

ڈھول کی آواز دور سے بہت سہانی معلوم ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ تال پر ناچنے کو جی چاہتا ہے۔ جبھی تو اب جب میری کنپٹیوں میں سفید بال آ چکے ہیں اور میری عمر کے لوگ میلوں ٹھیلوں میں شریک ہونے سے ہچکچاتے ہیں، ڈھول کی آواز پر میرے پاؤں خود بخود حرکت میں آ جاتے ہیں اور جب میرے پاؤں میرے جسم سے بالکل الگ تھلگ ہو جاتے ہیں، تو مجھے اپنے آپ کو یہ کہہ کر روکنا پڑتا ہے۔ "منشی عبدالرحمٰن اب تیرے دن بھنگڑا ڈالنے کے نہیں --- اب تو ---" میں بات کو کہاں سے کہاں لے گیا --- ڈھول کی آواز

سنتے ہی میں نے کھدر کے بستے میں کتابیں لپیٹیں اور تال پر ناچتا ہوا تیز تیز گاؤں کی طرف دوڑا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں بھی ناچ رہا تھا اور گندم کے سرسبز کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی بھی میرے ساتھ ساتھ سو سو بل کھاتی ہوئی ناچ رہی ہے۔

گاؤں کے مشرقی کونے پر لوگوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔ سارا گاؤں یہاں موجود تھا۔ بچے بھی، جوان بھی، بوڑھے بھی اور لڑکیاں اور عورتیں بھی۔ جب میں بھیڑ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے سلی سے ملاقات ہوئی۔ ہم اُسے سَلّی کہتے تھے، حالانکہ سکول کے رجسٹر میں جب اُس کی حاضری بولتی تو اُسے محمد سلیمان کے نام سے پکارا جاتا۔ آج وہ سکول سے غیر حاضر تھا۔ ماسٹرجی نے مجھے کہا تھا کہ اُس کی غیر حاضری کی خبر اُس کے باپ کو ضرور دے دوں۔ سَلی نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ہجوم میں اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا۔

میں نے اُس سے کہا "چھوٹے سفید پوش! کل سکول میں تیری پٹائی ہو گی۔ میں چوہدری صاحب کو تیری غیر حاضری کی خبر ابھی دوں گا۔"

"ضرور --- ضرور ---" اُس نے ناک سکیڑ کر کہا "ماہنے! آج تو ضرور شکایت لگا کر دیکھ --- تجھے بھی پتا ہے، آج ہماری چکی پہلی بار چلے گی۔ آج ابا مجھے کچھ نہیں کہے گا۔"

سَلی میرا ہم عمر ہے۔ کوئی ایک سال ہی تو چھوٹا ہو گا مگر ہم دونوں سکول میں اکٹھے داخل ہوئے تھے اور داخلے کے وقت ہماری عمریں آٹھ نو سال سے کیا کم ہوں گی۔ سلی تو خیر گاؤں کے نمبردار اور سفید پوش چوہدری شرف دین کا بیٹا تھا، اس لئے گل بہار میں سکول کھلا تو چوہدری اُسے وہاں داخل کروا آیا تھا۔ میرے داخل ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن چوہدری کو خیال آیا کہ سَلی کا کوئی ساتھی بھی تو ہونا چاہئے۔ اُس کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی۔ میں اُن دنوں گاؤں کے مولوی جی کے پاس قرآن شریف پڑھا کرتا تھا۔ مولوی جی کے نزدیک میں پڑھنے میں اچھا تھا۔ میرے باپ سے اُنھوں نے بھی سفارش کی اور چوہدری بھی ہمارے گھر آیا۔ میرے باپ نے بتیرا انکار کیا پر وہ نہ مانا۔

میرے باپ نے کہا "چوہدری! ماہنا میرا پہلوٹھی کا بیٹا ہے۔ اب وہ میرا ہاتھ بٹانے لگ گیا ہے۔ بیل ہانک لیتا ہے، چارا کاٹ لیتا ہے، کیارا موڑ لیتا ہے۔ پڑھنے لکھنے میں لگ گیا تو میرے کام کا نہیں رہے گا۔ بس دین اسلام کی کچھ کچھ خبر لگ جائے اُسے تو کافی ہے۔ کیوں مولبی جی؟"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے چوہدری موج دین! پر بڑے چوہدری کو ناراض کرنا بھی اچھا نہیں۔"

"موج دینا! اتنا خیال کر میں تیرے پاس چل کر آیا ہوں۔" چوہدری نے کہا۔

"تیرا آنا میرے سر ماتھے پر چوہدری! پر ماجے نے پڑھ لکھ کر کون سا پٹواری بن جانا ہے۔"

"میرا تیرا خدا ضامن ہے' ماجا پڑھ گیا تو میں اسے پٹواری ضرور بنوا دوں گا۔ آخر میں سفید پوش ہوں۔ تحصیل کچہری میں میرے جاننے والے بہت سے ہیں۔ میری اتنی سی بات بھی نہ مانی جائے گی بھلا۔"

"نہیں چوہدری!" میرے باپ نے کہا "کوئی اور کام بتا۔ میں نہ کروں تو بلا شک دوش دینا۔"

"موج دین!"

سفید پوش کا بدلا ہوا لہجہ سن کر میرا باپ کچھ گھبرا سا گیا۔

"کہو چوہدری!"

"نالے کے کنارے والے تین کھیتوں کا ٹھیکا اس سال مجھے پورا وصول نہیں ہوا۔"

"ہاں چوہدری! نہیں ہوا۔۔۔ نالے میں اتنا پانی نہیں آیا تھا۔ سارا سال جھلار بے کار رہی۔"

"میں نے اس سال کا باقی ٹھیکا تمہیں معاف کیا پر اگلے سال جو میں زمین کسی اور کو دے دوں تو تجھے انکار تو نہیں ہو گا موج دین؟"

"زمین تیری ہے چوہدری! میں کون ہوں انکار کرنے والا؟" میرے باپ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"چوہدری جی!" مولوی صاحب بولے "کل ماجا سکول پہنچ جائے گا۔۔۔ کیوں چوہدری موج دین؟"

"مولی جی! بڑے چوہدری کی بات کو میں کون ہوں ٹالنے والا؟ ماجے کو مدرسے بھیجنے میں اُس نے اس کا کچھ بھلا ضرور سوچا ہو گا۔" میرے باپ نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

دوسرے دن میں شُلی کے ساتھ سکول پہنچ گیا اور اب چار سال سے میرا اور شُلی کا

ساتھ تھا۔ پر ان چار سالوں میں میں اور سُلی دوست نہ بن سکے تھے۔ میں پڑھائی میں اس سے زیادہ ہوشیار تھا پر سُلی مجھے اپنے برابر نہ سمجھتا تھا۔ ہم ایک ہی برادری کے لوگ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ سُلی کے باپ کے پاس ہم سے کہیں زیادہ زمین تھی۔ ہماری زمین تقسیم ہوتے ہوتے ایک دو کھیتوں میں بٹ گئی تھی۔ پہلا سال تو ہم دونوں اکٹھے مدرسے جاتے اور اکٹھے واپس آتے رہے اگلے سال ہمارے گاؤں کے کچھ اور لڑکے بھی سکول میں داخل ہو گئے تھے۔ سُلی نے میرے ساتھ دوستی توڑ لی اور وہ ان لڑکوں کی ٹولی کا سردار بن گیا۔ پھر بھی سکول سے جو کام ملتا وہ سُلی مجھ سے زبردستی کرواتا رہا۔ ایک بار منشی جی نے ہم دونوں کی ایک جیسی لکھائی دیکھ کر ہمیں پیٹا تو میں نے سلی کا کام چھوڑ دیا۔ مجھے پڑھنے کا شوق تھا تو سُلی کو کھیل کود کا۔ سکول سے واپسی کے بعد وہ سارا وقت کھیل کود میں گزار دیتا اور میں باغیچے میں بیٹھ کر مدرسے کا کام پورا کر لیتا اور تب گاؤں پہنچنے کے بجائے سیدھا اپنے کنویں پر پہنچتا اور کام کاج میں باپ کا ہاتھ بٹاتا۔ سُلی اس بات سے بہت چڑتا تھا۔

گاؤں میں کبھی کبھار ہنگامہ ہوتا ہے۔ چکی کا پہلی بار چلنا سارے گاؤں والوں کے لئے ایک میلے سے کم نہیں تھا۔ میں میلے میں کھو گیا تو مجھے بالکل یاد ہی نہ رہا کہ کنویں پر جا کر مویشیوں کے لئے چارہ کاٹنا ہے اور دودھ کا گڑوا لے کر شام کو گھر پہنچنا ہے۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی یادیں دماغ میں کتنی پائداری سے نقش ہو جاتی ہیں۔ میں میلے میں گھوم پھر رہا تھا اور بھانت بھانت کی باتیں سن کر بڑا خوش ہو رہا تھا۔ چوہدری شرف دین لٹھے کا سفید تہمد اور لٹھے کا سفید کرتا پہنے اس پکے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا جس کے اندر انجن لگا تھا۔ اس کی کلف لگی پگڑی کا طرہ ہوا میں لہرا رہا تھا اور سہ پہر کی دھوپ میں اس کی کالی کالی مونچھوں میں کوئی کوئی سفید بال چاندی کے تار کی طرح چمک رہا تھا۔ چوہدری اس دن بڑا بارعب لگ رہا تھا۔ یوں بھی سارے گاؤں میں وہی ایک شخص تھا جو ہمیشہ صاف ستھرے سفید کپڑے پہنتا اور ان دنوں میرا خیال تھا کہ اسے انہیں کپڑوں کی وجہ سے سفید پوش کہا جاتا ہے۔

اس ہجوم کی دوسری بڑی شخصیت وہ مستری تھا جس نے چکی کا انجن چلانا تھا۔ یہ مستری شہر سے آیا تھا۔ وہ بوسکی کی قمیص اور پھانٹوں والا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی ننھی ننھی مونچھیں بڑی صفائی سے ترشی ہوئی تھیں۔ اس کے پاؤں میں زری کے چپل تھے اور

اس کی واسکٹ پر بھی زری کا کام ہوا ہوا تھا۔ سنہری دھوپ میں واسکٹ کے پھول جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔

نجانے کیوں! بابا نتھو اس بھیڑ میں مجھے سب سے الگ تھلگ نظر آیا۔ بابا نتھو گاؤں کے مغربی کونے میں ایک کچے مکان میں رہتا تھا جس کے آنگن میں اس کا خراس تھا۔ اس آنگن کے ایک کونے میں بکائن کا ایک درخت تھا جس کی چھتنار کا سایہ مجھے بڑا بھلا لگتا تھا۔ بابا نتھو اس خراس کا مالک تھا۔ لوگ اپنی اپنی جوگ لے کر آتے اور خراس سے دانے پیس کر لے جاتے۔ بابا نتھو کو پیاڑا مل جاتا۔ سردیوں میں دھوپ میں اور گرمیوں میں چھتنار کے سائے تلے اس کی جھلنگا سی کھاٹ بچھی ہوتی اور پاس ہی اس کی پوتی شیماں کھیل رہی ہوتی۔ شیماں مجھ سے یہی کوئی ایک دو سال چھوٹی ہو گی پر وہ میرے ساتھ کھیل کر بہت خوش ہوتی تھی۔ جب اتوار کو یا کوئی اور چھٹی ہوتی تو میں اس کے ہاں ریندھے کھیلنے کے لئے چلا جاتا۔ بابا نتھو تو ہمیں کچھ نہ کہتا لیکن خراس پر آنے والی کوئی بڑی بی اور خاص طور پر ماسی ریشو پھیں والی ناک پر انگلی رکھ کر ضرور کہتی: "یہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ کالے منہ والی کو کھیلنے کے لئے لڑکیاں نہیں ملتیں۔ موج دین کے بیٹے! کیا نام ہے تیرا؟ تجھے اس لڑکی کے ساتھ کھیلتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"شرم نہیں آتی!" میں سوچتا شرم کس بات کی؟"

اور زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوتی کہ بڑی بی نے شیماں کو کالے منہ والی کیوں کہا ہے حالانکہ اس کا منہ جو دھول اور آٹے میں اٹا نہ ہوتا تو کلی کی بہن حیداں سے زیادہ صاف اور گورا ہوتا۔ حیداں عمر میں ہم سے دو تین سال بڑی تھی اور باپ کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہنتی تھی۔ جو وہ سفید کپڑے پہنتی تو میں اسے "سفید پوشنی" کا نام دیتا۔

اب میں ایک عرصے سے شیماں کے ہاں کھیلنے کو نہیں گیا تھا حالانکہ شیماں کی پالی ہوئی بچھیا سے مجھے بہت پیار تھا۔ پر بات تو بابا نتھو کی ہو رہی تھی۔ میں نتھو سے شیماں اور شیماں سے حیداں تک پہنچ گیا اور بچھیا ان دونوں کے بیچ میں کلول کرنے لگی۔ یاد کے ایک نقطے سے کتنی پگڈنڈیاں پھوٹتی ہیں۔ قلم اٹھانے سے پہلے مجھے اس کا پتہ نہیں تھا کہ میں کن کن بھول بھلیوں میں کھو جاؤں گا۔

میں بابا نتھو کے پاس جا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

"شیطان کا کرخانہ۔" بابا نتھو بولا۔

میں نے سمجھا بابا نتھو نے مجھے کچھ کہا ہے۔ میں نے بڑے بھولپن سے کہا "بابا! میں تو ڈرتا ہوں۔"

"شیطان کا کرخانہ۔"

"بابا! شیطان یہاں کہاں سے آ گیا؟" میں نے ذرا چونک کر کہا۔

"یہیں ہے ماہنے' یہیں ہے!"

"کہاں ہے؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"اس کمرے کے اندر—— نجانے چوہدری کو کیا سوجھی کہ شیطان کا چرخا اس گاؤں میں لے آیا۔ لوگ میلہ دیکھنے آئے ہیں۔ ہوں میلہ! ابھی شیطانی چرخا چلے گا۔ گھرر گھرر—— اور پھر دیکھنا کیا ہو گا! گاؤں سے ساری برکت اٹھ جائے گی۔ کبھی شیطان بھی انسان کا دوست بنتا ہے؟"

"پر بابا! یہ تو آٹا پیسنے کی چکی ہے—— گل بہار میں تو کئی سالوں سے یہ چکی چل رہی ہے۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" میں نے دانا بنتے ہوئے کہا۔

"لڑکے! میں بھی جانتا ہوں۔ پر اس کے چلانے کو نہ بیل جتتے ہیں' نہ گدھے گھوڑے۔ پھر شیطان کے سوا اور کون ہے جو اسے چلاتا ہے؟"

مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو بابا نے کہا "بول ماہنے! کون چلاتا ہے چکی کے پاٹوں کو۔"

میں کھکھلا کر ہنس پڑا۔ "وہ مستری! اور کون؟"

"مستری انسان ہے یا جن؟"

"انسان۔"

"میرے خراس کے پاٹ تو اس وقت گھومتے ہیں جب دو بیل مل کر زور لگاتے ہیں۔ اس چکی کے پاٹ تو ان سے کہیں بڑے ہیں ماہنے۔"

"مجھے تو نظر نہیں آ رہے۔"

"جب وہ چھکڑے پر لد کر آئے تھے تو میں نے دیکھے تھے۔ اب بتا شیطان کے سوا کون ہے جو انہیں چکر دے گا۔ سفید پوش اچھا بھلا آدمی تھا۔ نجانے اسے کیا سوجھی کہ گاؤں

میں شیطانی چرخا لے آیا۔"

اس اثنا میں شیماں بھی آ گئی۔

اس نے پوچھا "بچے! تم اب ہمارے ہاں کیوں نہیں آتے؟"

"پڑھائی سے وقت ہی نہیں ملتا اور اب میں بڑا بھی تو ہو گیا ہوں۔"

"کتنے بڑے ہو گئے ہو؟" بابا نتھو نے مسکرا کر پوچھا۔

"ایک دو مہینوں میں چوتھی پاس کر لوں گا تو تیرہ سال کا ہو جاؤں گا۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"میں اور پڑھوں گا اور پھر پٹواری لگ جاؤں گا۔"

"تو اب تم رینٹھے کھیلنے بھی نہیں آؤ گے ماہنے؟" شیماں نے پوچھا۔

"نہیں!"

"گوری کو دیکھنے نہیں آؤ گے؟"

"کون گوری؟"

"بھول گئے؟ وہی بچھیا جو ہم نے پار سال لی تھی۔"

"ہوں! وہ بچھیا! تو تم نے اس کا نام گوری رکھ دیا ہے؟"

گوری کو دیکھنے کے لئے میرا جی للچا گیا۔ میں کسان کا بیٹا ہوں۔ مجھے ڈھور ڈنگروں سے اب بھی پیار ہے اور اس وقت بھی۔ وہ بچھیا کیا تھی پارہ تھی پارہ۔ سارے آنگن میں کدکڑے لگاتی پھرتی۔ سرخ رنگ، بے داغ چھریرا بدن۔ دو چار سال بعد وہ گاؤں کی سب سے زیادہ خوبصورت گائے بن جائے گی۔۔۔ اور شیماں۔۔۔ بہتی ندی کے تیرھویں موڑ کے کنارے پر کھڑے ہو کر میں نے شیماں کو غور سے دیکھا۔۔۔ ایک نظر۔۔۔ اور مجھے نجانے اپنی اس نگاہ پر شرم کیوں محسوس ہوئی جیسے کدکڑے بھرنے والی بچھیا نے ایک اور جست بھری ہو اور وہ عمر کی اس منزل کو چھو کر بھی میرا ہاتھ چاٹ رہی ہو جہاں سے جوانی کچھ دور نہ تھی۔ تب اپنے ہاتھ پر شیماں کے ہاتھ کی خنکی، گرمی اور نرمی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔ "میں گوری کو دیکھنے آؤں گا شیماں پر چھٹی کے دن۔"

اور تب میری توجہ گاؤں کی طرف سے آنے والی عورتوں پر لگ گئی۔ ان کے سر پر گٹھڑیاں تھیں۔ سب سے آگے چودھرائن تھی پر اس کے سر پر گٹھڑی نہیں تھی۔

اس کے پیچھے حمیداں تھی جو گٹھڑی اُٹھا کر ٹھمک ٹھمک چل رہی تھی۔ اپنے صاف ستھرے کپڑوں کی وجہ سے وہ باقی عورتوں سے الگ تھلگ معلوم ہو رہی تھی۔ جب وہ چکی پر پہنچیں تو سفید پوش نے کہا۔ "مستری تم انجن کو گرم کرو۔"

مستری نے انجن کے پہیئے کو چکر دیئے اور تب انجن چل پڑا اور پٹا حرکت میں آ گیا۔ کھکھو سے گنگ گنگ کی آواز نکلی تو بھیڑ نے چُپ سادھ لی۔

"مولوی جی! بسم اللہ کیجئے اور اپنے ہاتھ سے دانے چھاننے میں ڈالئے۔" چوہدری نے کہا۔ مولوی جی نے کچھ آیتوں کی تلاوت کرتے ہوئے حمیداں کی گٹھڑی اپنے ہاتھوں میں لے لی اور لکڑی کی دو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر تختوں پر پہنچے اور مستری کی مدد سے دانے چھاننے میں اُنڈیل دیئے۔ دانے ڈالتے ہوئے مولوی جی کانپ رہے تھے اور سفید پوش مسکرا رہا تھا۔ جب نیچے سے آٹے کی دھار پیپے میں گرنے لگی تو چوہدری نے ہاتھ بڑھا کر آٹا اپنے ہاتھ میں لیا اور بے اختیار ہو کر کہا۔ "کتنا باریک پس رہا ہے۔ میدہ ہے میدہ کِلی کی ماں!"

"جی!" چودھرائن نے کہا۔ "آٹے کو ذرا مٹھی میں لے کر دیکھو تو۔"

چودھرائن نے آٹا مٹھی میں لیا اور انگلیوں سے مل کر دیکھا۔ اس نے چہک کر کہا۔ "بڑا باریک پس رہا ہے۔" تب حمیداں کی باری آئی۔ آٹا اس کی مٹھی میں آیا تو اس کے چہرے کی سنولاہٹ مسکرا اٹھی۔ حمیداں کے بعد کِلی آگے بڑھا۔ مستری ایک گٹھڑ کے بعد دوسری چھاننے میں انڈیلتا رہا۔ اور لوگ آگے بڑھ بڑھ کر آٹے کو مٹھی میں مسلتے اور اس کی تعریف کرتے۔

بابا نتھو آگے نہ بڑھا تو سفید پوش نے کہا۔ "تم بھی آٹا لے کر دیکھو نتھو!"

نتھو دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ اس نے مٹھی میں آٹا لیا اور کہا۔ "لوفوا یوں لگتا ہے جیسے دانے جل گئے ہوں چوہدری!"

"کیا کہا؟ دانے جل گئے ہیں؟" چوہدری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"شیطانی کارخانے میں دانے جلیں گے نہیں تو اور کیا ہو گا؟"

"یہ بات کہتے ہوئے تیری جیبھ کیوں نہ جل گئی نتھو؟"

"میں نے جیبھ سے تو آٹا نہیں چکھا چوہدری!"

"کالی جیبھ والے! منہ اچھا نہ ہو تو بات تو اچھی کرنی چاہئے۔"

"چوہدری! تُو تو یونہی غصّے میں آ گیا؟"

"بابا اب اس کے خراس پر کوئی دانے پسوانے نہیں جائے گا۔ جبھی تو یہ ایسی باتیں کر رہا ہے۔" حمیداں بولی۔

"بیٹی حمیداں! میری قسمت کا دانہ مجھ سے کون چھین سکتا ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے، وہ روزی بھی دے گا۔ پر کسی بھگت نے کہا تھا۔ دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کو۔۔۔"

"بڈھے! زبان کو لگام دو۔" چوہدری نے غصے سے کہا۔

لوگوں نے بابا نتھو کو وہاں سے کھسکا دیا ورنہ چوہدری شاید اس پر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ بابا نتھو بڑبڑاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا اور چکی کے دو پاٹ گھرر گھرر چلتے رہے اور ان میں دانے پستے رہے اور آٹے کی دھار گرتی رہی اور چوہدری مسکراتا رہا۔

اور میں جو بارہ تیرہ سال کا بچہ تھا، اس تماشے کو دم بخود دیکھتا رہا۔

تب حمیداں لوگوں میں گُڑ بانٹنے لگی۔ اس نے میرے ہاتھ پر بھی گُڑ کی ایک بھیلی رکھ دی اور دوسرے ہاتھ سے میرے بازو میں چُٹکی بھی بھر لی۔ میں نے تلملا کر اس طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر کہنے لگی "ماجے! اب تم کتنے بڑے ہو گئے ہو۔"

"ہاں بڑا تو ہو گیا ہوں حمیداں۔۔۔ پر تجھے کیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ یونہی۔۔۔" اس نے شیماں کے ہاتھ پر گُڑ کی بھیلی رکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں شیماں؟"

"کیا؟" شیماں نے پوچھا۔

پر اتنے میں حمیداں کسی اور کے ہاتھ پر بھیلی رکھ رہی تھی اور شیماں نے بڑی بڑی حیران آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا "گوری کو دیکھنے چلو گے ماجے!"

"آج نہیں، اتوار کو آؤں گا۔ میری یہ گُڑ کی بھیلی لے جاؤ شیماں، گوری کو چٹا دینا۔" میں نے کہا۔

حمیداں نے مڑ کر مجھے بڑی گہری گہری نظروں سے دیکھا۔

میں نے بھیلی شیماں کے ہاتھ پر رکھ دی۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۲

○

ایک چھوٹے سے گاؤں کی زندگی کتنی ٹھہری اور رُکی رُکی معلوم ہوتی ہے، اس کا اندازہ کرنا ہو تو میرے گاؤں چلے آیئے!

اتنی خاموشی، اتنا ٹھہراؤ ملے گا یہاں آپ کو کہ آپ کا دم رُک جائے گا اور جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، میرا گاؤں اپنے ہی جوہڑ کی طرح اور بھی زیادہ ٹھہرا ٹھہرا اور رُکا رُکا سا تھا کہ میں جو اس گاؤں کا باسی ہوں، سوچتا تھا کہ کب کوئی کنکر پانی میں گر کر ننھے ننھے دائرے اور لہریں اٹھائے گا۔

آٹا پیسنے کی چکی چلی تو ٹھہرا ہوا پانی کانپ گیا۔

دوسرے دن سکول سے واپسی پر میں باغیچے میں مالٹے کے درخت کے چھاؤں میں بیٹھا ہی تھا اور ابھی میں نے کتاب بھی نہیں کھولی تھی، نہ ابھی کوئی رنگ برنگی چڑیا مجھ سے ہم کلام ہونے آئی تھی اور ابھی دُور گھاس کے ایک تنکے پر جھولتی ہوئی تتلی نے بھی مجھے نہیں دیکھا تھا کہ گاؤں کی طرف سے کُک کُک کی آواز آئی اور میں نے کتاب بستے میں بند کر دی، گاؤں کی طرف لپکا اور رنگ برنگی چڑیا نے چوں چوں کر کے مجھے بلایا تو میں نے کہا:

"آج نہیں۔۔۔ کل۔"

میں چلتی چکی کے تماشے میں اتنا محو ہوا کہ کنوئیں پر جانا بھول گیا۔ رات کو میرا باپ مجھ سے بہت ناراض ہوا اور دوسرے دن سکول کا کام نہ ہونے پر منشی جی حیران ہوئے۔

انہوں نے پوچھا "ماجے! تم نے آج گھر کا کام نہیں کیا؟"

"جی نہیں!"

"کیوں؟"

"چلتی چکی دیکھ کر ـــ"

"دیا کبیرا رو۔" منشی جی نے میری بات کاٹ لی۔

میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے لگے۔

انھوں نے پوچھا: "سلی! سفید پوش صاحب نے مشین لگوا لی؟"

"جی ہاں!" سلی نے خوش ہو کر کہا۔

"بھگت کبیر نے چلتی چکی دیکھ کر ایک دوہا کہا تھا۔ سنو گے ؟"

سلی نے سر ہلا دیا۔

"چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا رو۔ دو پاٹن کے بیچ میں ثابت رہا نہ کو۔"

"جی!"

"کتنی بڑی بات کہہ دی ہے بھگت کبیر نے۔ تم اسے سمجھے سلی ؟"

"جی نہیں۔"

"تم ماہنے ؟"

"جی!" میں بے خیالی میں جی کہہ گیا۔

انھوں نے مجھے پھر حیران نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "مجھے سمجھا سکو گے؟"

"جی ـــ میں ـــ نہیں تو۔ میں اپنے گاؤں کے خرا سیے بابا نتھو سے پوچھوں گا۔

اس نے دو پاٹوں والا بیت پڑھا تھا۔ یوں جب دانہ دو پاٹوں کے بیچ میں آتا ہے تو سب پس کر آٹا بن جاتا ہے جی!"

شرم سے میری کنپٹیاں جلنے لگیں۔

"ٹھیک ہے ـــ چلو نتھو خراسیے سے پوچھ کر آنا کہ پورے بیت کا مطلب کیا ہے۔"

"اچھا جی!"

"جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو خود بخود اس کے معنی جان جاؤ گے۔"

"بہت اچھا جی!" میں نے ان کے سامنے "نہ" کرنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔

وہ مسکرائے تو سلی نے میرا مذاق اڑانے کی غرض سے کہا "منشی جی! یہ ماہنا جانتا وانتا کچھ بھی نہیں اور بنتا بہت ہے۔"

"نہیں سلی! ماہنے نے بیت کا مطلب ٹھیک کہا تھا پر ابھی تیرے اور ماہنے کے لئے چکی نہیں چلی۔ کون جانے کس وقت چکی چلے اور اس کے پاٹوں میں آ کر کون پسے۔ ابھی سے تم اس کا مطلب جان کر کیا کرو گے؟ چلو نتھو خراسیے سے پوچھ کر آنا۔ پر ابھی نہیں ـــ ابھی نہیں۔"

نجانے انھوں نے آخری فقرہ ذرا سوچ کر کیوں کہا۔

"مستری کہہ رہا تھا کہ چکی چل رہی ہو تو اس کے پٹے کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہئے۔ پٹا اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔" سلی نے دانا بنتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہا اس نے۔ پٹے اور پاٹ دونوں سے بچنا چاہئے۔ آج تم نے بھی گھر کا کام نہیں کیا ہو گا سلی؟"

"جی نہیں ؟"

اگلی صبح منہ اندھیرے میری ماں نے دیا جلایا تو کمرے میں کڑوے تیل کی جلی ہوئی بو پھیل گئی اور رضائی میں لپٹا ہوا ہونے کے باوجود بو ہلکے ہلکے میرے نتھنوں میں گھس آئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے رضائی سے منہ باہر نکالا۔ آنکھوں سے نیند کی دھند چھٹی تو کمرے کی ایک ایک چیز کسمسا کر جاگنے لگی۔ میری سب سے پہلی نظر لپی پوتی نیلگوں دیوار کی پڑچھتی پر پڑی جہاں کانسی اور پیتل کے برتن چمک رہے تھے اور پھر میں نے اس دیوار پر ماں کا سایہ دیکھا اور یہ سایہ دبے پاؤں دیوار پر چل رہا تھا۔ یہ احتیاط میرے لئے نہیں تھی، میرے ننھے بھائی کے لئے تھی جو مجھ سے چھوٹی میری بہن عائشہ کی چارپائی پر اس کے سینے سے لگ کر سونے کا عادی تھا۔ ہر صبح دیئے کے ہلکے سے اجالے میں یہ منظر مجھے بہت بھلا لگتا تھا۔ یوں بھی باہر کپکپاتا ہوا اندھیرا اور اندر گرم گرم اجالا ہو اور اجالے میں ممتا کا سایہ ہو اور سونے والوں کے سانسوں میں امن اور چین کی بنسی کی لے ہو تو دل کو بڑا سرور ملتا ہے ـــ سوتے جاگتے کی اس کیفیت میں بھی میں جانتا تھا کہ ماں یا تو چرخا کاتے گی یا چکی پیسے گی اور چرخے کی روں روں اور چکی کی گھرر گھرر میں جو نیند آئے گی، وہ اتنی میٹھی ہو گی اتنی میٹھی ہو گی ـــ روں روں روں ـــ گھرر گھرر گھرر ـــ پھول کی پتیاں گریں گی یا گھر کی ہوا لوریاں دے گی ـــ میں نہیں جانتا کیا ہو گا؟ ـــ پر میں اتنی گہری نیند سو جاؤں گا کہ سورج نکلنے پر اماں میرا کندھا ہلا کر مجھے جگائے گی۔ "اٹھو ماہنے! مسجد میں نہیں جاؤ

گے؟"

اس دن ماں گھر کے ایک کونے میں پیڑھی بچھا کر بیٹھی ہی تھی اور چکّی میں پسلا

"گلا" پڑا ہی تھا کہ میں نے کہا "ماں!"

"کیا بات ہے ماہنے؟"

"میں چوہدری کی مشین پہ آٹا پسوانے جاؤں گا۔"

"او نجامت بوبو ماہنے! ننھا جاگ اٹھے گا۔"

"چوہدری کی مشین پر آٹا بڑا باریک پستا ہے۔"

"اچھا۔ اچھا۔ چپ ہو جاؤ اور سو جاؤ۔"

میں گھرر گھرر کی تھرتھراتی ہوئی آواز کے جادو میں کھو گیا اور پھر سو گیا۔ صبح مسجد میں جا کر مولوی صاحب سے قرآن شریف کے آخری پارے کی پانچ آیتوں کا سبق لیا اور گھر آ کر مدرسے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ روٹی کھاتے وقت میں نے ماں سے پھر مشین پر آٹا پسوانے کے لئے اصرار کیا تو اس نے کہا۔

"اچھا اب جان چھوڑ۔ اتوار کو چھٹی ہو گی تو پسوا لانا۔"

انوکھا تجربہ کس کو اچھا نہیں لگتا۔

مجھے اتوار کا بڑا انتظار تھا۔ گاؤں کے لوگ ابھی چکّی پر آٹا پسوانے سے بدک رہے تھے پر ہر سہ پہر کو چکی چلتی ضرور رہی۔ پہلے کچھ دن تو چوہدری کے گھر کا اناج ہر روز چکّی پر پستا رہا' اس لئے کہ لوگ اس کی گھگھو کی آواز سنتے رہیں۔ تب اس کے کہنے کہلانے سے اس کے قریبی رشتہ دار مشین پر اناج لانے لگے۔ اس اتوار سارا دن میرے کان گھگھو کی آواز سننے کا انتظار کرتے رہے۔ جونہی گھگھو بولا' میں نے گٹھڑی سر پر رکھوا لی۔ ماں نے اس دن صبح صبح اناج چھان پھٹک کر گٹھڑی میں باندھ دیا تھا۔ وہ بولیں "شیطانی پہیئے سے دُور دُور رہنا ماہنے!"

"اچھا اچھا۔" میں نے بے صبری سے کہا اور گھر کے آنگن سے باہر نکل گیا۔

چکّی پر پہنچا تو حمیداں لپک کر آئی۔ اس نے گٹھڑی میرے سر پر سے اُتار لی۔ حمیداں نے ہر روز کی طرح اس دن بھی اُجلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ دُھلا دُھلا سا تھا اور چہرے کی سنولاہٹ اور بھی نکھر آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

اُس نے خوش خوش آواز میں کہا "گاؤں کے اُدھر سے تو پہلا آدمی ہے جو مشین پر آیا ہے۔"

"سچ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں سچ۔ ماہنے تو کتنا اچھا ہے!"

چکّی پر دو چار "پَنڈیں" مجھ سے پہلے پہنچ چکی تھیں۔ ان کے دانے باری باری پس رہے تھے۔ مستری اندر مشغول تھا۔ چکی کھڑر کھڑر چل رہی تھی۔ پٹا مسلسل گردش میں تھا۔ حمیداں نے میری گٹھڑی ترکڑ کے ایک پلّے میں رکھ دی۔ دوسرے پلّے میں اس نے بیس سیر کا باٹ ڈال دیا۔ تب اس نے ایک سیر کا باٹ اور ڈالا تو دونوں پلّے برابر ہو گئے۔ اتنے میں مستری اندر سے باہر آ گیا۔ اس نے گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے منہ پر آٹا ملا ہوا تھا۔ اس کی بھنوؤں پر آٹے کی سفیدی تھی۔ پلکوں کی نوکوں پر آٹے کے ذرّے کانپ رہے تھے۔ پہلے دن والے چھیل چھبیلے مستری کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آئی تو میں سامنے کھڑے مستری کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑا۔ مستری پہلے حیران ہوا' پھر اسے غصہ آ گیا۔ اس نے کڑک کر کہا "لڑکے! تم کیوں خواہ مخواہ دانت نکال رہے ہو؟"

میں سہم گیا تو حمیداں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "مستری یہ اپنا ماہنا ہے۔"

"اپنا ماہنا؟" مستری نے پوچھا۔

"ہاں --- ہاں --- کلّی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ گاؤں کے ادھر سے پہلی "چنگ" بھی تو یہی لایا ہے۔"

"مجھے دیکھ کر ہنسا کیوں یہ؟"

"تم بھی تو سانگ بنے ہوئے ہو مستری۔" حمیداں نے قہقہہ لگا کر کہا "تمہیں دیکھ کر کون نہیں ہنسے گا۔ میں بھی تو ہنسی دبائے کھڑی تھی۔ کھی --- کھی --- کھی ---"

"ہوں! میں سانگ ہوں --- میں سانگ ہوں۔" اس نے ترکڑ پر سے میری گٹھڑی اتارتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے کان میں اُڑسا ہوا پنسل کا ٹکڑا نکالا۔ ایک پرچی پر وزن لکھا اور میرے ہاتھ میں تھما دی "پرچی کھوئی گئی تو آٹا نہیں ملے گا لڑکے۔" اس نے میرے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کی پر اس کی آواز کی سختی سے میں کانپ گیا۔ میں نے پرچی مٹھی

میں دہائی۔

"لڑکے! اٹھا گٹھڑی اور اوپر لے جا کر تختوں پر رکھ دے۔ جب میں پیچھے سے کہوں' اس وقت دانے چھاننے میں ڈال دینا۔ پٹے سے ہٹ کر رہنا۔ پٹے کی لپیٹ میں آ گئے تو میرا قصور نہیں ہو گا۔"

حیداں نے گٹھڑی اٹھانے میں میری مدد کی۔ وہ میرے ساتھ اندر گئی۔ پٹے سے دور رہ کر ہم لکڑی کی دو سیڑھیاں چڑھے اور اوپر تختوں پر جا پہنچے۔ یہاں پاٹوں کی گڑگڑ نے مجھے بوکھلا سا دیا۔ یوں بھی گھٹنے کانپ رہے تھے۔ میں نے سوچا "پٹے کی لپیٹ سے بچ کر میں اب چکی کے پاٹ سے اتنا قریب کھڑا ہوں کہ —— نہیں —— یہ آٹا پیسنے کی مشین واقعی شیطان کا چرخا ہی تو ہے۔ بابا تھو نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔"

حیداں میرے پہلو کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ اس کا بدن میرے بدن سے چھو رہا تھا اور تختوں کی کپکپاہٹیں ہمارے جسموں کو ایک دوسرے سے ملا ملا کر الگ کر رہی تھیں اور مجھے عجیب سا سکون مل رہا تھا کیونکہ میں چکی کے گڑگڑاتے ہوئے پاٹ سے اتنا قریب ہو کر بھی اب خوفزدہ نہیں تھا۔ تب انجن کے شور' پٹے کی کھڑکھڑاہٹ اور چکی کی گڑگڑاہٹ کو چیرتی ہوئی ایک آواز آئی:

"دانے ڈال دو۔ دانے ڈال دو چھاننے میں۔"

یہ مستری کی آواز تھی۔

میں نے اور حیداں نے گٹھڑی کی گانٹھ کھولی اور چھاننے میں گندم انڈیل دی۔

"نیچے آ جاؤ تم دونوں۔" مستری پھر پکارا۔

"ماہنے! ٹھہرو ابھی۔" حیداں نے کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یونہی ——"

"مستری غصے ہو گا۔"

"نہیں ہو گا۔ اس کی کیا مجال۔" حیداں نے بڑے گھمنڈ سے کہا۔

"میرے بازو میں چٹکی نہ بھرنا حیداں۔"

"کیوں؟"

"نجانے کیوں؟ اب مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔"

"ماہنے! تم اب بھی شیماں کے ہاں کھیلنے کو جاتے ہو؟"

"ہاں —— کبھی کبھار۔"

"تمہیں شیماں اچھی لگتی ہے؟"

"ہاں لگتی تو ہے۔"

"کیوں؟"

"یونہی۔"

"اب تم اتنے بڑے ہو گئے ہو' تمہیں شیماں کے ساتھ ریتھڑے کھیلتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"نہیں تو ——" میں نے حیران ہو کر کہا۔

اس نے میرے بازو میں چٹکی جو بھری تو میری چیخ نکل گئی۔

"لڑکے! نیچے آ جاؤ۔"

میں نیچے اتر آیا تو مستری نے مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ "اوپر کیا کر رہے تھے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"اپنی گٹھڑی باندھ لو۔"

میں نے گٹھڑی باندھنے میں مستری سے امداد کے لئے کہا تو اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں کسی کے باپ کا نوکر ہوں۔ خود باندھ لو۔"

تھکھو کی کھک کھک کی آواز کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے نرخرے پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ آہستہ دبا رہا ہو۔ تب اس کے گلے میں سے سسکی کی ایک آواز آئی تو پٹہ رک گیا اور حیداں بھی اوپر سے نیچے آ گئی۔ یکدم مستری اس کے سامنے یوں کھڑا ہو گیا جیسے وہ الگ بھبوت رمائے کوئی جوگڑا ہو جو کسی کے سامنے کشکول بڑھائے مٹھی بھر بھیک کے انتظار میں ہو۔ میں پھر بے اختیار ہنس پڑا تو مستری کو پھر مجھ پر غصہ آ گیا۔

"گٹھڑی باندھ لو۔ مجھے کیوں بٹ بٹ تک رہے ہو؟"

"ذرا بندھوا دو مستری۔ اکیلا کیسے باندھ لوں۔"

"نہیں۔۔۔ اکیلے ہی باندھو۔۔۔" مستری نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

حیداں نے مستری کو غصے کی ایک جلتی چھنکتی نگاہ سے دیکھا اور پھر جھک کر گٹھڑی باندھنے میں میری مدد کرنے لگی۔ مستری اسے دیکھتا رہا اور بُت بنا کھڑا رہا۔ میں نے گٹھڑی ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی تو مستری نے کہا "پرچی نکالو۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پرچی غائب تھی۔ تب مجھے یاد آیا کہ جب میں گٹھڑی اٹھا کر تختوں کے اُوپر پہنچا تھا' تو اس وقت پرچی میری مٹھی میں بند تھی۔ جب حیداں نے میرے بازو میں چٹکی بھری تھی تو پرچی تختوں پر گر پڑی تھی۔

"پرچی اُوپر تختوں پر گر گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"جاؤ ڈھونڈھ کر لاؤ۔"

میں کھٹ کھٹ اُوپر گیا۔ پرچی تختوں پر کہیں نہ ملی۔ شاید تختوں کے درمیان کسی درز میں سے نیچے جاگری تھی۔

میں نے نیچے آکر کہا "پرچی نہیں ملی۔"

"پھر آٹا بھی نہیں ملے گا۔"

میں روہانسا ہو گیا تو حیداں نے پوچھا "ماہنے! تول میں تیرے دانے کتنے ہوئے تھے۔"

"اکیس سیر۔"

"مستری! اس کو اکیس سیر آٹا تول دو۔" حیداں نے حکم دیا۔

مستری نے گٹھڑی کا وزن کر دیا۔ میں نے ایک آنہ اُسے دیا۔

"اب کبھی پرچی کھوئی گئی لڑکے تو آٹا نہیں ملے گا' سنا!" مستری بولا۔

حیداں نے گٹھڑی میرے سر پر رکھ دی۔ گرم گرم آٹے کی گٹھڑی سر پر آئی تو مجھے نتھو خراسیے کی بات یاد آ گئی۔

میں نے پوچھا "حیداں! آٹا جل تو نہیں گیا؟"

"نہیں ماہنے! نتھو خراسیے کی باتوں میں نہ آنا۔ آٹا نہیں جلا۔ اس کی قسمت جل گئی

ہے۔"

"ایسا نہ کہو حیداں۔"

"کیوں نہ کہوں؟ وہ ہم سے جلتا ہے۔ جب سے ہماری چکّی لگی ہے' وہ بُری بُری باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے چودھری نے ہم کمین کمینوں کے منہ کا لقمہ چھین لیا ہے۔ یہ ہمارے باپ دادا کا کسب تھا۔ چودھری تو جاٹ کا بیٹا ہے۔ اسے یہ کسب شوبھا نہیں دیتا۔ دیکھو ماہنے تم شیماں کے ساتھ نہ کھیلا کرو۔"

"کیوں نہ کھیلوں؟"

"اب تم بڑے ہو گئے ہو۔"

میں چلتے چلتے رُک گیا۔ میں نے گٹھڑی کے بوجھ کے نیچے سے اُسے دیکھا تو وہ مسکرانے لگی۔

"ماہنے! یا تم ابھی چھوٹے ہو یا میں تم سے بہت بڑی ہو گئی ہوں۔"

"ہاں! تم مجھ سے بہت بڑی ہو۔"

اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا "ہاں! میں تم سے بڑی ہوں پر اچھا ہوتا جو میں تم سے بڑی نہ ہوتی۔"

"کیوں۔"

"پھر تم شیماں کے ہاں تو کھیلنے کے لئے نہ جاتے۔"

وہ اتنا کہہ کر اپنی گلی میں مُڑ گئی۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۳

○

ہم گاؤں والے جب کسی بزرگ سے کسی گزرے ہوئے واقعے کی بابت پوچھتے' تو جواب میں کسی کال یا وبا یا سیلاب کا ذکر ہوتا۔ "یہ بات اس سال کی ہے جب "میسنے(۱)" والا کال پڑا تھا اور لوگ میسنے اور بتھوا کا ساگ کھا کھا کر بیمار پڑ گئے تھے اور بکھڑے(۲) کو پیس کر اس کی روٹیاں پکاتے تھے یا اس سال طاعون کی وبا پھیلی تھی اور لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے تھے یا اتنا سیلاب آیا تھا کہ گاؤں مٹی کا ڈھیر بن گیا اور لوگوں نے ٹیلوں پر پناہ لی تھی۔"

جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ "اس سال" کا سلسلہ اسی طرح کسی واقعے سے جوڑوں یعنی کہہ دوں کہ اس سال میں نے اور سلی نے چوتھی کا امتحان پاس کر لیا تھا اور میرا باپ بڑا خوش تھا کہ اب میں پڑھنا وڑنا چھوڑ کر کھیتی باڑی میں اس کی مدد کروں گا لیکن چوہدری پھر ہمارے گھر آیا تھا اور میرے باپ کو منا کر مجھے سید پور کے مڈل سکول میں داخل کروا آیا تھا اور میرے باپ کو اس کا بڑا ملال تھا پر میں آخر کچھ تو پڑھا لکھا آدمی شمار ہوتا ہوں' اس لئے میں جانتا ہوں کہ وہ سن انیس سو سنتالیس تھا اور اس سال ہندوستان تقسیم ہو گیا تھا اور پاکستان وجود میں آ گیا تھا۔

یہ بہت بڑا اور بے مثل واقعہ تھا!

ہمارے اردگرد کے دیہات سے ہندو اور سکھ راتوں رات چلے گئے تھے اور انہیں جموں اور سیالکوٹ کی سرحد پار کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی تھی کیونکہ ہمارے دیہات اسی سرحد کے قریب واقع ہیں۔

۱۔ ایک خود رو بوٹی جس کو چارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ اس بوٹی کا بیج اور سوکھ کر سخت ہو جاتا ہے اور اس پر کانٹے ہوتے ہیں۔ گوکھرو۔

پر میرے گاؤں کے لئے یہ بہت بڑا واقعہ نہیں تھا کیونکہ اس گاؤں میں ظاہری طور پر کوئی بڑا انقلاب نہ آیا تھا۔ البتہ گاؤں کا واحد ہندو دکاندار لالہ برج لال جسے ہم برجا کھتری کہتے تھے' چپکے سے گاؤں چھوڑ گیا تھا۔ اس کے گھر اور دکان پر چوہدری نے اپنا تالا لگا دیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں ان دنوں نہ کوئی ریڈیو تھا نہ کوئی اخبار' صرف چوہدری کی بیٹھک میں لوگ چوہدری سے پوچھ پچھ کر ملک کے حالات معلوم کر لیا کرتے تھے۔ مجھے صرف اتنا پتا لگا تھا کہ ہندوستان اور جموں میں مسلمانوں کا بہت کشت و خون ہوا ہے اور وہاں سے انہیں نکال دیا گیا ہے۔ کچھ لٹے پٹے لوگ ہمارے گاؤں میں سے بھی گزرے تھے اور ہم نے انہیں کھانا کھلایا تھا۔

وہ اندھیری رات مجھے کبھی نہ بھولے گی' جب باہر دھواں دھار بارش ہو رہی تھی اور اندر مکان ٹپک رہے تھے۔ ہمیں خطرہ تھا کہ سیلاب ضرور آئے گا۔ ہمارے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میری ماں نے مجھے دروازہ کھولنے کو کہا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک بوچھار نے میرا منہ توڑ دیا۔

میں نے کہا "کون ہے بھئی! اندر آ جاؤ۔"

دروازہ کھٹکھٹانے والا ذرا اندر آ کر دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ دیئے کی ٹمٹماہٹ میں اُس کا چہرہ دُھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔

"تم کون؟" میری ماں نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں ایک مسلمان ہوں اماں جی!"

"پر ---- تم ---- تم ----"

"اماں! میں اس گاؤں کا رہنے والا نہیں ہوں۔"

"ماہنے! تمہارا باپ ----"

"اماں! مجھے پتا ہے وہ کنویں پر ہے پر اندھیری رات اور مینہ ---- مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اماں جی! آپ ڈریں نہ ---- میں چلا جاتا ہوں۔"

اس نے دہلیز پر کھڑے کھڑے باہر کی طرف منہ موڑا' تو میں نے پیچھے سے اس کے کرتے کا پلو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

میں نے کہا "نہیں بھاگ مت جاؤ۔ اتنے مینہ اور گھپ اندھیرے میں کہاں جاؤ گے؟"

اجنبی نے منہ موڑ کر مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا اور میری ماں سے مخاطب ہو کر کہا "کوئی بات نہیں اماں! میں ایک رات اور بھی باہر گزار سکتا ہوں۔"

"اتنے مینہ میں! نہیں نہیں۔۔۔" میری ماں بولیں اور سوچنے لگیں۔

اجنبی نے ایک آہ بھری تو ماں نے کہا "بھلائی میں ایک کھاٹ تو بچھ سکتی ہے مانے؟"

میں نے خوش ہو کر کہا "ہاں ہاں!"

اور ماں کی طرف سے مزید کسی ہدایت کا انتظار کئے بغیر میں باہر کی طرف لپکا۔ آنگن کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ اس کی دیوار اور مکان کے سب سے بڑے کمرے "بہار" کی دیوار مشترکہ تھی۔ اس کوٹھڑی کا دروازہ آنگن میں کھلتا ہے۔ گاؤں والے اسے بھلائی کہتے ہیں۔ اس کوٹھڑی میں کھانے پکانے کے برتن، دہی بلونے کی چاٹی، گھڑونچی، اُپلے اور لکڑیاں پڑی تھیں۔ میں کنڈی کھول کر اندر داخل ہوا تو گھُپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔

ماں نے کہا "دیاسلائی تو لیتے جا مانے!"

میں لپک کر بہار میں آیا۔ دیاسلائی لی۔ تیلی جلائی تو طاقچے میں دیا نظر آیا۔ دیا جلا تو دھیرے دھیرے کوٹھڑی کا اندھیرا دُور ہوا۔ ماں چاٹی، مدانی اور گھڑونچی اُٹھا کر بڑے کمرے میں لے گئیں۔ میں نے برتن ادھر اُدھر کر کے جگہ بنائی۔ پھر کھاٹ اٹھا لایا۔ کھاٹ بچھی تو اجنبی دھم سے بیٹھ گیا۔ وہ تھکا ہوا تھا۔

تب میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ تھکی تھکی مسکراہٹ کے ساتھ میری نگاہ سے ہم کلام ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے ہم اجنبی نہیں۔ ہم تو کب سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس کی عمر یہی انیس بیس سال کی ہو گی۔ اُس کا جسم دُبلا دُبلا سا تھا اور بھیگے ہوئے کپڑے جسم سے چپکے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ زرد زرد تھا پر سب سے بڑی بات اس کی آنکھوں میں تھی۔ ان آنکھوں نے نجانے کیا کیا کچھ دیکھا تھا۔۔۔ پر یہ بعد کی بات ہے۔ دیے کی مدھم روشنی میں میں نے تھکی تھکی آنکھوں میں گھُلی ہوئی نیند کا سماں پہلی بار دیکھا

تھا کہ نیند آئے بھی اور آ بھی نہ سکے۔ اتنے میں میری ماں ایک رکابی میں دال اور چھابے میں دو روٹیاں رکھ کر لے آئیں۔ اجنبی نے چھاجا ہاتھ میں لیتے وقت ماں کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ وہ روٹی کھا رہا تھا کہ ماں اندر سے ایک کھیس اور تکیہ لے آئیں۔ ماں چلی گئیں تو میں اُس کے پاس کھڑا رہا۔ اُس نے ایک روٹی کھائی۔ مجھ سے پانی مانگا۔ پانی کا پیالہ پی کر اُس نے کہا۔

"مانے! اب جا کر سو جاؤ۔"

اس نے مانا کہہ کر مجھے پکارا تھا۔

"اور بھا! تم؟"

"میں بھی سو جاؤں گا۔"

صبح میں اجنبی کو کنویں پر چھوڑ آیا۔

برسات میں اجنبی سے بہت کم ملاقات ہوئی اور جب سیلاب آ کر گزر گیا اور بادل چھٹ گئے اور گاؤں کی روزمرہ زندگی بحال ہو گئی تو میری چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں۔ سیدپور ہمارے گاؤں سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں سے نیلے پہاڑ اور بھی قریب نظر آتے ہیں۔ اب میرا سارا دن سکول میں آنے جانے میں گزر جاتا۔ میں کھیتی باڑی میں باپ کا ہاتھ نہ بٹا سکتا پر باپ نے کبھی مجھ سے کوئی کڑوی بات نہ کی۔ اجنبی نے کنویں پر میری کمی پوری کر دی تھی۔

اجنبی کنویں سے بہت کم گاؤں میں آتا۔ اس لئے گاؤں کے لوگ اس کے وجود سے بڑی دیر بعد باخبر ہوئے۔ وہ چُپ چاپ سا جوان تھا۔ مجھے دیر تک اس کا نام بھی معلوم نہ ہو سکا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں کسی نئے آدمی کا وجود ذرا سا پُراسرار ضرور بن جاتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ کسی بات کا جواب دھیمی اور اُداس سی مسکراہٹ کے ساتھ دینے کا عادی ہو۔ مجھے یوں لگتا جیسے وہ اندھیری رات کا سایہ ہو اور دن کو اس کا وجود روشنیوں میں گھُل مل جاتا ہو۔

وہ مجھے کبھی کبھار ملتا تو دھیمے سے کہتا "مانے!"

"جی!"

"کچھ نہیں۔۔۔ یونہی۔۔۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ تمہارا نام پکاروں۔"

"تو اتنا چپ چاپ کیوں رہتا ہے؟" ایک دن میں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔۔۔ اچھا بتاؤ تم کس جماعت میں پڑھتے ہو؟"

"پانچویں میں۔"

"تمہیں پتہ ہے ملک کے دو حصے کیوں ہوئے؟"

"ہاں!"

"مجھے بھی بتاؤ۔"

[illegible]

"ٹھیک ہے پر تقسیم کے وقت اتنا خون خرابہ کیوں ہوا؟"

"مجھے نہیں پتہ۔۔۔ بھلا تمہیں معلوم ہے؟"

"نہیں ماہنے! مجھے بھی معلوم نہیں۔۔۔ مجھے تو اتنا پتہ ہے کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ماہنے! میرا ایک چھوٹا بھائی تھا، وہ بھی خون کی ندی میں بہہ گیا۔۔۔ بھلا بتاؤ تو سہی اس کا کیا قصور تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔۔۔ ہم نے تو اس گاؤں میں ایسا نہیں کیا۔۔۔ برجے کھتری کا بیٹا ونود کمار ہمارے ساتھ کھیلتا تھا۔ وہ چپ چاپ باپ کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا اور ہمیں پتہ بھی نہ چلا۔"

"تمہیں پتہ بھی نہ چلا؟" اس کی آنکھوں میں غصہ چمکا۔ "تم نے ونود کمار سے اکو کا بدلہ نہ لیا۔"

اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ کپکپاہٹیں مجھ تک پہنچیں تو مجھے ننھے ننھے جھٹکے سے لگے۔ میں نے سہم کر کہا "تودی تو مجھ سے بھی چھوٹا تھا بھلا! کبوتر کی طرح کالی کالی آنکھیں۔ وہ تو بڑا بھولا بھالا تھا۔ کوئی اُسے تنگ کرتا تو رونے بیٹھ جاتا۔"

"اکو بھی بڑا بھولا بھالا تھا ماہنے!"

"بھا! وہ خون کی ندی میں کیوں بہہ گیا؟"

"مجھ سے نہ پوچھو ماہنے!" اس نے سوکھے پتے کی طرح کانپ کر کہا اور منہ پھیر لیا۔ دیر بعد وہ بولا "ماہنے! اکو سے مجھے بڑا پیار تھا۔ میں سب کو بھول جاؤں گا، پر وہ میری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ تصویر بنے کھڑا رہے گا۔"

"بھا! یہ تو بتاؤ اُسے کیا ہوا؟"

"پھر کبھی سہی۔"

اجنبی کی بکھری بکھری ہوئی باتوں سے میں نے پوری کہانی جوڑ لی۔ ہمارے گاؤں سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر ایک دریا بہتا ہے جسے بیاس کہتے ہیں۔ میں نے جغرافیے کی کتاب میں اس کا نام پڑھا تھا۔ اس کے پرلے کنارے پر ضلع گورداسپور کی تحصیل پٹھان کوٹ ہے۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ گورداسپور کا یہ علاقہ پاکستان میں ضرور شامل ہو گا۔ پر جب پاکستان بنا تو لوگوں کو پتہ چلا کہ ان کا علاقہ پاکستان میں نہیں آیا۔ لوگ بوکھلا کر اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ یوں تو اُدھر کے سارے مسلمانوں کو اپنے اپنے گھروں سے نکلنا پڑا تھا لیکن بیاس پار کے مسلمانوں کو جس اچانک ناامیدی کا منہ دیکھنا پڑا تھا، اُس نے انہیں اپنی حفاظت سے بھی مایوس کر دیا تھا۔ وہ مولی گاجر کی طرح کٹے، ندی نالوں کی طغیانی میں بہہ گئے، بیاس کی بپھری ہوئی موجوں نے ان کا رستہ روک لیا۔ کشتیاں شو دریا میں اُلٹ گئیں اور میں حیران تھا کہ بھا حملہ آوروں کی چھویوں، ٹوکوں اور تلواروں سے کس طرح سلامت نکل آیا۔ اکو جس کا پورا نام اکرم تھا، اس کی انگلی پکڑے چمن پر کھڑا تھا کہ ان پر حملہ ہوا اور چھوی کے ایک وار سے اس کا سر کٹ گیا۔ جب حملہ آور لہو کی پیاس بجھا کر چلے گئے تو بھا لہولہان ہو کر لاشوں کے درمیان گھرا ہوا سسک رہا تھا۔

"بھلا تمہارا ایک ہی بھائی تھا؟"

"ہاں!"

"اور تمہاری بہن؟"

بہن کا لفظ سن کر بھا تڑپ گیا۔ وہ چند لمحوں کے لئے مجھے غم بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ میں اس کے غم کی شدّت کو دیکھ کر سہم گیا۔

"میں بیچارے اکو کو ظالموں کے وار سے نہ بچا سکا۔ بہن ہوتی تو۔۔۔" اس کے ہونٹ کپکپا کر چپ ہو گئے تو میں نے کچھ نہ پوچھنا ہی بہتر سمجھا۔

جب چوہدری کو پتا چلا کہ ایک مہاجر ہمارے گاؤں میں بھی آیا ہے تو اس نے اسے اپنی حویلی میں بلا بھیجا۔ میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ چوہدری نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا "ماہنے! تیرا پڑھنے میں کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے جی!"

"سلیمان بھی پڑھتا وڑتا ہے؟"

"پڑھتا ہے جی۔"

"جوان! تم گورداسپور کے مہاجر ہو؟"

"جی!"

"تمہارے ماں باپ، بہن بھائی کہاں ہیں؟"

"جی! مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"میرے پاس بیٹھ جاؤ تو بات کریں۔" چوہدری نے چارپائی کے سرہانے کی طرف کھسک کر پائنتی کی طرف تھوڑی سی جگہ بنائی۔ بھا بیٹھ گیا تو چوہدری نے کہا "اس گاؤں میں تم اکیلے مہاجر ہو۔"

"جہاں کسی کے سینگ سمائے، وہ وہیں بیٹھ گیا۔ چوہدری جی میرا دانہ پانی اس گاؤں کا تھا، میں یہاں آگیا۔"

"تم یہاں کیسے پہنچے؟"

"جی! مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تو گاؤں گاؤں پھر رہا تھا۔ میرا کہیں جی نہ لگتا تھا، اس گاؤں میں پہنچا تو ماجے نے میرا راستہ روک لیا۔"

"ماجے نے! وہ کیوں؟" چوہدری نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ بھا بولا "چوہدری جی! اس نے میرے کرتے کا پلو پکڑ کر مجھے کھینچ لیا تھا۔"

پھر وہ اپنے آپ میں کھو کر مسکرایا۔ چوہدری نے نجانے مجھے بڑی گہری گہری نظروں سے کیوں دیکھا۔

"تمہیں اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کا کچھ پتہ نہیں؟"

"ایک بھائی کا پتہ ہے۔ اس کا نام اکرم تھا۔ ہم پیار سے اسے اکو کہتے تھے۔ بس ماجے کی عمر کا تھا۔ وہ چمن پر شہید ہو گیا تھا۔"

"اوہ ــــ ہو ــــ اور ماں باپ؟"

"اندھیرے میں ان کا ساتھ چھٹ گیا تھا۔ چمن پر انہیں بہت تلاش کیا، نہ مل سکے۔

چوہدری جی! چھوڑیے اس قصے کو۔"

"اس گاؤں میں آکر تمہیں کیا ملا جوان؟"

"بہت کچھ۔"

"یہاں نہ کوئی متروکہ زمین ہے، نہ کوئی مکان۔ اردگرد کئی موضعوں میں ہندوؤں سکھوں کی چھوڑی ہوئی جائدادیں ہیں۔ کسی ایسے گاؤں میں چلے جاؤ تو ــــ"

"چوہدری جی! میرا کہیں اور جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"بھا! یہاں بھی تو برجے کھتری کا مکان ہے اور اس کی دکـ ــــ"

"ماجے!" چوہدری نے رعب دار لہجے میں مجھے ٹوکا۔

"جی! چوہدری جی!"

"بڑوں کی باتوں میں نہیں بولا کرتے۔"

"اچھا جی!" میں نے سر جھکا لیا۔

چوہدری کی حویلی سے واپسی پر پہلے ہمیں حیداں ملی اور پھر شیماں۔

حیداں نے بھا کی وجہ سے مجھ سے کوئی بات نہ کی اور شیماں جس کے ہاتھ میں گوری کی رسی تھی، مجھے دیکھ کر رک گئی۔

"ماجے!" شیماں بولی۔

"ہوں!"

"تم میرے ہاں کھیلنے کیوں نہیں آتے؟"

"میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اس عمر میں بھی لڑکے لڑکیاں اکٹھے کھیلتے ہیں بھلا!"

شیماں نے مجھے حیران حیران آنکھوں سے دیکھا تو بھا مسکرانے لگا۔

"بھا تم کیوں مسکرائے؟"

"ماجے! تم کتنے بڑے ہو گئے ہو بھلا!"

"بھا! اب میں پانچویں میں پڑھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بھئی! تم بہت بڑے ہو گئے ہو۔ اب تم بیا نتھو کے ساتھ کھیلا کرو۔"

"بیا نتھو؟ــــ تم اسے جانتے ہو بھا؟"

"ہاں! ہاں! جانتا کیوں نہیں؟ وہ روز کنوئیں کے آس پاس ملتا ہے ــــ گھاس کھودتا

ہے۔"

"وہ تو شیماں کا بابا ہے۔"

"اچھا!" بھا نے شیماں کی طرف ذرا غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

شیماں نے لمبی لمبی پلکوں والی حیران آنکھوں سے بھا کو دیکھا تو وہ مسکرایا۔ تب وہ اداس سا ہو کر اپنے آپ میں کھو گیا۔

"میں کنوئیں پر جاتا ہوں ماہنے! تم شیماں کے ساتھ کھیلو۔"

"پر بھا! لوگ کیا کہیں گے؟"

"ریشو بھیّاں والی اور حمیداں۔" شیماں نے کہا۔

"ریشو بھیّاں والی؟" بھا نے پوچھا۔

میں اور شیماں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میں نے جب بتایا کہ ریشو کا اصلی نام ریشم ہے۔ پر ہے وہ لکڑی سے بھی سخت اور اس کے اوپر کے ہونٹ پر مونچھیں ہیں۔ پہلے وہ کالی تھیں، اب ان میں سفید بال بھی آ گئے ہیں، تو بھا ہنس پڑا۔

"حمیداں کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"چوہدری کی بیٹی ہے۔ ابھی ابھی جب ہم چوہدری کی حویلی سے نکلے تھے، تو تم نے اسے دیکھا نہیں تھا بھا؟"

"وہ سانولے رنگ کی ---؟"

"کالے منہ والی۔" شیماں بولی۔

"کالے منہ والی کون؟" میں نے پوچھا۔

"حمیداں!"

"نہیں --- اس کا رنگ کالا تو نہیں، سانولا ہے شیماں۔" میں نے کہا۔

"ہوگا۔ مجھے کیا؟ میں تو اسے کالے منہ والی ہی کہوں گی۔" شیماں نے ٹھنک کر کہا۔

"کیوں؟" بھا نے ذرا سا حیران ہو کر پوچھا۔

"جب سے اس کے باپ نے شیطان کا کارخانہ لگوا لیا ہے، اس کے پاؤں زمین پر ہی نہیں ٹکتے۔ ہمارے خراس پر کوئی کوئی چنگ آتی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں! جب سے چوہدری کی آٹا پیسنے کی مشین لگی ہے ان کا خراس بہت

کم چلتا ہے۔ کون اپنی جوگ لے کر آئے؟ اور پھر تھوڑا سا اناج بھی پسوانا ہو تو اتنا وقت لگتا ہے کہ --- اور مشین پر چٹکیوں میں آٹا پس جاتا ہے۔"

"اس میں حمیداں کا کیا دوش شیماں؟" بھا نے پوچھا۔

"چوہدری نے اسے بڑی ڈھیل دے رکھی ہے۔ جتنی دیر چکّی چلتی رہتی ہے وہ وہیں پر رہتی ہے اور مستری سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں مستری بدمعاش ہے۔"

شیماں!" میں نے چونک کر اُسے ٹوکا۔

وہ سہم سی گئی۔

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے؟" میں نے نصیحت کی۔

"اُس نے مجھے مارا کیوں اور بابا کو گالیاں کیوں دیں؟ میں گوری کو رسّی سے پکڑ کر چراتی ہوں۔ اُس نے چوہدری کے کھیت میں دو منہ مار لئے تو کون سی قیامت آ گئی۔ گاؤں میں ہمارا بھی کوئی کھیت ہوتا تو --- اور وہ کہتی ہے تمہارا خراس بند ہو جائے گا اور تمہیں کھانے کو مٹھی بھر آٹا بھی نہیں ملے گا۔"

شیماں نے اتنی ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہہ دیں تو میں بڑا حیران ہوا۔ میں نے سوچا "وہ تو اتنی باتیں نہیں کرتی تھی، آج اسے کیا ہو گیا ہے؟"

تب اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پلکوں پر آنسو کانپنے لگے تو بھا نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "شیماں!" آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔ "مٹھی بھر آٹا حمیداں کے ہاتھ میں نہیں، اُس کے ہاتھ میں ہے جو ---"

"وہ کون ہے؟" شیماں کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز نے پوچھا۔

"وہ سب کو دیتا ہے۔" بھا نے کہا اور نیلے دُھلے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

شیماں روتے روتے ہنس پڑی "آٹا اُوپر سے برستا ہے بھا؟"

بھا پہلی بار قہقہہ لگا کر ہنسا "ہاں! ہاں! کیوں نہیں؟ ---"

میں بھا کے اس قہقے پر بڑا خوش ہوا اور یوں ہنسنے لگا جیسے میرے اندر کوئی فوارہ پھوٹ نکلا ہو۔ بھا نے شیماں کی اوڑھنی سے اس کے آنسو پونچھے تو اُس وقت شیماں کا چہرہ نکھر سا گیا۔ میں شیماں کو حیران ہو کر تکنے لگا تو گوری بے چین سی ہو گئی۔ شیماں نے کہا

"آؤ گھر چلیں۔"
میں چونک کر جیسے جھٹکے سے کھسک گیا تھا۔
شیماں کے آنگن میں بڑا سکون تھا۔ بکائن کے سایوں میں ہلکی ہلکی ٹھنڈک تھی۔ اس دن کوئی بھی آٹا پسوانے کے لئے نہیں آیا تھا۔ بڑے بڑے پاٹ اُداس اداس فرش پر تھے۔ ہم نے خانے بنا کر شاہ شٹاپو کھیلنا شروع کیا۔ شیماں ایک ٹانگ پر کھڑی ٹھیکری کو دوسرے پاؤں سے ٹھوکر لگا کر خانے سے نکالنے ہی والی تھی کہ گاؤں کے شمال سے گنگ گنگ کی آواز آئی۔ وہ آواز میں کھو کر کھیل سے بے خبر ہو گئی۔ اُس کا دوسرا پاؤں اپنے آپ زمین پر لگ گیا۔ عین اُس لمحے حمیداں بھی آنگن میں آ گئی۔ میری اور شیماں کی نگاہ بیک وقت اس پر پڑی۔
"تمہیں لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے شرم نہیں آتی شیماں؟"
"نہیں۔" شیماں نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔
"بابا نتھو تجھے نہیں روکتا؟"
"نہیں تو۔" شیماں نے بدستور بھینچے ہوئے ہونٹوں سے جواب دیا۔
"ماسٹے! تو اتنا بڑا ہو گیا ہے، تجھے بھی کچھ خیال نہیں آتا؟"
"کس بات کا؟"
"لڑکیوں سے کھیلنے کا۔"
"حمیداں! مشین چل رہی ہے۔" شیماں بولی۔
"ہاں چل رہی ہے۔ تجھے کیا؟"
"تو جا نا اپنی مشین پر اور ہنس ہنس کر باتیں کر اپنے مستری سے۔"
"مستری سے؟" حمیداں نے حیران ہو کر شیماں کی بات دُہرائی۔
"ہاں ––– ہاں ––– سبھی کہتے ہیں، چوہدری نے اپنی لاڈلی کو بہت کھُل دے رکھی ہے۔"
"شیماں! میں نے تجھ سے کہا نہیں تھا کہ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔"
حمیداں کے سانولے چہرے پر غصے کی تمتماہٹ دیکھ کر میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہا "آؤ چلیں حمیداں۔"

حمیداں نے شیماں کو جلتی چمکتی نگاہوں سے دیکھا پر خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑی۔ شیماں نے مجھے بڑی غصے والی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "جاؤ ––– جاؤ ––– اب تم یہاں کھیلنے آئے تو –––"
"جب جی چاہے گا آؤں گا شیماں۔" میں نے چلتے چلتے کہا اور کھونٹے سے بندھی گوری کے پنڈے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کا بدن اینٹھ گیا جیسے وہ بھی مجھ سے ناراض ہو گئی ہو۔ آنگن سے باہر نکل کر حمیداں نے پوچھا۔ "اب بھی شیماں کے ہاں کھیلنے آیا کرو گے؟"
"ہاں! ہاں! ضرور آؤں گا۔ تم مجھے کیوں روکتی ہو؟" میں نے غصے میں آ کر کہا۔
"نتھو خراسیے کی پوتی سے تمہارا کیا جوڑ؟"
"کیوں؟"
"وہ گاؤں کا کمیرا ہے اور تمہارا باپ جاٹ ہے۔ چوہدری کے بیٹے کا کمیوں سے کیا جوڑ؟"
میں حمیداں کی بات پر حیران ضرور ہوا پر مجھے یوں لگا جیسے اُس نے کوئی ایسی بات کہی ہو جس کی سچائی میرے خمیر میں موجود ہو جیسے صدیوں سے ایک آواز میرے اندر سوئی ہوئی تھی، اب کسی تار کو چوٹ لگی تو آواز دھیمے سے چونک اُٹھی۔ میں بچپن کے اُس دُھندلے تصور کو جس پر کئی سالوں کی دُھول پڑی ہے، اب بھی اپنی یادوں میں محفوظ پاتا ہوں، تو حیران ہوتا ہوں۔ اُس وقت میں نے حمیداں سے اپنے ہی چونکے ہوئے خیال کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے کہا تھا۔
"میں تو ضرور کھیلوں گا اُس سے ––– ضرور کھیلوں گا –––"
اور حمیداں نے ہاتھ چھڑا کر کہا تھا "پھر میں تجھ سے نہیں بولوں گی۔"
"نہ بولنا ––– سو بار نہ بولنا۔" میں نے کہا۔
اس کے باوجود میرے اور شیماں کے درمیان ایک ننھی سی دیوار اُبھر آئی تھی۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔
"آؤ چکی پر چلیں۔"
"میں نہیں جاؤں گا۔"
"نہیں ماسٹے! چلو ––– " حمیداں نے بڑی میٹھی آواز میں اصرار کیا۔

حیداں کی آواز کی اس مٹھاس پر کسی سوئے ہوئے تار کی ایک اور سر چھنک اٹھی۔
میں نے حیداں کے سلونے چہرے کی طرف دیکھا تو اس پر ایک عجیب سی نرمی تھی جسے میں
اس وقت نہ سمجھ سکا کیونکہ میں عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔ پر میرا جی پسیج گیا۔ میں نے کہا
"چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

جب ہم گلی سے نکل کر کھلی جگہ پر آئے تو حیداں نے پوچھا "وہ آج تیرے ساتھ
کون تھا؟"

"کیا؟"

"وہ کون ہے؟"

"ایک اجنبی۔"

"اس کا کوئی نام نہیں؟"

"ہے تو۔"

"بتاؤ تو سہی کیا نام ہے اس کا؟"

"نہیں بتاؤں گا۔"

"نہیں —— بتا دو نہ ماجے!"

"اسلم۔" میں نے کہا۔

"اسلم؟" حیداں نے دُہرا کر پوچھا۔
اس کے چھوٹے بھائی کا نام اکرم تھا۔ گھر والے اسے پیار سے اکو کہتے تھے۔
بیاس کے پتن پر شہید ہو گیا تھا۔"

"اسلم —— اسلم ——" حیداں نے زیر لب دُہرایا تو میں نے کہا "کتنا اچھا نام ہے
نا کا!"

"نام سارے ہی اچھے ہوتے ہیں ماجے!" حیداں کے لہجے میں دھیمی سی ڈانٹ تھی۔

"وہ میرا بھائی بھی تو ہے حیداں!"

"ہو گا —— مجھے کیا؟ ——" حیداں کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"پھر تم نے پوچھا کیوں؟" میں نے چمک کر کہا۔

"یونہی —— نام سے کیا فرق پڑتا ہے ماجے —— وہ تو پہلے ہی میرا محرم ہے۔"

"جھوٹ! وہ تو اجنبی ہے۔ ابھی تو اُسے ہمارے گاؤں میں آئے ہوئے چند چند آٹھ
دن بھی نہیں ہوئے۔"

"پر میں تو اُسے مدتوں سے جانتی ہوں۔"

"تم اُسے جانتی ہو؟ —— مدتوں سے؟"

"میری آواز کی حیرت پر حیداں کی آنکھیں کھلکھلا کر ہنسیں۔
مجھے قہقہے کی آواز تو سنائی نہ دی پر —— پر —— کچھ آوازیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو
کانوں سے نہیں سنی جاتیں۔ نجانے بندہ بشر کے پاس ان آوازوں کے سننے کے لئے کون سے
کان ہوتے ہیں۔ میں نے حیداں کی آنکھوں سے اس قہقہے کی آواز سنی تو پوچھا "حیداں تم
ہنسی تھیں؟"

"نہیں تو ماجے!"

حیداں اتنا کہہ کر اپنے گھر کی طرف مڑنے لگی تو میں نے پوچھا "بیکی پر نہیں چلو
گی؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"نجانے کیوں؟" وہ بولی۔ یہ بڑی چپ چاپ سی آواز تھی۔
تب اس نے مسکرا کر کہا "وہ جو گزرا کشکول ہاتھ میں لے کر مجھ سے ہم کلام ہونے
لگے گا تو میری ہنسی چھوٹ جائے گی اور تمہاری شیماں بڑی بڑی باتیں کرے گی۔"

"وہ جو گزرا کون؟" میں نے اُس سے پوچھا۔
تب اچانک مستری کی تصویر آنکھوں کے سامنے آئی تو میں نے کہا "یہ بات تو پہلی
بار میں نے سوچی تھی حیداں! —— اُس دن —— جب تمہاری بریٹی کھو گئی تھی۔"

"میں نے تیرے دل کی بات بوجھ لی تھی ماجے۔"

"اچھا تو تو دل کی باتیں بھی بوجھ لیتی ہے؟"

"ہاں! ہاں! شیماں سے کہنا اب میں مستری کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں نہیں کروں
گی۔ نہ تجھے شیماں کے آنگن میں جا کر کھیلنے سے روکوں گی۔"

"کیوں؟"

"مجھے نہیں پتہ—— جاتو ماہنے مجھ سے کچھ نہ پوچھ—— مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

میں اپنے گھر کی طرف جانے والی ٹیڑھی بنگی گلی میں مُڑ گیا۔ گلی میں کھلنے والے ایک دروازے سے نکل کر ریشو بھلی والی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا بات ہے ماسی؟"

"شیماں کے ہاں کھیلنے گئے تھے؟"

"ہاں گیا تھا۔"

"جایا کرو۔ سو بار جایا کرو۔ میں کون ہوں تجھے روکنے والی—— وہ جوان جو تمہارے گھر میں رہتا ہے' کون ہے؟"

"میرا بھا ہے۔ بیاس پار سے آیا ہے۔"

"اچھا جی—— حیداں تم سے اسی کی بات پوچھ رہی تھی نا؟"

"تمہیں کیسے پتہ چلا ماسی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"لگ گیا پتہ—— مجھے پتہ لگ جاتا ہے ماہنے—— ہر بات کا——"

"پھر تو تم ڈائن ہو ماسی۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

"ڈائن—— میں ڈائن ہوں یا تیری ماں؟" اُس نے میرے کندھے سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تو——" میں نے غصے سے کہا۔

"ماہنے!" ریشو نے لکڑی کی طرح سخت آواز میں کہا۔

"کہو—— کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"چوہدری نے حیداں کو بہت کھل دے رکھی ہے۔ میں بھی اپنے باپ کی بیٹی نہیں جو اسے پر کٹے پنچھی کی طرح پنجرے میں بند نہ کروا دیا۔"

حیداں کو پنجرے میں بند دیکھنے کے تصور ہی سے میں گھبرا گیا۔ مجھے وہ پنچھی اچھے لگتے ہیں جو اڑ رہے ہوں اور چہچہا رہے ہوں۔ پنجرے کا پنچھی کتنی دُکھ بھری آواز میں بولتا ہے!

"نہیں ماسی ایسا نہ کرنا۔ تم تو بہت اچھی ہو۔ وہ بات تو میرے منہ سے یونہی نکل گئی تھی۔ لوگ کہتے ہیں ماسی ریشم کا دل بڑا نرم ہے۔ وہ تو کسی کی بُرائی سوچ ہی نہیں سکتی۔"

مجھے یوں لگا جیسے اُس کا دل پسیج گیا ہو۔

اُس نے کہا "لوگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں ماہنے! پر تُو نے—— اچھا چھوڑ اس بات کو۔ یہ بتا تیرے بھا کا نام کیا ہے؟"

"اسلم۔"

"ماہنے! تجھے اس کی شکل صورت یاد ہے؟"

"کس کی؟"

"تُو نے تو اُسے دیکھا بھی نہیں ہو گا۔ میں بھی پاگل ہوں۔ کن گئے گزرے زمانوں کی بات لے بیٹھی۔ ابھی تو ماں کے پیٹ میں بھی نہیں آیا تھا کہ وہ——" ماسی رُک گئی۔

"وہ کون تھا؟ اسے کیا ہوا؟" میں نے ذرا بے قرار ہو کر پوچھا۔

"تھا کوئی—— ایک ڈائن نے اُسے مجھ سے چھین لیا۔"

"وہ ڈائن کون تھی؟"

"کوئی ہو گی۔ تجھے کیا؟ میں اس زمانے میں ریشم کا لچھا تھی' وہ کورے کھدر کا سوت تھی۔ میں نے ریشم کا جال بچھایا بھی نہ تھا کہ وہ موٹے سوت کے پھندے میں پھنس گیا۔"

"ماسی تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

"نہیں آ رہیں تو نہ سہی۔" اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا "پر وہ تیرے بھا کی طرح بانکا چھیلا تھا۔"

"ماسی!" میں نے خوش ہو کر کہا "تو میرے بھا کو اچھا سمجھتی ہے نا؟"

"ہاں! ہاں! اسی لئے تو میں حیداں کی بات چوہدری سے نہیں کہوں گی!" ماسی اپنے آپ میں کھو گئی۔ میں وہاں سے چپکے سے کھسک آیا۔ میں اس کی بات پوری طرح تو نہ سمجھ سکا پر اب میں خوش تھا کہ حیداں پنجرے میں بند نہیں ہو گی۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۴

○

تب اس سال گیہوں کی بوائی میں بھا نے میرے باپ کا ہاتھ بٹایا۔ جب کھیتوں میں بیج پھوٹے تو بھا نے اس نئے کھیس کی بُکل ماری جو میری ماں نے کات کر اور بنوا کر اُسے دیا تھا۔ اور صبح صبح میرے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک انجانے سفر پر روانہ ہونے لگا تو میں نے پوچھا

"بھا! کہاں جاؤ گے؟"

"خدا کی دنیا کی سیر کروں گا۔"

"اس گاؤں میں تمہارا جی نہیں لگا۔"

"کیوں نہیں؟"

"پھر نہ جاؤ۔" میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

بھا نے بڑی غمزدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"ماجے!" میرا باپ بولا۔

"جی!"

"اسلم کو نہ روکو۔"

"کیوں؟"

"تم نہیں جانتے۔ تم جان کر کرو گے بھی کیا؟"

میں باپ کی طرف بٹ بٹ دیکھتا رہا اور بھا رخصت ہو گیا۔

میرے باپ نے پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "ماجے! ہوا کے جھونکے کو کون روک سکتا ہے؟"

"کوئی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "پر جھونکا گزر جائے تو لوٹ کر نہیں آتا بابا؟"

"کون جانے!" اس نے کہا "اب تم کنویں پر آنا نہ بھولنا۔"

باپ کنویں پر چلا گیا' ماں گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ عائشہ میاں جی کے ہاں قرآن پڑھنے کے لئے چلی گئی۔ چھوٹو ابھی تک بستر میں منہ لپیٹے سو رہا تھا اور صبح کی دھوپ آنگن میں پھیل رہی تھی اور میں کتابیں بستے میں رکھ کر سکول جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ سب کام معمول کے مطابق ہو رہے تھے پر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے سب کچھ وہ نہیں' جو پہلے تھا۔ بھا اکثر کنویں پر رہتا تھا۔ وہ گھر میں کبھی کبھار آتا تھا۔ اس کے باوجود میں گھر کے آنگن میں اُسے ہر وقت چلتے پھرتے محسوس کرتا تھا۔ اب آنگن خالی تھا۔ گاؤں خالی تھا جیسے آنگن اور گاؤں انسان کے دل میں بستے ہوں۔

"دل سنسان ہو جائیں تو بستیاں بھی اُجڑ جاتی ہیں؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

بھا کے جانے کی خبر نہ جانے حمیداں تک کیسے پہنچی۔

اس شام اُس نے گلی کی ایک نکڑ پر مجھے روک کر پوچھا "تیرا بھا چلا گیا؟"

"ہاں چلا گیا حمیداں۔"

"تم نے اُسے کیوں جانے دیا؟"

"ہوا کے جھونکے کو کون روک سکتا ہے بھلا؟"

"ٹھیک کہتے ہو ماجے۔"

میں حمیداں سے رخصت ہو کر ذرا آگے بڑھا تھا کہ ماسی ریشم نے میرا رستہ روک لیا۔

"وہ چلا گیا؟"

"ہاں ماسی!"

"ریشم کا جال ہمیشہ ٹوٹ جاتا ہے ماجے۔"

"پر وہ موٹے سوت کے پھندے میں بھی تو نہیں پھنسا تھا ماسی۔"

"کون جانے؟—— کون جانے؟——" ریشم نے ٹوٹی ٹوٹی آواز میں ہنس کر کہا۔

سردیاں تیز ہوئیں تو میں منہ اندھیرے سکول جانے کے لئے گھر سے اٹھتا اور رات پڑے کنویں سے لوٹ کر گھر پہنچتا اور اتوار کو چھٹی بھی کنویں پر گزار دیتا۔ اتنی مصروفیت میں بھی میں تنہا تھا۔ انسان کو جانے اکیلے پن سے نباہ کرنا کیوں نہیں آتا؟ وہ مل بیٹھنے کے وسیلے ڈھونڈتا ہے' میلوں ٹھیلوں میں جاتا ہے' تکیے میں بیٹھ کر گپیں ہانکتا ہے' لڑتا بھڑتا ہے اور ہنستا

ہوتا ہے تو زندگی گزرتی ہے۔

مجھے بھی تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑی تو میں ایک اتوار کو شیماں کے ہاں چلا گیا۔ شیماں کے آنگن میں ایک کھونٹے سے گوری بندھی تھی۔ میں نے اُس کے پٹھے پر ہاتھ پھیرا تو پٹھا پڑا اینٹھ سا گیا۔ اس نے مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ میرے ہاتھ کو کسی غیر کا ہاتھ سمجھ رہی ہو۔ شیماں کوٹھڑی سے باہر نکل کر آئی تو وہ بھی مجھے عجیب عجیب نظروں سے تکنے لگی جیسے کہہ رہی ہو، تم کون ہو۔ میں نے آنگن میں نظر دوڑائی تو تمڑے پڑے خراس کے پتھر غائب تھے اور بابا نتھو ایک کونے میں بیٹھا ایک زنگ لگے تیشے سے ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ کا بازو ٹھیک کرتا ہوا نظر آیا۔

ماہنے!" بابا نتھو بولا "تم؟"

"ہاں بابا!"

"کہاں رہے اتنے دنوں؟"

"یہیں —— بابا خراس کو کیا ہوا؟"

"بیچ دیا پانوں کو۔"

"اب تم؟"

"میں اب "سیپ" کروں گا۔"

بابا نتھو کا آبائی پیشہ بڑھئی کا تھا۔ ایک عرصے سے خراس لگا کر اس نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ ایک اور بڑھئی دینے نے اس کا کام سنبھال لیا تھا۔ سارے گاؤں کی "سیپ" اس کے پاس تھی۔ ہر فصل پر بڑھئی کو کسانوں سے اپنے حصے کے دانے مل جاتے تھے۔

"تمہاری "سیپ" چل جائے گی بابا؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں —— اتنا گاؤں ہے۔ کچھ گھر مجھے بھی مل جائیں گے۔"

"پر بابا تم بوڑھے ہو چکے ہو۔"

"پھر کیا ہوا۔ میں اپنا کسب تو نہیں بھولا۔"

"گاؤں بھی تو اتنا بڑا نہیں بابا! دو بڑھئی ایک گاؤں میں؟"

"ہوتے رہیں۔ سب کو روزی دینے والا تو ایک ہے۔"

شیماں ہماری باتیں سننے کے لئے ہمارے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

میں نے اچانک اس کی طرف مڑ کر کہا "آؤ شیماں کھیلیں۔"

"نہیں جی —— سّلی بگڑ جائے گا۔"

"سّلی! کیوں؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"وہ ابھی کھیلنے کو آئے گا تو ——"

"تو کیا ہو گا؟"

"مجھے کیا پتہ؟ تم نے آنا چھوڑ دیا تو سّلی کو کیسے روکتی؟ وہ کہہ رہا تھا ماہنا یہاں آیا تو میں نہیں کھیلوں گا۔"

"شیماں! بھا چلا گیا تھا۔ میں بڑا اُداس رہا۔"

"بھا چلا گیا تھا تو پھر کیا ہوا؟ تم تو بھا کے ساتھ گاؤں نہیں چھوڑ گئے تھے؟"

"میں چلا جاؤں شیماں؟"

"نہیں —— نہیں ماہنے!" بابا نتھو بولا "کھیلو —— میرے آنگن میں کھیلو —— شیماں کون ہوتی ہے میرے آنگن سے لوگوں کو نکالنے والی؟ سّلی آئے گا تو اسے بھی کھیل میں ساجھی بنا لینا حالانکہ اس کے باپ نے شیطانی کرخانہ لگا لیا ہے پر اس میں سّلی کا کیا دوش؟"

سّلی کے آنے پر شیماں کوٹھڑی کے اندر گئی اور لپ بھر کر ریٹھے کی گولیاں لے آئی۔ اس نے آدھی گولیاں مجھے دیں۔ سّلی نے کچھ غصے اور کچھ حیرت سے مجھے دیکھا۔ آنگن کی ایک دیوار سے ذرا ہٹ کر ہم نے ایک ننھا سا گڑھا کھودا۔ اس سے کچھ فاصلے پر پیچھے ہٹ کر ہم نے نشان لگایا۔ پہلی گولی شیماں نے اس نشان پر پاؤں رکھ کر پھینکی۔ وہ "کھتی" سے کچھ فاصلے پر رُک گئی۔ دوسری گولی سّلی نے پھینکی۔ وہ کھتی کے اندر جا پڑی۔ میں نے گولی پھینکی تو وہ کھتی سے بہت دُور رہی۔ دو تین مہینوں سے مجھے کھیلنے کی مشق نہ رہی تھی۔ چنانچہ میں پھاڈی قرار دیا گیا۔ سّلی کو پہلی باری ملی۔ ہم نے دو دو گولیاں بد کر کھیل شروع کیا۔ سّلی نے میری اور شیماں کی گولیاں ایک ہی بلے میں جیت لیں، اس طرح وہ جیتتا رہا اور ہم ہارتے رہے۔ آخری بار میں نے اپنے حصے کی دو گولیاں جیت لیں، لیکن شیماں کے پاس کوئی گولی باقی نہ رہی۔ وہ کھیل سے الگ ہو گئی۔

میں نے کہا "شیماں! تم میری باری لے لو۔"

"نہیں ماہنے!" سّلی بولا "جس کی باری ہے، وہی کھیلے۔"

"تم کھیلو نا سی!" شیماں نے مسکرا کر کہا۔

میں نے اپنی دونوں گولیاں شرط میں لگا دیں۔ سَتی نے چاروں گولیاں کھُتّی کی طرف پھینکیں۔ اِن میں سے ایک اُس کے اندر لڑھک آئی۔ اُس نے میری بتائی ہوئی گولی پر نشانہ لگایا لیکن نشانہ ٹھیک نہ پڑا۔ میں نے اپنی باری پر باقی تین گولیاں دیوار کی طرف پھینکیں۔ میں چاہتا تھا کہ ڈھلوان سے کوئی گولی لُڑھکتے لُڑھکتے کھُتّی میں آ پڑے تو اُسے لے کر نشانہ لگا سکوں۔ میرے پاس نشانہ لگانے کے لئے کوئی فالتو گولی نہ تھی۔ ایک گولی لُڑھکتے لُڑھکتے کھُتّی کے کنارے پر آ کر رُک گئی تو میں نے بڑی بے بسی سے شیماں کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرانے لگی جیسے وہ میرا دل بڑھا رہی ہو۔ سَتی نے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھا تو اُس کے ہونٹ بھنچ گئے۔

میں نے کہا "سَتی! میرے پاس فالتو گولی نہیں ہے۔ اپنا "کانُو" مجھے دو تو نشانہ لگاؤں۔"

"نہیں" سَتی نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔

"سَتی! دے دو نا "کانُو" مانگے کو۔" شیماں بولی۔

"نہیں۔"

"جیتنے والوں کے دل اتنے تو چھوٹے نہیں ہوتے سَتی۔" شیماں نے کہا۔

سَتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے تینوں گولیاں اکٹھی کیں اور کھُتّی کی طرف پھینکیں۔ اس بار بھی وہ گولی نہ جیت سکا۔ میں نے اپنی باری پر ایک گولی جیت لی۔ تب اس ایک گولی نے کھیل کا پانسہ پلٹ دیا۔ میں نشانے پہ نشانہ لگاتا رہا اور سَتی ہارتا رہا۔ آخر سَتی کی جیب خالی ہو گئی۔ اس نے مجھے غضب ناک نگاہوں سے دیکھا جیسے مجھے کچا چبا جائے گا۔ میں نے جان بوجھ کر اس سے آنکھیں نہ ملائیں۔ میں نے کنکھیوں سے شیماں کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس لمحے مجھے یہ مسکراہٹ انوکھی سی معلوم ہوئی۔ میں اس مسکراہٹ کا محرم بننے کی کوشش کر رہا تھا کہ یکایک سَتی نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

اس نے دانت کچکچا کر کہا "تم روندو ہو۔"

"نہیں میں نے کوئی روند نہیں مارا سَتی!"

"تم کیا تمہارا باپ بھی روندو ہے۔"

"سَتی! میرے باپ کا نام نہ لو۔"

"تیرا باپ——" سَتی کے منہ سے ابھی گالی نہیں نکلی تھی کہ میں نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ تب چَر سے میرا گریبان پھٹ گیا۔ میں نے سَتی کے منہ پر دوسرے ہاتھ سے چانٹا لگایا تو وہ مجھ سے گُتھ گیا۔

"کیوں لڑتے ہو پاگلو؟" بابا نتھو دُور سے بولا۔

"سَتی نے ساری گولیاں ہار دی ہیں اور اب لڑتا ہے۔" شیماں بولی۔

"ہار مان لینے والے ہی تو اصلی بہادر ہوتے ہیں سَتی!" بابا بولا۔

سَتی نے اڑنگا لگا کر مجھے گرانا چاہا تو ایک اجنبی آواز نے پکار کر کہا "شاباش سَتی۔"

"چُپ رہ مستری۔" بابا نتھو نے کہا اور اُس نے آگے بڑھ کر ہم دونوں کو چھڑا دیا۔

"سَتی کھیل میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ ہارے تو وہ ہیں جو اپنی ہار کو خوشی نہیں مانتے۔ مجھے دیکھو میں نے اپنی ہار مان لی ہے۔ میں بھی تیری طرح تھڑدلا ہوتا تو چوہدری کی مشین کو توڑنے لاٹھی لے کر نکلتا۔ مشین تو نہ ٹوٹتی پر میں اپنے منہ پر کالکھ ضرور مل لیتا۔"

"بابا ایک دو ہاتھ اور ہو جاتے تو مزہ آ جاتا۔ تو نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔"

"مستری! تو کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔" بابا نے اُسے ذرا ڈانٹ کر کہا۔

میں نے شیماں کے آنگن میں پہلی بار مستری کو دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ وہ اس آنگن میں اجنبی تھا۔ یہ میرے لئے ایک نئی بات تھی جیسے گلاب کے پودوں کے درمیان تھوہر اُگ آئی ہو۔ وہ شیماں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور سَتی مجھے لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا اور شیماں کے تمتماتے ہوئے گالوں کے گڑھے سُرخی اور سفیدی میں ڈُوب چکے تھے اور سردیوں کی دھوپ میں سرسوں کے پھُول کھِل رہے تھے اور میں حیران تھا کہ یہ جوگڑا کشکول لے کر شیماں کے آنگن میں کیوں آ گیا ہے اور تب شیماں کے آنگن میں کھڑے کھڑے میں اپنی آنکھوں کے سامنے آپ جوان ہو گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میرا بچپن ایک لمحے پر رُک گیا ہو اور اب لمحے کا جادو ٹوٹ گیا ہو اور سفر کی ایک نئی منزل سامنے آ گئی ہو۔ میرا تن من تھرتھرا گیا۔ تب دھوپ لرز گئی اور میں نے ساری گولیاں آنگن میں بکھیر دیں اور ان کے ساتھ میں بھی آنگن میں بکھر گیا۔

"ماہنے! یہ تم نے کیا کیا؟" شیماں بولی۔
"کچھ بھی نہیں۔۔۔ اب ہم گولیاں نہیں کھیلیں گے۔" میرا بکھرا ہوا وجود سمٹ گیا۔
"سِلّی سے ڈر گئے ہو؟" مستری نے پوچھا۔
"نہیں تو۔۔۔" میں نے کہا۔
"ہار جیت کا ابھی فیصلہ تو نہیں ہوا۔" مستری بولا۔
"مستری! تم پھر انہیں لڑانا چاہتے ہو؟" بابا نتھو نے درشتی سے کہا۔
"ماہنے! اب تم گولیاں کھیلنے نہیں آیا کرو گے؟" شیماں نے پوچھا۔
"نہیں شیماں!" میں نے کہا۔
"سِلّی! تم بھی نہ آیا کرنا اب۔"
"شیماں! تم نے اچھا فیصلہ کیا۔" مستری نے قہقہہ لگا کر کہا۔
"چپ رہو مستری!" میں نے تن کر اسے ڈانٹا تو اس کا قہقہہ اس کے گلے میں پھنس گیا۔ وہ کچھ دیر حیران رہا' پھر اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا "ہوں!۔۔۔ مجھے ڈانٹتے ہو؟۔۔۔ جاؤ پہلے اپنے پھٹے ہوئے کُرتے کو تو سلوالاؤ۔ سِلّی نے اڑنگا لگایا تھا' جو بابا بیچ میں نہ کود پڑتا تو تم چت لیٹے ہوتے زمین پر۔"
"مستری! تم بھی نہ آیا کرو میرے آنگن میں۔" شیماں نے بڑی ٹھٹھری ہوئی آواز میں کہا۔
"شیماں!" بابا نتھو نے اُسے پکارا۔
"ہاں بابا!"
"آج تم سب کو آنگن سے نکالنے پر کیوں تُل گئی ہو؟"
"مجھے نہیں پتہ۔" شیماں نے روٹھے انداز میں کہا۔
"لوگ آتے جاتے رہیں تو آنگن میں رونق رہتی ہے۔ تم سونے اور سنسان آنگن کو لے کر کیا کرو گی؟"
"ماہنا نہیں آئے گا تو کوئی بھی نہیں آئے گا۔"
"ماہنے سے کس نے کہا ہے کہ یہاں نہ آئے؟" بابا نے پوچھا۔
"کسی نے بھی نہیں۔" مستری نے ایک آنکھ بھینچ کر کہا۔

"ماہنے! تم آیا کرو گے نا؟" شیماں نے کہا۔
"ہاں!" میں نے کہا اور شیماں خوش ہو گئی۔
میں نے "ہاں" تو کر لی پر میرا جی بڑا بے کل سا رہا۔ سِلّی کے وجود سے میں بچپن سے مانوس تھا۔ اُس سے لڑائی بھڑائی بھی مجھے اس سے دور نہ کرتی تھی۔ میں اُس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ کر بھی اُس سے گزارا کر سکتا تھا۔ ہم ایک نہیں تھے دو تھے' پر مستری تیسرا شخص تھا جس کی شیماں کے آنگن میں موجودگی مجھے بہت کھل رہی تھی' جیسے وہ پوہلی کا پودا ہو جسے ہم کھیتوں سے اکھاڑ پھینکا کرتے ہیں۔ پوہلی کے وجود کو گندم کے نازک پودے برداشت نہیں کرتے اور جہاں پوہلی ہو' وہاں اکھوے سُوکھ جایا کرتے ہیں۔ پر میں اسے شیماں کے آنگن سے کیسے اکھاڑ پھینکتا۔ میں کون تھا؟
لیکن گاؤں کے لوگ بھی تو اُسے پسند نہیں کرتے تھے۔
خراس کے بند ہونے اور چکی کے رواج پا جانے سے لوگوں کا وقت بچ جایا کرتا تھا۔ چکّی پر آٹا پسوانے کے لئے چھوٹے بچوں کا ہجوم ہوتا اور مستری ان کی بہت ڈانٹ ڈپٹ کرتا۔ ہم گاؤں والے کسی نئی تبدیلی سے جلدی سمجھوتا نہیں کر پاتے۔ گاؤں کی لڑکیاں کھیتوں میں کام کرتی ہیں' کنوئیں پر جاتی ہیں' گلیوں میں آزادی سے پھر لیتی ہیں' دودھ دوہتی ہیں' چارا کاٹ لیتی ہیں۔ ان کی امداد کے بغیر کھیتی باڑی کا کام نہیں چلتا۔ میرے بچپن میں بھی ایسا ہوا کرتا تھا' اب بھی وہی ہوتا ہے۔ آنکھ میں شرم ہو تو لڑکی کو کوئی کھا نہیں جاتا۔ پہلے پہل چکّی لگی تو ہم جوان لڑکیوں کو آٹا پسوانے کے لئے وہاں نہیں بھیجا کرتے تھے۔ اب چکی لگے ایک سال سے اوپر ہو گیا تھا۔ اب کوئی مٹیار چکّی پر چلی بھی جاتی تو اتنی بری بات نہ سمجھی جاتی پر مستری سے لوگ خوش نہیں تھے۔ وہ ہم میں سے نہیں تھا۔ وہ ہماری عزت کا ساجھی کیسے بنتا۔ وہ کسی مٹیار کو چکّی پر دیکھ کر کھیسیں نکال دیتا۔ وہ اس کے سامنے کشکول لے کر کھڑا ہو جاتا تو لوگ بُرا مانتے۔ خاص طور پر گاؤں کے جوانوں کو مستری کی یہ عادت بہت بری لگتی۔ پر انہیں سارا دن ہل کا جوا کندھوں پر رکھنا پڑتا تھا۔ کھیتی باڑی کے کام میں انسان ڈھور ڈنگروں کے ساتھ ڈھور ڈنگر بن جاتا ہے۔ مٹی میں مل کر مٹی بننا پڑتا ہے' تب کہیں مٹی اپنا چھپا خزانہ اگلتی ہے۔ انہیں اتنا وقت کہاں ملتا جو چکّی پر آتے اور مستری کی کشکول توڑ کر مٹی میں ملا دیتے۔ یوں چوہدری کا ہاتھ بھی تو مستری کے سر پر تھا۔

اس کے ہوتے مستری کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنا بھی دل گردے کا کام تھا۔
پر میں چودہ سال کی عمر میں مستری کے مقابلے پر آنے کو تیار تھا۔
میں جب بھی اُسے شیماں کے آنگن میں دیکھتا' میرا رواں رواں کانٹے کی نوک بن جاتا۔ یہ کانٹے مجھے ہی چبھتے' مستری کے خلاف بابا نتھو سے کہنے کے لئے میرے پاس کوئی بات نہ تھی۔ چودہ سال کی عمر میں انسان کی سوچ بچپن اور جوانی کے سنگم پر ہوتی ہے۔ شاید میری بچی سوچ کا لڑکپن پکی سوچ کی جوانی سے ٹکر لینے سے ڈر رہا تھا شاید۔۔۔ شیماں سے مجھے۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرے اور شیماں کے درمیان جو فاصلہ تھا' مجھے اس کا پورا پورا احساس تھا۔۔۔ پر شیماں اور مستری۔۔۔
ایک دن میں نے بابا نتھو سے پوچھا "بابا! مستری تمہارے گھر میں کیوں آتا ہے؟"
بابا نتھو دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی گدلی گدلی آنکھوں میں حیرت تھی۔
"کیوں آتا ہے؟" وہ بڑبڑایا۔
"ہاں بابا! کیوں آتا ہے؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔
"اس کا جی چاہتا ہے تو آجاتا ہے۔ ماہنے! تو کیوں پوچھتا ہے؟"
"مجھے نہیں پتہ بابا۔"
"وہ میری ذات برادری کا آدمی بھی تو ہے ماہنے۔ پھر وہ ہمارے گاؤں میں اجنبی بھی تو ہے۔ ہاں! مجھے یاد آیا۔ وہ تمہارے گھر جو مہاجر لڑکا آیا تھا' اب وہ کہیں نظر نہیں آتا۔"
"وہ تو چلا گیا ہے بابا۔"
"کیوں چلا گیا؟"
"مجھے کیا پتہ؟ وہ تو ہوا کا ایک جھونکا تھا۔"
"ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ یہاں جو بھی آتا ہے' ہوا کا جھونکا بن کر آتا ہے۔"
"یہاں؟۔۔۔ اس گاؤں میں؟"
"ہاں!۔۔۔ اس گاؤں میں۔۔۔ یا اس دُنیا میں۔۔۔ بات ایک ہی ہے۔"
بھا اسلم کی یاد بھبھکا کر آئی تو میں مستری کو بھول گیا۔ میں اب بھی حیران ہوں کہ بھول کے ایک بھرپور لمحے پر وقت بھنور کیوں بن جاتا ہے اور ہر یاد کو ہڑپ کیوں کر لیتا ہے۔ اب وقت کے بھنور میں غوطہ لگاتا ہوں' تو یادوں کے بکھرے بکھرے ٹکڑے ہاتھ لگتے ہیں۔ سکول جانا اور واپس آنا۔۔۔ دیئے کی دھیمی لَو میں پڑھنا۔۔۔ سردیوں کا گزرنا۔۔۔ گندم کی فصل کے کنوارے جوبن کی بے نام سی خوشبو۔۔۔ ہر موڑ پر بل کھا کر کھیتوں میں گم ہو جانے والی پگڈنڈیوں کے ساتھ سنہری دھوپ کی آنکھ مچولی۔۔۔ پانچویں جماعت کا امتحان۔۔۔ کامیابی کی خوشی۔۔۔ گندم کی کٹائی کے لئے چھٹیاں۔۔۔ پکے ہوئے سنہری خوشے۔۔۔ لہراتی ہوئی تیز دھوپ درانتیوں کی کٹاکٹ کی آواز۔۔۔ سر پر منڈاسے' پتلی لسی کے کٹورے۔۔۔ بہتے ہوئے پسینے کی دھاریں۔۔۔ دھوپ سے چُندھیائی ہوئی آنکھیں۔۔۔

اور اس دن دھوپ بہت تیز تھی۔
کھیت کٹ رہے تھے اور کھلیان لگ رہے تھے۔ بیل دُبلے پڑ چکے تھے۔ کسانوں کے چہرے سنولا چکے تھے۔ فصل کی کٹائی میں بابا نتھو بھی ہمارے ساتھ شریک تھا۔ خراس بند ہونے کے بعد مٹھی بھر آٹے کے لئے اس نے سر پر منڈاسا باندھ کر درانتی ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ خراس چلتا تھا تو مٹھی بھر آٹا واقعی اُوپر سے برستا تھا۔ اب وہی آٹا گندم کے پکے ہوئے خوشوں میں قید تھا۔ بابا نتھو کا بڑھاپا مٹھی بھر آٹے کے لئے پسینے میں شرابور تھا۔
اس نے منڈاسے کے پلّو سے آنکھوں کا پسینہ پونچھتے ہوئے مجھ سے پوچھا "ماہنے! مٹھی بھر آٹے کے لئے بندہ بشر کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔"
میں نے درانتی زمین پر رکھ کر کہا "مٹھی بھر آٹے کے لئے۔"
"ہاں! ہاں! مٹھی بھر آٹے سے ایک دو روٹیوں کا بندوبست ہوتا ہے۔"
"ٹھیک ہے بابا!"
"انسان کو پیٹ نہ لگا ہوتا تو وہ فرشتہ ہوتا۔"
"ہاں بابا!"
"شیماں کا باپ زندہ ہوتا تو اس بڑھاپے میں منڈاسا باندھ کر درانتی ہاتھ میں کیوں پکڑتا؟"
"شیماں کا باپ؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔
بابا میرے لہجے کی حیرت پر ذرا سا حیران ہوا۔ میں خود بھی حیران تھا۔ شیماں اور بابا نتھو کے درمیان یہ کڑی غائب تھی۔ مدتوں سے۔۔۔

"شیماں ابھی ماں کی گود میں تھی جب وہ ہمیں چھوڑ گیا۔ تم بھی چھوٹے سے تھے۔ تمہیں اس کا کیا پتا؟"

"شیماں کی ماں؟" میں نے پوچھا۔

"شیماں کی ماں نے تین چار سال بڑے صبر شکر سے کاٹے۔ تب میں نے اُس کا "حق" کر دیا۔ وہ پہاڑ جیسی جوانی رنڈاپے میں کس طرح کاٹتی۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"جوگ پور میں ـــــ اُس کے بچے ہیں ـــــ اب تو وہ شیماں کو بھول چکی ہے۔ اُسے شیماں کا خیال آئے بھی تو اتنے بھرے بھرائے گھر کو چھوڑ کر یہاں کیوں آئے ـــــ اچھا ہوا، وہ شیماں کو بھول گئی۔"

ہمارے ساتھ کے لوگ گیہوں کاٹتے کاٹتے ہم سے دُور آگے نکل گئے تھے۔ میرے باپ نے دُور سے پکار کر کہا۔ "ماہنے! بابا تھو کو تو نے باتوں میں لگا لیا۔"

"چوہدری یونہی باتیں چھڑ گئیں تو نجانے اس چلچلاتی دھوپ میں فضلو کیوں یاد آ گیا؟" بابا بولا۔

"کیا بات تھی فضل دین کی! واہ واہ کتنا کُھلے کُھلے ہاتھوں کا گھبرو تھا۔ درانتی اس کے ہاتھ میں آتی تو بجلی بن جاتی۔ تم کیکر کی چھاؤں میں ذرا بھر کو ستا کیوں نہیں لیتے بابا؟"

"نہیں موج دین! یہ سریر بڑا کمایاں ہے۔ کام نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اب اُسے ٹھنڈا سایہ ملا، تو میرے بس میں نہیں رہے گا۔"

کٹ کٹ کٹ ـــــ درانتی چل رہی تھی۔ کٹے ہوئے کھیت میں گندم کے پُولے ڈھیر ہو رہے تھے۔ یکایک پورا کھیت کٹ گیا اور سورج کا گولا مغرب کے ڈھلان پر سے لڑھک سا گیا۔ میری آنکھوں میں پسینہ گر رہا تھا۔ میں آنکھوں سے پسینہ پونچھ بھی نہ سکا تھا کہ "لاوؤں" نے پُولے اکٹھے کرنے شروع کر دیئے۔ تب سلا چگنے والیاں کھیت میں آ گئیں۔ اس ٹولے میں لڑکیاں بھی تھیں اور عورتیں بھی۔ انہوں نے اپنی کھدر کی چادروں کی "جھولیاں" بنائی ہوئی تھیں۔

میرے باپ نے کٹے ہوئے کھیت پر ایک نظر ڈال کر سلا چگنے والیوں سے کہا "تم بھی آ پہنچیں۔ اچھا چگ لو اپنا دانہ دنکا۔ ریشم بی بی اے! کچھ دانہ دُنکا پنکھ پکھیروؤں کے لئے بھی چھوڑ دینا۔"

"اچھا! اچھا! موج دینا! یہ تو بتا تجھے ساری دُنیا کی فکر کیوں ہے؟" ماسی ریشم نے کہا۔

"دھرتی بڑی دیالو ہے ریشماں۔ کسان تو اس کا امانت دار بنایا گیا ہے۔ سب کو اپنا نصیب ملنا چاہئے۔"

"ہاں! ہاں! ملنا چاہئے!" ماسی ریشم نے جُھک کر ایک بالی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ گاؤں کی ازلی ریت ہے کہ ہم کسانوں کی بہو بیٹیاں سلا نہیں چُگتیں، کیونکہ کٹائی کے دوران پودوں سے جھڑنے والی بالیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ کمیں کمیوں کا حصّہ ہے یا ہم میں سے اُن کا جن کے سر پر مردوں کا سایہ نہ ہو۔ شیماں پہلی بار مجھے اس گروہ میں نظر آئی تو میرا جی بیٹھ گیا۔ یوں بھی جوں جوں گیہوں کا کھیت کٹتا جاتا ہے، میں اُداس سا ہوتا چلا جاتا ہوں۔ کٹے ہوئے کھیت سنسان اور ویران لگتے ہیں۔ کھیت سے پولے اُٹھ رہے تھے اور سلا چگنے والیاں بالیاں چُننے میں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ماسی ریشم بڑھاپے کے باوجود سب سے زیادہ تیز تھی۔ اُس کی انگلیوں میں بلا کی تیزی تھی۔ اُس کی آنکھ ٹھنٹھوں کے درمیان پھنسی ہوئی بالی کو دُور سے دیکھ لیتی پر شیماں کی رفتار بڑی سست تھی۔ اوّل تو کوئی اکا دکا بالی اس کی نظر چڑھتی اور پھر جُھک کر اسے چُن لینے میں بھی اُسے کافی دیر لگتی۔ وہ کبھی کبھار جُھکی جُھکی آنکھوں سے مجھے بھی دیکھ لیتی جیسے کہہ رہی ہو "میرا تماشہ دیکھ رہے ہو۔" مجھے شرم آتی۔ کیوں؟ میں نہیں جانتا ـــــ تب اُس کا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا۔ کالے بالوں کی ایک لٹ ماتھے سے چپک گئی اور میں نے پولے اکٹھے کرنے شروع کر دیئے۔

ٹوں ـــــ ٹوں ـــــ مینڈھ پر کیکر کے سائے تلے سے چکارے کی آواز آئی۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ شام کے قریب جب سائے لمبے ہو رہے ہوں اور دھوپ سمٹ رہی ہو تو چکارے کی آواز سے اُداسی سی پھیل جاتی ہے۔ ڈھیلے ڈھالے تاروں پر جب گز پھرتا ہے تو ان سے تھکی تھکی ممیاتی ہوئی آواز نکلتی ہے اور ٹوں ٹوں کے ساتھ جب ایک پوپلے منہ سے ڈھول تی کے بول پھُوں پھُوں نکل رہے ہوں تو گُھٹے ہوئے نغمے کی بے بسی سے جی گھبراتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بھرائیں کا گانا اور میراثی کا رونا ایک برابر ہے اور ہمارے گاؤں کا بھرائیں تو ہر وقت روتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں بچپن سے اس کا گانا سن رہا

ھا۔ وہ مجھے صدیوں پرانا کیکر کا وہ ٹنڈمنڈ درخت معلوم ہوتا تھا جس کی ایک شاخ بھی ہری نہ رہی ہو۔

"بس! بس! چاچا!" میرے باپ نے پکار کر کہا۔ "ایک پولا اٹھا اور اگلے کھیت کی راہ لے۔ بہت سے لوگ تیری راہ تک رہے ہیں۔"

"موز دینا! کش گانا وانا بھی سُن لیا کرو۔" بھرائیں نے پوپلا کر کہا۔

"نہیں چاچا۔ ابھی پولے اکٹھے کرنے ہیں۔ کہیں شام تک کام پورا ہو گا۔"

"کام تو ہوتا رہے گا موز دینا! دیکھ تو چکارا کیا کہتا ہے۔ تھمّی آکھے ڈھول نوں——"

"چاچا! بس! دیکھتے نہیں ہو، تیرا گانا سن کر ریشم نے بھی کام چھوڑ دیا ہے۔"

"ریشم بی بی جب کسی شادی بیاہ میں تھمّی ڈالتی تھی تو واہ واہ! میرا چکارا بولتے بولتے رہ جاتا تھا۔ میں اسے چھُپ چھُپ کر دیکھتا۔ وہ دیکھ لیتی تو شامت ہی آ جاتی۔"

بھرائیں نے کہا اور آہ بھری۔ "سچ کہتے ہیں، غم جوانی کو گھُن کی طرح کھا جاتا ہے اور بڑھاپا تو——"

"موج دینا! چاچا بڈھا میری بات کر رہا ہے؟" ماسی نے دُور سے پکار کر پوچھا۔

"نہیں ریشم بی بی اے! تیری بات کون کر سکتا ہے؟ چاچا بڈھے کی کیا مجال——"

"چاچا! میری بات کی تو چکارا توڑ کر پھینک دوں گی۔"

"توبہ میری—— میں بھلا تیری بات کر کے جندہ بچ سکتا ہوں۔ دیکھ موز دینا! غم کی آگ میں جلا ہوا بڑھاپا بھی کتنا کرارا ہے! ایک تُو ہے کہ جوانی میں بھی بوڑھوں جیسی باتیں کرتا ہے۔"

میرے باپ نے ایک پولا بڈھا بھرائیں کے سر پر رکھا اور اسے کھیت سے چلتا کیا۔ اس کے بعد کانا شیخ آ گیا۔ اس نے وہ ڈھول پیٹا کہ کان بہرے ہو گئے۔ اس نے بھی ایک پولا لیا اور اپنی راہ لی تو خانو مراثی آ گیا۔ اس نے دُور سے ہوک لگائی۔ "چوہدری موج دین کی خیر۔ جد ہری ویل ساوی۔ کھیت کھلیان آباد۔" میرا باپ مسکرایا۔ اس نے ایک پولا اس کے بھی سپرد کیا۔ تب شام کے سائے لمبے ہو گئے اور کھیت خالی ہو گیا۔ پولے اکٹھے ہو گئے، گٹھے بندھے اور کنویں کے نزدیک کھلیان میں جمع ہو گئے۔ ماسی ریشم اور اس کی ساتھی عورتیں سلا چگتی رہیں۔ اندھیرا چھا گیا اور گرے پڑے خوشے آنکھوں اور انگلیوں کے ملاپ سے آنکھ

مچولی کھیلنے لگے تو سلا چگنے والیاں بھی ایک ایک کر کے کھیت سے چلی گئیں۔ اس وقت ہَوا کے جھونکوں میں بھی ٹھنڈک کی ایک لہر سی سرسرائی اور ماسی نے کمر پر ہاتھ رکھ کر سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔ "اُف! اُف!"

"کمر دُکھ رہی ہے ماسی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! ہاں ماہنے!—— کمر کوئی لوہے کی تو نہیں بنی ہوئی۔ تو کیوں آیا کھیت میں؟ کوئی پولا رہ گیا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"شیماں!" ماسی نے آواز دی۔

"میں یہیں ہوں ماسی۔"

"آؤ چلیں۔"

"اچھا!"

ماسی نے شیماں کی جھولتی میں ہاتھ ڈال کر کہا "بس! اتنا سا سلا چگ سکی ہو؟"

"ہاں ماسی!"

"کٹ کٹا کر ایک سیر دانوں سے زیادہ کیا نکلیں گے۔"

"ایک سیر؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اور کوئی من بھر ہوں گے؟" ماسی نے چڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "بے چاری کو مصیبت پڑ گئی۔ نہ اس کا خراس بند ہوتا نہ اسے سِلا چگنا پڑتا۔" اس نے ایک دو لمحوں کے لئے رُک کر پوچھا۔ "تیرا بھا کب آ رہا ہے ماہنے؟"

"بھا!" میں ماسی کے اس اچانک سوال پر چونک اٹھا۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"وہ باؤلی باؤلی سی پھر رہی ہے۔" ماسی نے کہا۔

"وہ کون؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو اس گاؤں کی رانی ہے۔ اسے بھی سلا چگنا پڑتا تو سب کچھ بھُول جاتی۔ شیماں آؤ چلیں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں ماسی؟" میں نے پوچھا۔

"تیری خوشی ہے۔ تُو نے کون سا میرے کندھوں پر سوار ہو کر چلنا ہے۔"

"ماسی! میری انگلی میں چھلنتر چبھ گئی ہے۔" شیماں نے کہا۔

"ایک چھلنتر؟"

"ہاں ماسی!"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ بلا چگنے والیوں کے ہاتھ تو چھلنی ہو جاتے ہیں۔"

میں ان کے ساتھ ساتھ ذرا فاصلے پر چل رہا تھا۔ میرا جی چاہا میں شیماں سے پوچھوں "شیماں! چھلنتر کہاں چبھی ہے؟" پر میں ایسا نہ کر سکا۔ میں حیران ہوا کہ ایسا خیال میرے دل میں کیوں آیا یہ اجنبی سا خیال! میں اپنے خیال پر اُداس سا ہو گیا اور شام کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں دُکھ کی ایک لہر بھی اُٹھی۔ یہ دُکھ کس کا تھا؟ میں نہیں جانتا۔۔۔ میں اندھیرے میں شیماں کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ پر مجھے اس کے بھیگے ہوئے چہرے کی تمتماہٹ بھی یاد آئی اور میلے بالوں کی وہ لٹ بھی جو اس کے ماتھے پر چپک گئی تھی اور مجھے یوں لگا جیسے میرا بچپن گزر گیا ہو اور میرے اور شیماں کے درمیان فاصلے بڑھ گئے ہوں۔

تب ہم اس فاصلے کے دو نقطوں پر ایک دوسرے سے دُور دُور کھڑے تھے۔ میں کٹائی کر رہا تھا اور وہ بلا چگ رہی تھی اور کھلیان اونچا ہو رہا تھا۔ گٹھوں کو زمین کے فرش پر پھیلا دیا گیا اور بیلوں کے پاؤں تلے دانے بھوسے سے الگ ہونے لگے۔ میں سر پر کھدّر کی چادر کا منڈاسا باندھ کر "پھلے" کے اوپر کھڑا چک پھیریاں لے رہا تھا۔۔۔ چلچلاتی دھوپ میں۔۔۔ اناج گاہنے کے لئے چلچلاتی دھوپ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس موسم میں آسمان سے سونے کی بوندیں بھی برسیں تو کسان انہیں قبول کرنے سے انکار کر دے۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۵

○

ابھی پورا کھلیان گاہا نہیں جا سکا تھا کہ میری چھٹیاں ختم ہو گئیں!

اس ایک مہینے میں میرا اور کتاب کا واسطہ ختم ہو چکا تھا۔ چھٹیوں کی آخری شام کو مجھے کتاب کا خیال آیا تو میرا جی بیٹھ گیا۔ میں گندم کے ڈھیر پر ترنگل ہاتھ میں پکڑے مغرب کی جانب پھولی ہوئی شفق پر نظریں جما کر چپ چاپ کھڑا تھا کہ میرے باپ نے پوچھا۔۔۔

"ماجے! کیا بات ہے؟"

"کل سے سکول لگ رہا ہے اور میں نے ایک مہینے سے کتاب کی شکل نہیں دیکھی۔"

"پھر کیا ہوا؟ میں سوچ رہا تھا کہ اب تم پانچویں جماعت پڑھ چکے ہو اور پڑھنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟"

"بابا! میں پڑھوں گا۔"

"تُو پڑھے گا تو میرا ہاتھ کون بٹائے گا؟"

"میں نہ پڑھا تو سُکّی مجھ سے آگے نکل جائے گا۔"

"سُکّی کا اور تیرا کیا مقابلہ ماجے؟"

"میں اس سے پڑھائی میں اچھا ہوں۔"

"وہ بیس پچیس کھیتوں کا مالک ہے۔ تو ایک مہینے تک کڑکڑاتی دھوپ میں جلتا رہا اور لُو کے تھپیڑے سہتا رہا اور وہ گھر میں چھت کے سائے تلے بیٹھا رہا۔"

"میں پڑھوں گا بابا!"

"نہیں ماجے! نہیں۔۔۔ اب سُکّی اکیلا بھی سکول جا سکتا ہے۔ چوہدری کو تیری ضرورت نہیں رہی۔ میں تو نالے کے کنارے کے تین کھیتوں کے لئے پانچ سال سے تیری

لداو کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ ایک کسان کو کتاب سے کیا واسطہ؟ تم پڑھ لکھ گئے تو چوہدری تمہیں کون سا پٹواری لگا دے گا۔"

"اس نے وعدہ تو کیا تھا۔"

"وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا۔ میں چوہدری کی رگ رگ کو جانتا ہوں ماہنے! وہ اپنے شریک کو پٹواری کیوں بننے دے گا۔ تیری روزی کتاب میں نہیں ماہنے! اس مٹی میں ہے جس سے تیرے باپ دادا اپنی روٹی کا بندوبست کرتے رہے۔ چل کام شروع کر دے۔"

میں نے ترنگل کو اٹھانا چاہا تو وہ لوہے کی لاٹ بن گیا۔ کیا میرے بازو شل ہو گئے ہیں؟ نہیں—— پھر کیا ہوا؟ میں نہیں جانتا۔ بابا نتھو نے سچ کہا تھا۔ سر بڑا کائیاں ہوتا ہے میرا سر مجھ سے باغی ہو گیا تھا۔

"بابا! میں تھک چکا ہوں۔"

"گھر چلے جاؤ ماہنے!"

"میں گھر نہیں جاؤں گا بابا! وہاں میری کتاب ہے۔ میں اسے کون سا منہ دکھاؤں گا۔" میری آواز بھرا گئی۔ بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ میرا انگ انگ رو پڑا۔ میں نے اپنے سر کو پہلی بار روتے ہوئے دیکھا تو حیران ہو گیا۔ سر چپکے چپکے روتا رہا اور میری آنکھیں خشک رہیں۔ میرے باپ نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ میرے کندھوں کو سہلایا۔ میرا سر اپنی چھاتی سے لگایا پر میرے بدن کے آنسو میری آنکھوں سے پھر بھی نہ پھوٹ سکے۔

میں گھر چلا آیا۔ میں نے روٹی کھائی۔ میں نے کہا "اماں! بابا کے لئے روٹی تم لے جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے۔" تھکن اور ہوا کی ٹھنڈک نے مجھے لوریاں دیں اور میں سو گیا۔ گرمیوں کی رات نیند کے جھونکے کی طرح سن سے گزر گئی۔ صبح صادق کی قاصد چڑیا چہچہائی تو میں کنویں کی طرف چل پڑا۔ میں نے کتاب سے ہمیشہ ہمیشہ کی جدائی کی معافی بھی نہ مانگی۔ تھکے ہوئے جسم کی نیند اتنی گہری تھی کہ رات کو کتاب مجھے خواب میں بھی نظر نہ آئی۔ گاؤں سے باہر آ کر میں اُس موڑ پر رکا ضرور جس سے ایک راستہ میرے سکول کی طرف پھوٹتا تھا لیکن میں نے من من بھر کے قدم کنویں کی طرف بڑھا لئے۔ میں سیدپور کا رُخ نہ کر سکا حالانکہ سیدپور کے رُخ پر نیلے پہاڑوں کی سفید چوٹیوں کو آگ لگ گئی تھی۔

میں جب کنویں پر پہنچا تو "کاوے" کتائی کرنے کے لئے ابھی نہیں آئے تھے۔ میرا

باپ کھُرلیوں میں کُترا ہوا چارہ ڈال رہا تھا۔

اس نے پوچھا "مدرسے نہیں گئے ماہنے؟"

میں اس کے سوال پر حیران ہوا تو اس کے ہونٹوں پر بڑی راز بھری مسکراہٹ تھرکنے لگی۔ تب ایک ہاتھ نے محبت سے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ میں چونک کر مڑا تو بھا نے کہا

"ماہنے تم کتنے بڑے ہو گئے ہو؟"

"بھا! تم آ گئے؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں! ہاں! میں آ گیا ہوں ماہنے!" بھا کی آواز میں بھی تھرتھراہٹ تھی۔

اس تھرتھراہٹ نے میرے دل پر دستک دی تو میرا سارا تن بدن آنکھ بن گیا جس سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ بہے۔

"رو کیوں رہے ہو ماہنے؟" بھا نے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بھا نے اپنے صافے سے میرے آنسو پونچھے اور کہا۔

"میں نگر نگر پھرا۔ مجھے اکو کی تلاش تھی حالانکہ میں اسے بیاس کے کنارے اپنے ہی لہو میں تڑپتا ہوا چھوڑ آیا تھا۔ مجھے اکو کی تلاش میں پھر تیرے گاؤں آنا پڑا ماہنے!"

"گاؤں لوٹ جا ماہنے! اور بستہ لے کر مدرسے چلا جا۔" میرے باپ نے کہا۔

"مدرسے سے لوٹو گے تو پھر ملیں گے۔" بھا بولا۔

ایک مہینے کے بعد کتاب کے ساتھ میرا ٹوٹا ہوا ناطہ جڑا تو میں دنیا جہان کو بھول گیا۔ میں کتاب میں بس گیا اور کتاب میرے انگ انگ میں خوشبو کی طرح رچ گئی۔ گرمیوں کا لمبا دن مدرسے آنے جانے میں گزر جاتا۔ میں اور سُکی صبح صبح گھر سے نکلتے اور کہیں شام پڑے گھر لوٹتے۔ ہم دوپہر سیدپور ہی میں گزار لیتے۔ وہیں سکول سے ملا ہوا کام کر لیتے۔ اس دوران میں ہم ایک دوسرے کے دوست بن جاتے پر گاؤں واپس آ کر ہماری دوستی ٹوٹ جاتی۔ چھٹی کے دن میں کنویں پر رہتا اور سُکی گاؤں میں۔ بھا سے پوری ملاقات بھی چھٹی کے دن ہوتی۔ میں شیماں کے آنگن میں بھی نہ جاتا۔

ایک دن جب ہم مدرسے سے واپس آ رہے تھے، سُکی نے کہا "ماہنے یہ مستری شیماں کے گھر کیوں گھسا رہتا ہے۔ جب بھی چکی بند ہوتی ہے، وہ اس کے آنگن میں آ جاتا ہے۔"

"میں تو کبھی شیماں کے ہاں نہیں گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"اب تو میں کبھی کبھار شیماں کے ہاں جاتا ہوں تو مستری مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہے' حالانکہ وہ ہمارا نوکر ہے۔"

"تم شیماں کے ہاں جاتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"تم نے خود ہی تو کہا ہے۔"

"جاتا ہوں ماہنے! جاتا ہوں۔"

"کیوں جاتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں جاتا ہوں؟ اس سے کھیلنے کے لئے۔"

"تم ریٹھے کھیلتے ہو؟"

"نہیں ——— بلور کی گولیاں ——— دیکھو تو سہی۔"

اس نے قمیص کی جیب سے چند بلوری گولیاں نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیں۔ سفید' نیلی اور سرخ گولیاں ——— ڈوبتے سورج کی کرنوں سے انہیں آگ سی لگ گئی تو میری ہتھیلی جلنے لگی۔

"یہ تم نے کہاں سے لیں؟"

"ابا شہر گئے تھے تو لائے تھے۔"

"بڑی خوبصورت ہیں۔ اس اتوار کو میں بھی کھیلنے آؤں؟"

"گولیاں کہاں سے لاؤ گے؟" اس کے لہجے میں غرور تھا۔

"تم سے مانگ لوں گا۔ دو گولیاں تو مجھے دے دو گے نا سلی؟" میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"نہیں ——— لاؤ میری گولیاں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

میں نے گولیاں اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر انڈیل دیں۔

"ماہنے! شیماں نے پہلی بار ان گولیوں کو دیکھا تھا' تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اب تم ریٹھے کی گولیاں لے کر اس کے آنگن میں گئے تو وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔"

"میں نہیں آؤں گا۔"

"نہیں آؤ گے؟ سچ ———"

"ہاں! میں نہیں آؤں گا۔"

وسّلی زیرِ لب ہنسا تو میں اُداس ہو گیا جیسے میں نے اپنی ہار مان لی ہو۔ وسّلی کتنا کمینہ تھا! اس نے بن جیتے میری ہار کو میرے منہ سے منوا لیا تھا۔ میرے اور شیماں کے درمیان کانچ کی رنگ برنگی گولیاں لا کر اس نے مجھے جیسے اُس سے الگ کر دیا ہو۔ نہیں ——— میں ہار نہیں مانوں گا۔

"ماہنے! میں ابا سے مستری کی شکایت کروں گا۔"

"کیوں؟"

"وہ شیماں کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھتا ہے۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"مستری شیماں کے ہاں نہیں آیا کرے گا۔"

"شیماں اپنے آنگن کی آپ مالک ہے۔ تم کون ہو اُسے روکنے والے؟"

وسّلی نے چند لمحوں تک مجھے غصّہ بھری آنکھوں سے گھورا۔

پھر کہا "تم مستری کے حمایتی ہو؟"

"نہیں تو۔"

"وہ لچا لفنگا ہے۔ وہ شہر سے آیا ہے۔ وہ نہ ہو تو ہماری چکّی نہیں چل سکتی۔ نہیں تو میں اسے کب کا گاؤں سے نکلوا چکا ہوتا۔"

"اس لئے کہ تمہارے سوا شیماں کے آنگن میں اور کوئی نہ جائے۔"

"ہاں! ہاں!"

"میں اس اتوار کو ضرور آؤں گا۔"

"شیماں تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔"

"میں آؤں گا' سلی۔"

وسّلی کو بڑا غصّہ آیا۔

اُس نے کہا "تو آئے گا؟ وہ تیری ماں کی کیا لگتی ہے؟"

"کچھ بھی نہیں پر وہ تیری ماں کی وجہ ضرور بچی ہو گی۔"

اس نے زور سے میرے منہ پر چانٹا لگایا تو میں ہنسا گیا۔ تب میں نے بستہ زمین پر پھینک دیا اور سنی کو اٹھا کر نیچے دے پٹکا اور گھونسوں میں دبا لیا۔ وہ مجھے گالیاں دیتا رہا اور میں اسے تھپڑ، تھپڑ مارتا رہا۔ وہ رونے لگا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میں بستہ اٹھا کر گاؤں کی طرف چلنے لگا تو اس نے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا کر میری پیٹھ پر دے مارا۔ میں نے پرواہ نہ کی۔ جب میں گھر پہنچا تو میرا باپ آ چکا تھا۔ آنگن میں دیئے کی ٹمٹماہٹ تھی۔ ماں نے پوچھا۔

"آج سے کیوں آئے ہو بیٹے؟"

"یونہی ماں، کوئی خاص بات نہ تھی۔"

میں نے بستہ اتار رکھا اور آنگن میں بچھے کھٹولے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت میرا باپ بھی رات کا کھانا کھانے کے لئے گھر آ گیا۔ وہ مری کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ ماں نے کھانا اس کے سامنے رکھا۔ اس نے ابھی دو چار لقمے ہی لئے تھے کہ سفید پوش نے آنگن میں داخل ہوتے ہی پوچھا "سورج دین گھر میں ہے؟"

میرے باپ نے کہا "ہاں ہاں! چوہدری! میں گھر ہوں۔ آؤ کھانا کھاؤ۔"

"نہیں ---- بیٹا کہاں ہے؟"

"میں بھی یہیں ہوں۔"

"تم نے آج سنی کو کیوں پیٹا؟" چوہدری کی آواز میں غصے کی کپکپاہٹ تھی۔

"اس نے مجھے گالی دی تھی۔ پہل اس نے کی۔ اس نے میرے منہ پر چانٹا لگایا۔"

"سورج دین! تیرا لڑکا خراب ہو گیا ہے۔ وہ اپنے سے بڑوں کے منہ آتا ہے۔"

"چوہدری! اس نے تیری شان میں کوئی گستاخی کی؟"

"نہیں۔ اس نے سنی کو مارا!"

"سنی نے بھی مجھے مارا تھا۔" میں نے کہا۔

"چپ رہو!" چوہدری نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"چوہدری! بچے لڑا جھگڑا کرتے ہیں۔ بڑوں کو ان کے ذاتی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہئے۔"

"سورج دین! تو اپنے لڑکے کی حمایت کر رہا ہے۔"

"نہیں تو چوہدری ---- میں اس سے پوچھوں گا۔ جو اس کا قصور نکلے گا تو میں اسے سزا دوں گا۔ پر مجھے پتہ ہے میں اسے قصوروار کیسے ٹھہراؤں ---- چوہدری بیٹھ تو جاؤ۔"

"نہیں ---- کھانے کے نوالے جو میرے تین کھیت ہیں، وہ ----" چوہدری رک گیا۔

"میں نے ان کا پورا پورا ٹھیکہ دیا ہے چوہدری!"

"ان کھیتوں پر میں خود کاشت کروں گا۔"

"بہت اچھا چوہدری!" میرے باپ نے کہا۔

چوہدری ہمارے آنگن سے نکل گیا۔ میرے باپ نے لقمہ منہ رکھنے سے پہلے مجھ سے پوچھا "تو نے سنی کو کیوں مارا بیٹے؟"

"اس نے پہلے مجھے پیٹا۔"

"جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"مجھے نہیں پتہ ---- میں نہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا اور دیئے کی ٹمٹماہٹ میں میرا باپ پتہ لے میرا منہ تکتا رہا۔ وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے دو چار لقمے لئے اور باقی کا کھانا لے کر چلا گیا۔

"بابا! تیری وجہ سے تین کھیت ہمارے ہاتھ سے نکل گئے۔" ماں نے کہا۔

"چوہدری بھی اپنے بیٹے کی طرح بڑا کینہ ہے ماں۔"

"پر اب ہمارا گزارا کیسے ہو گا؟"

"مجھے نہیں پتہ ماں ---- میں نہیں جانتا۔"

دوپہر کو کنویں پر گیا تو بھا سے ملاقات ہوئی۔ میں اس کے ساتھ کام کاج میں لگا رہا جب سہ پہر کو ہم دونوں شغل کا چارا کاٹ رہے تھے تو اس نے پوچھا "تم سنی سے کیوں لڑے تھے بیٹے؟"

"پہل اس نے کی۔"

"بیٹے لڑائی کس بات پر ہوئی؟ مجھے سچ سچ بتا دو۔ میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔"

بھا کی شفقت بھری آواز میرے دل سے ٹکرائی اور وہ سل ٹوٹ گئی جو میرے دل پر پڑی تھی۔ میں نے بھا کو سارا قصہ سنا دیا۔ بھا کھکھلا کر ہنسا اور میں حیران ہو گیا۔ ہم چارا کاٹ کر ٹوکے پر لائے تو وہ کوٹھڑی کے اندر چلا گیا۔ وہ طاق سے کوئی چیز اٹھا کر لے آیا۔ اس نے وہ چیز میری طرف کر کے کہا "ذرا اس طرف دیکھو ماہنے!"

میں نے بھا کی طرف دیکھا اور اُس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ننھے سے آئینے میں مجھے ایک ایسا چہرہ نظر آیا جسے میں نے بہت کم دیکھا تھا۔

بھا نے پوچھا "اسے پہچانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"نہیں۔"

پہچانو تو یہ کون ہے۔"

میں یک دم ہنس پڑا۔ میں نے کہا "یہ میں ہوں بھا!"

"ہاں تم ہی ہو پر کتنے بدل گئے ہو۔ تمہارے اوپر کے ہونٹ پر بھورے بھورے روئیں نکل آئے ہیں۔ تم جوانی کی منزل میں قدم رکھ رہے ہو ماہنے!"

"جوانی!" میں نے سوچا۔

اُس دن میں نے پہلی بار آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ نہیں—— نہیں پہلی بار نہیں—— ماں کے جہیز میں جو رنگین پیڑھا آیا تھا' اس کے بازوؤں پر شیشے کے ننھے ننھے سے چاند لگے تھے۔ یہ پیڑھا کبھی کبھار جھاڑ پھونک کے لئے کوٹھڑی سے باہر نکالا جاتا تھا۔ چاند کے ان ٹکڑوں میں مجھے کبھی کبھار اپنا دھندلا سا عکس نظر آ جایا کرتا تھا۔ پر آج میں نے پہلی بار اپنے آپ کو غور سے دیکھا تھا۔

"بھا تو نے مجھے آئینہ کیوں دکھایا؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ تم اپنے آپ کو دیکھو لو۔"

"اپنے آپ کو کیوں؟"

بھا جواب میں ہنس دیا۔

جب ایک شام سیدپور سے اکیلا آ رہا تھا اور شام کے سائے کٹے ہوئے کھیتوں کے جلے ہوئے ننگے جسموں کی ستر پوشی کر رہے تھے' شفتل کے ایک ہرے بھرے کھیت کی

مینڈھ پر مجھے گوری نظر آئی۔ گوری مینڈھ پر اگی سرسبز گھاس چر رہی تھی۔ اس کی رسی شیماں کے ہاتھ میں تھی اور گوری اب جوان ہو چکی تھی۔

"شیماں!" میں نے پکارا۔

اُس نے منہ پھیر لیا۔ میں نے گوری کے پنڈے پر ہاتھ رکھا' تو وہ "تڑبک" کر دو قدم پرے ہٹ گئی۔ اس نے مینڈھ پر سے منہ اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا اور پھر وہ گھاس چرنے لگی۔ وہ مجھے نہیں پہچان سکی تھی۔

"پر شیماں تو مجھے پہچانتی تھی' اس نے منہ کیوں پھیر لیا؟" میں نے سوچا۔

"شیماں!" میں نے دوسری بار اُسے پکارا۔ وہ منہ پھیرے کھڑی رہی۔ میں نے تیسری بار اُس کا نام پکارا' تو وہ بولی "کیا کہتے ہو ماہنے؟"

"میری طرف دیکھو۔"

"نہیں——"

"کیوں ؟"

"مجھے نہیں پتہ۔"

"شیماں تجھے بلور کی گولیاں بہت پسند ہیں؟"

"بلور کی گولیاں؟" اس نے پہلی بار آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کی۔

"وہی جو سلی کے پاس ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اب تم ریشمے کی گوٹیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گی۔"

"ہاں! ہاں! وہ بڑی خوبصورت گولیاں ہیں۔"

"میں بھی بھا سے کہوں گا۔ وہ شہر سے مجھے بھی بلوری گولیاں لا دے گا۔ تب میں تمہارے آنگن میں کھیلنے آؤں گا۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"بابا نے مجھے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے روک دیا ہے۔"

"تو اب سلی بھی نہیں آئے گا تمہارے آنگن میں؟"

"نہیں آئے گا۔"

"پھر تو اچھا ہوا۔"

"اچھا ہوا؟" شیماں نے مجھ سے پوچھا۔

میں ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ اُس نے گوری کی رسّی کو جھٹکا دیا۔

گوری نے اُس کی طرف بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھا۔

"چلو! گھر چلیں گوری! بابا کو بھوک لگ رہی ہو گی۔ اُسے روٹی پکا کر دوں گی۔"

اور شام کے سُرخ اور سیاہ سایوں کی روشنی میں ہم چُپ چاپ پگڈنڈی پر چلتے رہے حتیٰ کہ گاؤں آ گیا۔ گلی کے ایک موڑ پر وہ اپنے گھر کی طرف مُڑ گئی تو میں اُداس ہو گیا جیسے میں چناب کے اس کنارے پر کھڑا رہ گیا ہوں اور میرے اور اُس کے درمیان دریا کا لہریں لیتا ہوا پاٹ پھیل گیا ہو۔

کچھ باتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ میں جب بھی شیماں سے اِس طرح ملتا' میری حمیداں سے ضرور ملاقات ہو جاتی۔ یوں ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے سبھی لوگ کبھی نہ کبھی ضرور نظر آ جاتے ہیں لیکن فصل کی کٹائی سے لے کر اب تک میں پورے وجود کے ساتھ گاؤں میں نہیں رہ رہا تھا۔ میں صبح سویرے گاؤں سے نکل جاتا اور شام پڑے لوٹتا۔ روزانہ کے اس سفر میں گاؤں مجھے ایک سرائے لگتا جس میں رات بسر ہو جاتی اور گاؤں میں آتے اور گاؤں سے جاتے وقت کچھ لوگوں سے مل بھی لیتا۔ اب جب میں اپنے گاؤں کا قصہ لکھ رہا ہوں' وہ سب چہرے دُھندلائے دُھندلائے نظر آتے ہیں۔ میرے گاؤں کی کہانی میں ان کے سائے تو آ سکتے ہیں۔ نجانے اِن کے بھرپور وجود کی تصویر کیوں نہیں اُبھرتی؟

حمیداں اِن سایوں سے الگ تھلگ نظر آتی ہے۔

شام کے دُھندلکے میں اُس کا سایہ بھی میری کہانی کا روشن نقطہ ہے۔

اُس نے مجھے آواز دی اور ٹھٹک گیا۔ "ماہنے!"

"کیا بات ہے حمیداں؟"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"اسی گاؤں میں ــــ"

"تم نے سلی سے جھگڑا کیوں کیا تھا؟"

"بڑے چوہدری صاحب ایک بار پوچھ گئے تھے۔ اب تمہیں پوچھنے کیا ضرورت تھی؟ تم لوگ ایک چھوٹی سی بات کو بھول نہیں سکتے؟ ہم نے تو کسی سے شکایت نہیں کی؟"

"تمہیں لڑنا نہیں چاہئے تھا ماہنے!"

"ہاں ہاں مجھے چُپ چاپ مار کھا لینی چاہئے تھی نا؟ تم بڑے لوگ جو ہوئے۔"

"اس میں چھوٹے بڑے کا کیا سوال ہے ماہنے؟ اب تو تم بڑی سیانی باتیں کرنے لگے ہو۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔"

میں نے ایک قدم بڑھایا تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک لیا۔

"مجھ سے مت روٹھو ماہنے!"

"میں کسی سے کیوں روٹھنے لگا حمیداں۔"

"پھر مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرو نا ماہنے!"

"میٹھی میٹھی باتیں! کون سی باتیں حمیداں؟"

"اپنی ــــ شیماں کی ــــ اپنے بھا کی۔"

"بھا!" میں نے کہا۔

سایوں کے اندر سائے کے چہرے پر کوئی کرن ضرور پھوٹی ہو گی۔ میں اسے نہ دیکھ سکا۔ پر مجھے بھا سے پیار تھا اور حمیداں کی آواز میں میرے ہی پیار کی گونج مجھے سنائی دی۔ میرا دل نرم پڑ گیا۔

"حمیداں! بھا بہت اچھا ہے۔ وہ نہ آتا تو کتاب سے میرا واسطہ ٹوٹ جاتا۔ کچھ دن ہوئے اس نے اپنے آئینے میں مجھے میرا چہرہ دکھایا۔" میں نے کہا۔

"کس کا چہرہ؟"

"میرا اپنا اور کس کا؟ پر میں نے اپنا چہرہ دیکھا اور میں حیران رہ گیا۔ میں نے جانا یہ کوئی اجنبی ہے۔" میں کھکھلا کر ہنس پڑا۔

"پر میں جب شیشہ دیکھتی ہوں' تو مجھے تو اپنا چہرہ نظر نہیں آتا۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔ آئینے میں تو وہی نظر آتا ہے' جس کا عکس اِس میں پڑتا ہے۔"

"نہیں ماہنے! شیشہ مجھے تو میرا چہرہ نہیں دکھاتا۔"

"پھر تم کس کا چہرہ دیکھتی ہو؟"

"نجانے کس کا؟"

گلی میں کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی تو حیداں چپکے سے شام کے سایوں میں گھل مل گئی۔ اس وقت مجھے ماسی ریشم کی کرخت آواز کا سامنا کرنا پڑا۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ شیماں اور حیداں کے بعد ماسی سے آمنا سامنا ضرور ہو گا۔ یوں آج ماسی مجھے نہ ملتی تو آج کی کہانی اَدھوری رہتی۔

اس نے کہا "ماہنے! آؤ میرے ساتھ۔"

"ماسی مجھے گھر سے دیر ہو رہی ہے۔ ماں کو فکر لگ رہا ہو گا۔"

"ہوں! ماں کے فکر کا اتنا ہی خیال تھا تو کھیت کی مینڈھ پر شیماں سے باتیں کیوں کرتے رہے؟"

"وہ تو—— یونہی—— ماسی! کوئی رستے میں مل جائے تو اُس سے بات بھی نہیں کرنی چاہئے۔"

"کیوں نہیں؟—— کرنی چاہئے—— پر جب ماسی ریشم سے آمنا سامنا ہو تو بہانہ کر کے بھاگ جانا چاہئے نا۔"

"اچھا ماسی! جہاں چاہے، لے چلو۔"

ماسی ریشم کے آنگن میں دیا جل رہا تھا۔ لیکن دیئے کی مدھم روشنی میں اس کے چہرے کا کوئی نقش صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

"میرے قدموں کی چاپ سُن کر جو سایہ کھسک گیا تھا وہ حیداں تھی نا؟"

"ماسی تجھ سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ پتہ نہیں تیری کتنی آنکھیں ہیں؟"

"وہ اس مہاجر لڑکے کا پوچھ رہی تھی نا جو تمہارے کنوئیں پر رہتا ہے؟"

"ہاں!"

"گاؤں کے سب سے بڑے چوہدری کی بیٹی ایک مہاجر لڑکے کی بابت کیوں پوچھتی تھی ماہنے؟"

"ماسی مجھے کیا پتہ؟"

"وہ کیا کہہ رہی تھی ماہنے؟"

"وہ کہہ رہی تھی جب میں شیشہ دیکھتی ہوں تو اس میں مجھے اپنا منہ نظر نہیں آتا۔"

"وہ شیشے میں کس کا چہرہ دیکھتی ہے ماہنے!"

"میں اُس سے یہی پوچھ رہا تھا کہ تیرے قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ چلی گئی۔" میں نے چڑی ہوئی آواز میں کہا۔

"اُس مہاجر لڑکے کو خبردار کر دینا ماہنے! شیشے میں کسی اور کا چہرہ دکھائی دے تو۔"

"ریشو! کون ہے یہ؟" اندھیرے کونے میں بچھی ہوئی کھٹیا سے ایک پوپلی کانپتی ہوئی آواز آئی۔

"یہ اپنا ماہنا ہے چاچی!"

"ماہنا کون؟"

"اپنا ماہنا اور کون؟" ماسی ریشم نے جھلا کر کہا۔

"یہ تیرا نیا یار کون ہے ریشو؟" کانپتی ہوئی آواز نے پوچھا۔

"چپ رہ ڈائن—— میں نے تو یار اس وقت بھی نہیں پکڑا تھا جب تیرا بیٹا ریشم کے پھندے کو توڑ کر کورے کھدر کے جال میں پھنس گیا تھا۔"

"اِدھر آ مجھے روٹی دے کالی جیبھ والی! نجانے سارا دن کہاں کہاں منہ کالا کرتی پھرتی ہے۔"

"تیرے پیٹ کا دوزخ بھرنے کو محنت مزدوری کرتی ہوں—— اور کہاں پھرتی ہوں؟ اس مرن جوگے کو گالیاں کیوں نہیں دیتی ہو جو تجھے چھوڑ کر اپنا منہ کالا کر گیا۔ کبھی تیری خبر بھی نہیں لی اُس نے۔"

اندھیرے کمرے کی کھٹیا سے پھوں پھوں رونے کی آواز آئی تو میں آنگن سے چپکے سے کھسک گیا۔ ماسی ریشو کی اس اندھی ساس کو میں بچپن سے اس کھٹیا پر بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے پوپلے منہ اور ہر دم پھرتی ہوئی بے نُور آنکھوں سے ڈر لگتا تھا۔ آج اس کے کوسنے سُن کر میرا جی بیٹھ گیا۔ میں اس لمحے مجھے ماسی ریشم کے اَدھورے سندیسے کا خیال آیا جو وہ میرے بھا تک پہنچانا چاہتی تھی۔ اور میں بڑھیا کو بھول گیا۔

جب میں گھر پہنچا تو آنگن میں حسب معمول دیئے کی ٹمٹماہٹ تھی اور کھاٹ کھٹولوں پر گاؤں کے کچھ چوہدری بیٹھے تھے۔ حقے کا دور چل رہا تھا۔ مجھ سے کسی نے دیر

سے آنے کی وجہ نہ پوچھی۔ کسانوں کو بھی کمہار گھر کے آنگن میں بیٹھنے کا موقع ملتا ہے آج ضرور کسی خاص معاملے پر بات چیت ہو رہی تھی جو اتنے لوگ اکٹھے تھے۔ "چودھری صاحب! رات بہت چھوٹی ہے اور معاملہ لمبا ہے۔ بس دو ٹوک بات کرو۔" چودھری رحمت علی نے کہا۔ یہ ہماری برادری کا سرکردہ آدمی تھا۔ بڑے چودھری کے بعد اس کا نمبر آتا تھا

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۶

○

برج لال کھتری کے چلے جانے کے بعد ہم گاؤں والے عرصے سے دکان سے محروم تھے۔ میں کوئی بہت دُور کی بات نہیں کرتا لیکن اس زمانے میں بھی کسانوں کے ہاتھ میں پیسہ کم ہی آتا تھا۔ ہم اکثر جنس کے بدلے سودا لیا کرتے تھے۔ برج لال کے ہاں سے ہمیں چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرنی پڑتی تھیں۔ نون تیل، سوئی سلائی، گُڑ صابن اور اس قسم کی دوسری چیزیں ہمیں جنس کے بدلے اس کی دکان سے مل جاتی تھیں۔ اب دکان کے نہ ہونے سے ہمیں تکلیف تھی۔ ہمیں ان کے لئے دوسرے دیہات میں جانا پڑتا تھا۔ چودھری نے برج لال کی دکان اور مکان پر تالا لگا رکھا تھا۔ برج لال کی دکان اور مکان بکے تھے اور چودھری کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ یہ اس کے قبضے سے نکل جائیں۔

اور کل رات ہمارے آنگن میں جو اکٹھ ہوا تھا اس میں اسی بات پر مشورے ہوئے تھے۔ میں تو تھکا ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد آنگن کے اندھیروں میں ٹھنڈک رہی تو میں لوگوں سے دُور ایک کونے میں کھاٹ بچھا کر سو گیا۔ مجھے اس بحث سے کوئی دلچسپی بھی نہ تھی۔ یوں بھی چھوٹوں کو بڑوں کی بات میں دخل نہیں دینا چاہئے۔

لیکن جب مجھے پتا چلا کہ لوگوں نے چودھری کے ہاں جا کر دو ٹوک فیصلہ کرنے کی ٹھان لی ہے اور یہ بھی کہ وہ دکان اور مکان بھا اسلم کو دلوانا چاہتے ہیں تو مجھے خوشی ہوئی۔ مجھے بھا سے ملنے کے لئے کنویں پر جانا پڑتا تھا اور اس سے ملنے کی پیاس ہر وقت جی میں رہتی تھی۔ اب دکان پر بھا سے روز ملاقات ہو گی اور جی بھر کر اس سے باتیں کرنے کا موقع ملے گا اور خیال ہی خیال میں برج لال کی گدی پر بھا کو بیٹھے دیکھ کر مجھے تھوڑی سی ہنسی بھی آئی۔ برج لال دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ سارے بدن میں اس کے پیٹ کی ذرا سی پکی نمایاں تھی یا بڑی بڑی سفید مونچھیں جو ہونٹوں پر بڑی عاجزی سے لگی رہتیں۔ اس کے ارد گرد

چیزوں' ڈبوں اور بوتلوں کا ڈھیر ہو گا۔ جو چیز مانگو' وہ ہاتھ بڑھا کر اسے کسی ڈبے یا بوتل سے نکال لیتا۔ گاؤں کے اکثر کسان اس کے مقروض رہتے تھے۔ سال میں دو بار ساونی اور ہاڑی کی فصلیں اٹھنے پر اس کو جنس دے دیتے۔ وہ چھکڑے پر لاد کر جنس شہر میں بیچ آیا کرتا تھا۔

بھا اسلم کے دکان چلانے اور کسانوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے خیال ہی سے مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ برج لال کی گدی پر بیٹھنے سے پہلے کیا بھا کی توند بڑھ جائے گی اور نخی نخی مونچھوں کی نوکیں اوپر کو اٹھنے کی بجائے نیچے کو لٹک آئیں گی؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہوا تو بھا ــــ بھا نہیں رہے گا۔

میں اس دن سکول سے ذرا جلد لوٹ آیا اور کنویں پر جا کر بھا سے ملا۔ میں اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ بھا مجھے پہلے حیران ہو کر تکتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا "ماہنے! آج بڑے خوش ہو؟"

"بھا تو لالہ برج لال کی گدی پر بیٹھے گا نا؟"

"کون لالہ برج لال ؟"

"میں نے ایک بار پہلے بھی تمہیں بتایا تھا' وہ ہمارے گاؤں کا دکاندار تھا۔"

بھا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس نے ذرا دیر بعد سنجیدہ ہو کر کہا "ماہنے! مجھ سے برج لال نہیں بنا جائے گا۔ میں اس کی گدی پر نہیں بیٹھوں گا۔"

"پر لوگ تو یہی چاہتے ہیں۔"

"لوگ سو بار چاہتے رہیں۔ میں اپنی مرضی کا آپ کا مالک ہوں۔"

"میرا جی بھی تو یہی چاہتا ہے۔"

"کیوں ماہنے؟"

"تم گاؤں میں رہو گے تو میں صبح شام تمہارے پاس بیٹھ سکوں گا۔"

"نہیں ماہنے! اس طرح میں اسی گاؤں کا ہو کر رہ جاؤں گا۔ میں تو پنکھ پکھیرو ہوں۔ میرا ایک جگہ جی نہیں لگ سکتا۔"

"نہیں بھا۔ گاؤں والوں کی بات ضرور مان لینا۔"

"ضد نہ کر' ماہنے! میں گاؤں میں ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا۔ خدا جانے کب جی اچاٹ ہو جائے اور میں منہ اٹھا کر کسی طرف نکل جاؤں۔"

"بھا تم نے مجھے بتایا نہیں' پچھلی بار تم کہاں کہاں پھرتے رہے ؟"

"میں تو باولا آدمی ہوں ماہنے! میں تجھے کیا بتاؤں' میں کہاں کہاں پھرتا رہا۔"

میری ضد پر بھا نے بتایا کہ وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں گیا۔ جہاں جہاں اسے اپنی طرف کے آدمی ملے' وہ ان سے ملا لیکن اسے اپنے ماں باپ کا پتا نہ چل سکا۔ کچھ لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہیں۔ "میں اب لائل پور کے ضلعے میں جاؤں گا۔ میرے گاؤں کے کچھ لوگ وہاں بھی آباد ہو گئے ہیں۔"

گاؤں کی پنچایت نے بھا کی بڑی منت سماجت کی پر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ سارے گاؤں میں وہی ایک مہاجر تھا اور چوہدری کے قبضے سے برج لال کی دکان اور مکان صرف اسی صورت میں نکل سکتے تھے کہ بھا گاؤں والوں کی بات مان لے۔ اس کشمکش میں برسات شروع ہو گئی۔ ساونی کی فصل کی بوائی ہو رہی تھی کہ بھا نے میرے باپ سے پوچھا "چاچا! نالے کے کنارے جو کھیت ہیں ان کی بوائی نہیں ہو گی۔"

"نہیں اسلم۔"

"کیوں ؟"

"وہ کھیت چوہدری کے تھے۔ اُس نے مجھ سے واپس لے لئے ہیں۔"

"کیوں لئے ہیں چاچا ؟"

"بات کچھ بھی نہیں تھی ــــ ماہنے سے پوچھ لو ــــ"

میں نے سارا قصہ سنایا تو بھا کی آنکھوں میں غصہ لہرایا۔

اس نے کہا "چاچا! ان تین کھیتوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد کنویں پر کون سا زیادہ کام باقی رہ گیا ہے۔ میں دکانداری کیوں نہ کر لوں؟"

تب ایک دن گاؤں کے کسانوں کا ایک وفد بھا کو ساتھ لے کر چوہدری کی حویلی میں پہنچا۔ چوہدری کے کان میں سارے معاملے کی بھنک پڑ چکی تھی۔ وہ کیل کانٹے سے لیس گاؤں والوں سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔ اس نے مونچھوں کو ایک دو بل اور دے لئے تھے اور اس کی جھوٹی مسکراہٹوں کے پردے میں غصہ صاف جھلکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے سب کو خوش آمدید کہی اور حویلی میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ جانے کو کہا۔ چوہدری کا نوکر دو حقے بھر لایا۔ حقے کا دور چلا تو چوہدری نے بھا کی طرف دیکھ کر کہا "جوان! تمہیں اس

گاؤں میں آ کر کیا ملا تو اپنے حق حقوق بھی نہ لے سکا۔ پیچھے تیری زمین تھی؟"

"تھی تو چوہدری! پر وہ میری نہیں تھی' میرے باپ کی تھی۔"

"تیرا باپ کہاں ہے؟"

"ابھی تک مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا چوہدری۔"

"تم نے اس کی تلاش کی؟"

"ہاں چوہدری۔۔۔"

چوہدری نے میرے باپ کی طرف بڑی گہری گہری مسکراہٹ کے ساتھ تک کر کہا۔ "چوہدری موج دین! تو نے اس جوان کو اپنے کھونٹے سے کیوں باندھ لیا ہے؟ اس گاؤں میں اسے کیا ملے گا! خواہ مخواہ بیچارہ اپنے حق حقوق سے جاتا رہے گا۔"

میرا باپ کچھ جواب دینے والا تھا کہ بھانے کہا "چوہدری! اس کے کھونٹے سے میں اپنے آپ بندھ گیا ہوں' ورنہ منہ زور بیل تو رسا توڑ ہی لیتے ہیں اور کھونٹا بھی اکھڑ جاتا ہے میرے گلے میں تو پیار کا ریشمی دھاگا ہے۔ میں اسے نہیں توڑ سکتا۔"

"تم اس گاؤں میں پہلے اجنبی ہو۔ میں نے جب تمہارے آنے کی خبر پہلی بار سنی تو میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ کسی اجنبی کے آنے سے یہی ہوتا ہے کہ گاؤں میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔"

"نہیں چوہدری! میں یہاں پھوٹ ڈالنے کے لئے نہیں آیا۔ میرا اس گاؤں میں کون دشمن ہے۔ یہاں تو سب میرے سجن ہیں۔"

"پھر بھی کہو تو میں تمہیں تحصیل میں لے جاؤں۔ کسی گاؤں میں تمہیں کچھ زمین الاٹ کروا دوں تو کیا حرج ہے؟"

"نہیں چوہدری جی! شکریہ۔ مجھے دو روٹیاں مل جاتی ہیں۔ ان سے زیادہ کی مجھے ہوس نہیں۔"

"چوہدری!" ایک بوڑھے کسان نے بات کا رخ بدلنے کے لئے کہا "ہم بھی تو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

"کیا! چوہدری حیات محمد بھی کچھ کہنا چاہتا ہے کہو۔۔۔ شیخ صاحب۔۔۔ کہو۔۔۔"

"بابا حیات محمد نے چوہدری کی طرف مسکرا کر کہا "چوہدری! تیرے ہوتے ہوئے کس کی مجال کہ اپنے آپ کو شیخ کہے پر کبھی کبھار میرے جیسے چھوٹے آدمی کا بھی بات کرنے کو

جی چاہتا ہے۔"

"کہو چوہدری کہو۔"

"گاؤں میں دکان نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے بھی دوسرے گاؤں میں جانا پڑتا ہے۔"

"یہ بات تم آج کہہ رہے ہو؟ تمہیں پہلے خیال کیوں نہ آیا؟"

"میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں پر اتنی بات تو سچ ہے تاکہ گاؤں میں دکان ضرور کھلنی چاہئے۔"

"کھول لو۔ میں روکتا ہوں کیا؟"

"تو لالہ برج لال کی دکان کی چابی ہمیں دے دو۔"

"کیوں؟"

"دکان کھولنے کے لئے۔"

"وہ تو متروکہ جائداد ہے۔ مجھے کیا حق ہے کہ میں اس کی چابی تیرے ہاتھ میں دے دوں۔"

"اس جائداد پر مہاجر کا حق ہے۔"

"یہاں مہاجر کون ہے؟"

"یہ لڑکا جو تیرے سامنے بیٹھا ہے۔"

"اس کے پاس مہاجر ہونے کا کیا ثبوت ہے؟"

"اس سے بڑا ثبوت کیا ہے چوہدری کہ وہ مہاجر ہے۔"

"وہ اپنے منہ سے کہتا تو ہو گا پر میں علاقے کا سفید پوش ہوں۔ میں تو قاعدے قانون پر چلوں گا۔"

چوہدری رحمت خاں ابھی تک نہیں بولا تھا۔ بابا حیات چپ چاپ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ رحمت خاں کچھ دیر سوچتا رہا۔ تب اس نے کہا "چوہدری یہ لڑکا چہرے مہرے سے جھوٹا تو معلوم نہیں ہوتا۔"

"میں سرکار کا نوکر ہوں۔ اس سے کہو سرکار سے لکھوا کر لے آئے۔ میں دکان کی چابی اس کے ہاتھ میں پکڑا دوں گا۔"

"ہم خالی ہاتھ اُٹھ جائیں چوہدری!"

"چوہدریو! سرکاری مال میں میں کیسے خیانت کروں؟ مجھ سے میری کوئی چیز مانگتے تو کوئی بات بھی ہوتی۔ میں تمہیں خالی ہاتھ نہ لوٹاتا۔"

"چلو بھائیو چلیں۔" چوہدری رحمت خاں نے کھاٹ پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ناراض نہ جانا چوہدریو! میں تو برادری کا نوکر ہوں۔ میں نے تمہارے لئے چکی لگوائی ـــــ دیکھو تو گاؤں کو کتنا فائدہ ہے اس سے ـــــ میرے جی میں نجانے کیا کیا کچھ تھا ـــــ تم نے میرا دل توڑ دیا۔"

"چوہدری ہمارا دل بھی تو تُو نے توڑ دیا ہے۔"

"میں تو برج لال کی دکان اور مکان کو گاؤں کا "جنج گھر" بنانا چاہتا تھا۔ گاؤں میں کوئی بارات آتی ہے' تو تمہیں کتنا دکھ اٹھانا پڑتا ہے۔"

"ٹھیک ہے چوہدری! دکان کے نہ ہونے سے بھی تو ہمیں بڑی تکلیف ہے۔"

"میں نے یہ بات بھی سوچ رکھی تھی۔"

"کون سی بات؟"

"چکی تو دوپہر کے بعد چلتی ہے۔ میرا خیال تھا میں وہیں دکان کھول لوں گا۔ مستری باقی وقت میں دکان چلائے گا۔"

"ہمیں یہ منظور نہیں۔"

سب کے منہ سے "نہیں" سن کر چوہدری غصے سے لال پیلا ہو گیا۔

سارے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تو چوہدری نے بھا کو دیکھ کر کہا "جوان! اس گاؤں میں بن ٹھن کر پھرنے کا رواج نہیں۔"

"مجھے بننے ٹھننے کا شوق نہیں چوہدری!"

"تو پنچائت میں نگے سر بیٹھا رہا۔ تو نے انگریزی "بودے" بھی رکھے ہوئے ہیں۔"

"چوہدری اب تو چھوٹے ہتھیاروں پر اُتر آیا ہے۔" میرے باپ نے کہا۔

"سوج ویلا! میں تیرے غصے کی وجہ بھی جانتا ہوں۔ جب سے نالے والے کھیت تیرے ہاتھ سے نکلے ہیں' تو مجھ سے ناراض ہے۔ یہ پنچائت بھی تیرے اُکسانے پر میرے ہاں آئی۔"

"نہیں چوہدری! میں کمینہ نہیں ہوں۔"

"تو کمینہ میں ہوں نا؟" چوہدری نے پوچھا۔

میرے باپ نے چوہدری کی حویلی سے نکلنے کے لئے قدم بڑھایا تھا کہ "سلی بھی تماشا دیکھنے کے لئے دوڑتا ہوا حویلی کے اندر آیا۔

میں نے اُسے دیکھ کر کہا۔ "ابا! سلی نے بھی تو انگریزی "بودے" رکھے ہوئے ہیں۔"

جن لوگوں نے میری بات سنی وہ ہنس پڑے۔ چوہدری کی مونچھیں غصے سے لرز گئیں۔

"ماجے!" چوہدری نے کہا "تم بڑوں کی بات میں کیوں بولتے ہو؟"

"جی نہیں۔ میں نے سلی کی بات کی ہے۔"

"تم دو جماعتیں پڑھ کر بڑوں کے منہ آنے لگے ہو۔ سب غلطی میری ہے۔ میں نے تمہیں ـــــ"

"چلو ماجے! سچی بات ہر ایک کو کڑوی لگتی ہے۔" بھا اسلم نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ میرا باپ ہم سے پہلے حویلی سے نکل چکا تھا۔ باقی لوگ بھی ایک ایک کر کے چلے گئے تھے۔ ہم گلی کے نکڑ پر پہنچے تو مجھے حیداں نظر آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر اس نکڑ پر کھڑی ہو۔ اُس نے بھا کو ایک نظر دیکھا تو وہ ذری بھر کو ٹھٹک سا گیا۔ اُس کا ہاتھ میرے بازو پر اینٹھ سا گیا۔ پھر اس نے قدم بڑھا لیا تو میرے کانوں میں آواز آئی "ماجے!" میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ حیداں اپنی ہی پکار میں کھو کر رہ گئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے حیداں نے مجھے نہیں پکارا تھا کیونکہ اُس آواز نے میرے دل پر دستک نہیں دی تھی۔ تب میں نے بھا کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک ننھی سی مسکراہٹ تھی جیسے راکھ میں کوئی چنگاری لحظہ بھر کو چمکی ہو۔ تب میرا جی چاہا' میں آئینے والی بات بھا سے کہہ دوں۔ میں نے کہا "حیداں کہتی تھی جب میں شیشے میں اپنا منہ دیکھتی ہوں' مجھے اپنا چہرہ نظر نہیں آتا۔"

"وہ کس کا چہرہ دیکھتی ہے ماجے؟" بھا نے پوچھا۔

"نجانے کس کا؟ ماسی ریشو کہتی تھی کہ اس مہاجر لڑکے کو خبردار کر دینا۔ جب شیشے

[illegible]

ہوا سورج پانی میں آگ کے تیر پھینک رہا تھا۔

"میں بھی کنویں پر چلوں گا۔"

"نہیں گھر جا کر پڑھو۔" بھا نے ذرا سختی سے کہا۔ میں نے حیران ہو کر اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالنا چاہی تو اس نے منہ پھیر لیا۔

جب مجھے برسات کی چھٹیاں ہوئیں تو بھا نے میرے باپ سے اجازت لی اور اپنے سفر پر نکل گیا۔ اس بار اس نے کہا تھا "ناپڑا! میں جلدی لوٹ آنے کی کوشش کروں گا۔ اب میری بڑ اس گاؤں کی مٹی میں لگ چکی ہے۔ تم اداس نہ ہونا۔"

برسات کی چھٹیاں کنویں پر ہی گزر گئیں۔ میں کتابیں بھی کنویں پر لے آیا تھا۔ برسات میں گاؤں میں بہت کیچڑ ہوتی ہے اور کمروں میں حبس سے دم گھٹتا ہے۔ کنویں پر ٹھنڈی چھاؤں ہوتی ہے اور ہوا ہلکا سا سانس بھی لے تو بدن کو تازہ دم کر جاتی ہے۔ بادل گھر گھر کر آئیں تو سماں بندھ جاتا ہے۔ بارش برسے تو دُور دُور تک نہاتے، جھومتے درختوں اور کھیتوں کا منظر بہت بھلا لگتا ہے۔ گاؤں میں مکانوں اور گلیوں کی تنگی سے جی گھبراتا ہے اور مینہ برستا ہو تو دُور کا نظارا آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔ کنویں پر جی پھیلتا ہے تو دُور تک کی دُنیا کو، جہاں آسمان اور زمین ملتے ہیں اور دُھلے دُھلے نیلے پہاڑ نظر آتے ہیں، اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ میں اب رات کو بھی اکثر کنویں پر ہی سو رہتا تھا۔ پھر بھی دن میں ایک دو بار گاؤں جانا پڑتا تھا۔

جب سے میری اور مُنّی کی لڑائی ہوئی تھی، میں شیماں کے گھر نہیں گیا تھا۔ کھیت کی مینڈھ پر شیماں سے ملاقات کے بعد مجھے یوں لگا تھا جیسے ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہوں اور اب جب ملاقات ہوگی تو ہم ایک دوسرے کو پہچان نہ سکیں گے۔ بھا کے آئینے میں اپنا چہرہ مجھے اجنبی نظر آیا تھا۔ اُوپر کے ہونٹ پر ہلکے ہلکے رووں کے اُگ آنے سے میں میں نہیں رہا تھا، میرے اندر ایک اور اجنبی جنم لے چکا تھا۔ میں نے حساب لگایا تو اب میں پندرھواں سال پورا کر رہا تھا۔ یہ سال پچھلے سال سے الگ الگ سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے شیماں کے آنگن میں ایک دو بار اس آنے والے سال کی آواز سنی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ میں جوان ہو گیا ہوں پر وہ میری سوچ کی آواز تھی جیسے آنے والی جوانی اس کے دروازے پر دستک دے رہی ہو۔

میں اس سال اپنے آپ کے لئے بھی اجنبی تھا!

میں چھاؤں تلے بچھی کھاٹ پر بیٹھا اکثر اس سوچ میں گم ہو جایا کرتا تھا۔ میرے ننگے پاؤں گیلی زمین پر ہوتے اور میں اپنے ہی وجود کے اجنبی سے ہم کلام ہوتا۔

کبھی کبھار میرا باپ پوچھتا "کیا سوچ رہے ہو ماہنے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"زیادہ سوچا نہ کرو۔ آؤ چارا کاٹ لائیں۔ اُٹھو ماہنے!"

میں پوچھتا "ابا! چوہدری نے اپنے کھیت واپس لے لئے ہیں۔ اب کیا ہو گا؟"

"کیا ہو گا! کچھ بھی نہیں۔ اگلے سال ہاڑی پر کسی سے تین چار کھیت بٹائی پر لے لوں گا۔ اس وقت تک تُو بھی پڑھنے وڑنے سے فارغ ہو جائے گا۔"

میں نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا "اب تو تُو نے بہت پڑھ لکھ لیا ہے۔"

"نہیں تو۔"

"اور پڑھ لکھ کر کیا کرو گے؟"

"پٹواری بنوں گا۔"

"اب تجھے پٹواری کون لگائے گا ماہنے؟ چوہدری سے تو ہمارا بیر ہو چکا ہے۔ میں اُسے جانتا ہوں۔ اس نے جتنا فائدہ تم سے اُٹھانا تھا اُٹھا لیا ہے۔"

"ابا! میں پڑھوں گا بھی اور کام کاج میں تیرا ہاتھ بھی بٹاؤں گا۔"

"اچھا! اچھا! اب چارا کاٹ۔ اس بات کو پھر کبھی سوچیں گے۔" اس نے ذرا سا چڑ کر کہا۔

میں چارا کاٹنے لگا۔ کھیت کی گیلی مٹی میرے ننگے پاؤں سے چمٹ گئی' تو میں نے سوچا "میں نے اسی مٹی سے جنم لیا ہے۔ میں اس سے نجات کیسے حاصل کر سکتا ہوں۔ میں مٹی میں مل کر مٹی بن جاؤں گا۔" تب میں نے گاؤں کے سارے کسانوں کے متعلق سوچا ان میں سے کسی کے دل میں مٹی سے نجات حاصل کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا ہو گا۔ میں ان سے الگ تھلگ کیوں تھا؟ صدیوں سے میرے باپ دادا مٹی کے کیڑے تھے۔ میں ان سے بغاوت کیوں کر رہا تھا؟ جوار کے ہرے بھرے گیلے کھیت میں اکڑوں بیٹھ کر چارا کاٹنے سے

مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں کام سے بچنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا جی مٹی کے پیار سے بھی خالی نہیں تھا۔ مٹی میں خوشبو تھی اور لہراتے ہوئے پودوں میں خوشبو تھی۔ یہ خوشبو میرے وجود میں رچی ہوئی تھی۔ میں مٹی سے رشتہ بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ پھر بھی میں مٹی سے ڈر رہا تھا جیسے مجھے وہ کھا جائے گی۔

جب برسات گزری تو میں پھر سکول جانے لگا۔ سکول میرا دشمن تھا۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ اپنے وجود کے اجنبی سے ابھی میرا جی مانوس نہیں ہوا تھا بلکہ اس سے مجھے کچھ کد سی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے عجیب سی بے نام بے چینی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں اس سے باتیں کرنے سے بچتا پر جب بھی موقع ملتا' وہ دھند کے غبارے سے نکل کر مجھ سے ہم کلام ہو جاتا۔

"ماہنے!"

"میں تم سے نہیں بولنا چاہتا۔"

"شیماں کے آنگن میں کب چلو گے؟"

"کبھی نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔"

"پھر تم اکیلے ہو نا؟ مجھے اپنا دوست بنا لو۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔"

یہ اجنبی کون ہے؟۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔ کون جانتا ہے۔۔۔ میں بھا سے پوچھوں گا۔

جب میں سکول میں ہوتا' وہ غائب رہتا۔ سکول جاتے یا سکول سے آتے' جب کوئی تنہا مقام آتا تو وہ میرے وجود کے خول سے نکل آتا۔ میں پندرہ سال کی عمر میں کتنا اکیلا تھا؟ لیکن اس اجنبی کو میں اپنے اکیلے پن کا ساتھی بھی نہیں بنانا چاہتا تھا۔

میرے چاروں طرف ہریالی تھی۔ برسات گزر چکی تھی۔ تِلی اور کملو اور جوار کے کھیت چپ چاپ کھڑے تھے۔ جو کھیت خالی تھے' ان میں گھاس اُگ آئی تھی۔ دُور دُور تک سبزے کی چادر بچھ گئی تھی اور ان پر سہ پہر کی دھوپ لہریں لے رہی تھی۔ میں گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ میرے پیٹھ پیچھے پہاڑوں کی نیلی دیواریں تھیں۔ میں انہیں دیکھ نہیں رہا تھا پر میں ہر لمحے ان کے وجود سے آگاہ رہتا تھا۔

تب شیشم کے ایک بوڑھے درخت کی چھاؤں میں مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں

چھاؤں تلے بیٹھ گیا۔ میں نے بستے سے کاپی نکالی اور سکول کا کام شروع کر دیا۔ میں اپنے کام میں محو تھا۔ میرا گاؤں قریب تھا بلکہ یہ میرے ہی گاؤں کے کھیت تھے جن میں میں بیٹھا تھا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی تاہم میرا گاؤں میں جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرا خیال تھا میں سیدھا یہاں سے کنویں پر جاؤں گا۔

نجانے کتنا عرصہ اس طرح گزر گیا۔

تب ایک آواز نے مجھے چونکا دیا "ماہنے!"

میں نے آواز کی کپکپی اپنے تن بدن پر لہراتی ہوئی محسوس کی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو بابا نتھو مسکرانے لگا "میں کب سے تمہارے پاس بیٹھا ہوں ماہنے!"

"تم نے تو مجھے ڈرا دیا بابا!"

"ڈر گئے تم؟ کیوں ڈر گئے؟"

"ہر طرف چپ چاپ ہو تو اچانک آواز پر انسان ڈر ہی جاتا ہے۔"

"ماہنے! تمہیں دیکھے اتنا زمانہ بیت گیا ہے۔ تم کہاں رہتے ہو؟"

"اسی گاؤں میں۔۔۔ بابا! میں صبح گاؤں سے نکلتا ہوں او دن ڈھلے لوٹتا ہوں۔"

"تم کبھی کبھار میرے گھر آیا کرتے تھے۔ اب تم نے آنا کیوں چھوڑ دیا ہے؟"

"وقت ہی نہیں ملتا بابا۔ پھر میں بڑا بھی تو ہو گیا ہوں۔"

"بڑے ہو گئے ہو؟ کتنے بڑے؟ مجھے تو تم چھوٹے سے ماہنے لگتے ہو۔" بابا نتھو ہنسا۔۔ لڑکے بالے تو جلدی بڑے نہیں ہوا کرتے۔ لڑکیاں کڑوی بیل کی طرح بڑھتی ہیں۔ اب شیماں ہی کو دیکھو کتنی بڑی ہو گئی ہے۔"

"شیماں تو مجھ سے ایک دو سال چھوٹی ہو گی بابا۔"

"چھوٹی ہی ہو گی تم سے۔ آخر وہ لڑکی ہے۔۔۔ اس مہاجر لڑکے کو دکان مل گئی؟"

"نہیں تو بابا؟"

"میری طرف سے لکھ لو ماہنے! چوہدری دکان ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔"

"کیوں بابا؟"

"وہ مستری کو دکان پر بٹھائے گا۔ چکی تو دوپہر کے بعد چلتی ہے۔ مستری دوپہر تک بے کار رہتا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"مستری نے مجھے بتایا تھا۔"

"وہ تیرے ہاں آتا ہے بابا؟"

"ہاں آتا ہے۔"

"کیوں آتا ہے؟"

"کیوں آتا ہے؟" بابا نے حیران ہو کر پوچھا' بے چارے کا گاؤں میں ہے کون؟ میرے پاس گھڑی دو گھڑی کو آ بیٹھتا ہے تو جی بہل جاتا ہے اس کا۔"

میرے جی میں آیا' میں بابا سے کہہ دوں "اُسے نہ آنے دیا کرو اپنے ہاں۔"

لیکن میں نے زبان پر آئے ہوئے لفظوں کو روک لیا۔۔۔ میں نہیں جانتا کیوں؟

میں نے پوچھا "بابا تیری سیپ چل نکلی ہے؟"

"نہیں تو ماہنے! گاؤں کے لوگ مجھ جیسے بوڑھے کو کام کیوں دیں گے؟ تیرے باپ نے بھی تو مجھے سیپ نہیں دی۔ اور کون دے گا؟"

"میں کہوں اُسے؟"

"نہیں ماہنے! اب میری بوڑھی ہڈیوں میں کام کرنے کی طاقت کہاں ہے؟"

گاؤں کی طرف سے کُگ کُگ کی آواز آئی تو میں نے کہا "چکی بڑی دیر سے چلی آج۔"

"آج چنگیں دیر سے آئی ہوں گی ماہنے! یوں بھی تو گرمیوں میں لوگ دن ڈھلے گھر سے نکلتے ہیں۔"

"چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا رو۔" میں نے کہا۔ بابا چونک گیا۔

میں نے پوچھا "اس کے آگے کیا ہے؟"

"نہ پوچھ ماہنے!"

"کیوں بابا؟"

"تو ابھی چھوٹا ہے۔ ابھی بات نہیں سمجھ سکے گا۔"

"نہیں بابا! بتاؤ نا اس کے آگے کیا ہے؟"

"کیا کرو گے پوچھ کر؟"

"یونہی!" میں نے کہا۔

اور مجھے یوں لگا جیسے زندگی کا چکر اُلٹا گھومنے لگا ہو۔

ہم کبھی کبھار شرارت سے بند کنویں کے چرخ کا ٹکا اتار لیتے تھے اور کنواں الٹا گھومنے لگتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے زندگی کے چرخ کو اُلٹا گھما دیا ہو اور میں کل بہار کے پرائمری سکول میں استاد صاحب کے سامنے کھڑا ہوں اور وہ کہہ رہے ہوں۔ "کون جانے کس وقت چکی چلے اور اس کے پاٹوں میں آ کر کون پسے۔ ابھی تم اس کا جواب جان کر کیا کرو گے؟ تھوڑا بڑے ہو کے پوچھ کر آنا پر ابھی نہیں---- ابھی نہیں----"

اور آج میں نے اُس سے پوچھ لیا تھا اور وہ میرے پاس بیٹھا مجھ سے دُور چلا گیا تو اس کے چہرے پر جھریاں گہری ہو گئی تھیں اور اس کی گدلی گدلی آنکھوں میں ایک غبار سا چھا گیا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں سے دو قطرے ٹپکے اور جھریوں میں رستہ بناتے ہوئے سفید داڑھی میں اٹک گئے اور مجھے اپنی شرارت پر شرم آئی۔ میں نے کنویں کے چرخ کو اُلٹا چلا دیا تھا کیوں؟

"بابا اٹھو۔ چلیں۔"

وہ اٹھا تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں نے بستہ سنبھالا اور اس کی گھاس کی گٹھڑی اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی۔

"ماہنے! گٹھڑی میرے سر پر رکھ دو۔"

"بابا! رہنے بھی دو۔"

"نہیں ماہنے! اپنا بوجھ آپ ہی اٹھانا چاہئے۔"

میں نے چپ چاپ گٹھڑی اس کے سر پر رکھ دی۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر وہ اپنے گھر کی طرف ہو لیا اور میں نے کنویں کا رُخ کر لیا۔

اس سال ہماری ساونی کی فصل اچھی نہ ہوئی۔ ساونی ہی سے کال پڑتا ہے اور ساونی ہی سے سکال! یہ بڑی پرانی کہاوت ہے اور اس میں سچائی بھی ہے۔ میرے باپ کی تین گھماؤں زمین ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کوئی ٹکڑا یہاں تھا' کوئی وہاں۔ کنواں مشترکہ تھا۔ کنویں کے قریب ایک دو ٹکڑوں پر ہم چارا اور کماد کاشت کرتے تھے۔ دور کے ٹکڑوں پر ہم نے اس سال مکی اور باجرہ بویا تھا۔ مکی اور باجرے پر طوطے' کوّے اور چڑیاں حملہ آور ہوتی

ہیں۔ ایک آدمی کے لئے ان کی نگہداشت مشکل تھی۔ مکی اور باجرہ کاٹنے پر ہم نے باڑی کے لئے کھیت تیار کرنے تھے۔ میں باپ کا بہت کم ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ وہ صبح سے شام تک کام میں لگا رہتا۔ وہ مجھ سے کچھ نہ کہتا پر اس کے تھکے تھکے جسم کا دکھ میرے جی میں گھر کر رہا تھا۔ وہ مجھے عجیب اُداس سی نظروں سے دیکھ کر کہتا "ماہنے باڑی کی فصل میں اکیلا کیسے بو سکوں گا؟"

"میں سکول سے چھٹیاں لے لوں گا۔"

"نہیں ماہنے! مکی اور جوار کی فصل کاٹ کر کھیت تیار کرنے میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ پہلے کے تین کھیت ہمارے پاس تھے' تو کام چلتا رہتا تھا' مکی اور جوار کے پکنے تک ان میں دو تین بار ہل چلا لیا کرتا تھا۔ اب تو انہیں ٹکڑوں میں گیہوں کاشت کرنے پڑیں گے۔ دو چار چھٹیاں لینے سے کام نہیں چلے گا۔"

"کیا پتا بھلا آ جائے۔"

"اس کی مرضی ہے آئے نہ آئے۔ ہمارا اس پر کوئی حق بھی تو نہیں بنتا ماہنے!"

میں کچھ دیر سوچتا رہا اور تب میرا گلا رندھ سا گیا۔ نجانے آنسو کہاں سے آتے ہیں؟ آنکھ سے بہہ جائیں تو گلا نہیں رُکتا اور سینے میں آگ نہیں جلتی۔

میں نے دبی دبی آگ کی آنچ محسوس کی تو میں بول اٹھا "بابا کہو تو میں ابھی سے سکول جانا چھوڑ دوں۔"

میں اپنی گھٹی گھٹی آواز کو خود بھی نہ پہچان سکا۔

"نہیں ماہنے! یہ ایک جماعت پوری کر لو۔ پھر دیکھا جائے گا۔ مدرسے سے جلدی آ جایا کرو۔"

میں نے باپ کی طرف بڑی شرمندہ مگر ممنون نظروں سے دیکھا تو وہ مسکرانے لگا۔

تب وہ سال بھی دھیرے دھیرے گزرنے لگا۔ میں سویرے سویرے گھر سے نکلتا' سکول سے واپسی پر کنویں پر آتا اور رات کے اندھیرے میں گھر پہنچتا۔ اس طرح میں گاؤں کی زندگی سے بے خبر رہا اگرچہ گھر آتے جاتے کچھ لوگوں سے ملاقات ہو جاتی۔ گاؤں کی کچھ اڑتی اڑتی خبریں بھی ملتی رہیں۔ سلی اب سائیکل پر سکول آتا جاتا تھا۔ اس کی سائیکل نئی تھی۔ بیہاور کے مڈل سکول کے کسی لڑکے کے پاس سائیکل نہیں تھی حتیٰ کہ ہمارے استاد

صاحبان بھی دُور دُور سے پیدل سکول آتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں رکھے انڈوں والے کے پاس ٹوٹی پھوٹی سائیکل تھی۔ وہ گاؤں گاؤں پھر کر انڈے اکٹھے کرتا تھا۔ اس سائیکل کی چُوں چُوں چرچوں کی آواز دُور ہی سے ہمارے کانوں میں پہنچ جاتی تھی اور ہم اس کو دیکھ کر ایک آواز میں پکار اٹھتے "رکھا پتر ماں دا۔ آنڈا دیوے کال دا۔"

رکھا جواب میں ہمیں گالیاں ضرور دیا کرتا تھا۔ پَر یہ بچپن کی بات تھی۔ اب پندرھویں سال میں پہنچ کر رکھے کی سائیکل میں میرے لئے کوئی نئی بات نہ رہی تھی۔ البتہ سلی کی سائیکل کو دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا خیال آتا جیسے سُلی ہم میں سے نہیں رہا۔ سکول آتے جاتے جب بھی میرے پاس سے گزرتا، سائیکل کی گھنٹی ضرور بجاتا۔ گھنٹی کی آواز سُن کر میں "ٹربک" جاتا تو وہ کھلکھلا کر ہنستا۔ عرصے سے میری اور سُلی کی بات چیت بند تھی۔ پھر بھی میں سلی کو اپنی زندگی کے دائرے ہی میں گردش کرتے دیکھنے کا عادی تھا۔ اب سُلی اس دائرے کو توڑ رہا تھا جیسے میرے پاؤں زمین پر ہوں اور وہ زمین سے اونچا اُٹھ رہا ہو۔

ایک دن گھنٹی بجا کر وہ میرے پاس سے گزر رہا تھا کہ ٹائر میں کانٹا لگا اور شوں شوں ہوا نکل گئی۔ کچھ دُور جا کر وہ سائیکل سے اُتر پڑا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے غصے کی نظر سے دیکھا جیسے پگڈنڈی پر کانٹا میں نے رکھ دیا ہو یا جیسے اُسے آسمان سے اُتر کر زمین پر آنا پڑا ہو۔ وہ کچھ عرصہ سائیکل ہاتھ میں لے کر میرے آگے آگے چلتا رہا۔ ایک جگہ اچانک رُک کر اُس نے میرا نام پکارا۔ میں ذری بھر کو ٹھٹک گیا تو اُس نے کہا۔

"ماہنے! آگے آؤ۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"میری سائیکل کو ہاتھ لگا کر دیکھنا چاہتے ہو؟"

"نہیں تو۔"

"گھنٹی بجا کر سننا چاہتے ہو؟"

"نہیں!"

"ماہنے! ہینڈل میں اپنا چہرہ دیکھو گے؟"

"ہینڈل میں؟"

"ہاں! ہاں! تم اپنے چہرے کو پہچان نہیں سکو گے؟"

"کیا ہو جاتا ہے چہرے کو؟"

"یوں لگتا ہے جیسے مُولی کو ناک اور گاجر کو آنکھیں لگ گئی ہوں۔ بڑا مزہ آتا ہے۔"

"مذاق کرتے ہو سُلّی؟"

"نہیں تو۔۔۔۔ آؤ دیکھو۔"

اس وقت میں اچانک بھُول گیا کہ سُلّی سے میری کُٹی ہے۔ میں آگے بڑھا تو ہینڈل کے شفاف لوہے میں مجھے اپنے چہرے کا عکس نظر آیا۔ لمبوترا چہرہ، ٹیڑھی آنکھیں، بے ہنگم ناک، میں ہنس پڑا۔ ہنستے میں میرے دانت ننگے ہوئے تو مجھے اپنے چہرے سے ڈر لگا جیسے کوئی بھُتنا دانت نکال کر مجھے ڈرا رہا ہو۔ سُلی ہینڈل کو گھماتا رہا اور ہر نئے زاویے پر میرے چہرے کی نئی چھب میرے سامنے آتی رہی۔ پہلے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز کبھی لمبوترا، کبھی گول، کبھی آنکھیں ماتھے پر جا کر لگتیں، کبھی ناک گاجر کی نوک بن جاتی۔ جب میں ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا تو سلی نے کہا ماہنے! آج تو ہوا نکل گئی ہے، کل پرسوں جب موقع ملا تمہیں سائیکل پر بٹھا کر جھوٹا بھی دوں گا۔"

"نہ بھئی! مَیں نہیں بیٹھوں گا شیطانی چرخے پر۔"

"یہ شیطانی چرخہ تو نہیں، سائیکل ہے۔" سُلّی نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کچھ بھی ہو، میں جھوٹا نہیں لوں گا۔"

"نہ لینا۔ کون منت کر رہا ہے تیری۔" اُس نے کہا اور منہ پھُلا لیا۔

ہم دونوں چُپ چاپ چلتے رہے۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر میں اپنے کنویں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر مڑا ہی تھا کہ اُس نے کہا "ماہنے! جانتے ہو، مستری اب شیمل کے ہاں اٹھ آیا ہے۔"

میں نے اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۷

○

اُس سال ہمارے گاؤں میں ملیریا بخار بڑے زوروں سے پھیلا تھا!

گاؤں کا کوئی کوئی فرد ہو گا جو بخار سے بچا ہو۔ مجھے بھی بخار نے خوب جھنجوڑا تھا اور میرے باپ کو بھی لیکن بے چارا بابا نتھو بخار سے اپنی جان نہ بچا سکا۔ اس کے کفن دفن کا انتظام گاؤں کے لوگوں نے مل جل کر کیا۔ جنازے میں بہت سے لوگ شریک ہوئے۔ جب ہم اسے قبر میں اُتار کر قبرستان سے واپس گھروں کو آئے تو ہم سب اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اس وقت میں نے سوچا "اب شیماں کا کیا بنے گا؟"

میں نے یہ بات اپنے باپ سے کی تو وہ حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔ حیران اس بات پر کہ یہ چھوٹی سی بات کسی اور کے ذہن میں کیوں نہ آئی اور گاؤں والوں کی سوچ کفن دفن سے آگے کیوں نہ بڑھی اور پریشان اس بات سے کہ سب سے پہلے یہ خیال میرے ذہن میں کیوں آیا؟ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میرا باپ اس سوچ پر مجھ سے ناراض ہے۔

اس نے کہا "ماجے! تو نے یہ بات کر کے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"کیوں بابا؟"

"اس معاملے پر سوچنے کو تُو ہی رہ گیا تھا؟"

"مَیں ہی ـــ کیوں؟"

"ماجے! گاؤں میں اور بھی تو بہت سے لوگ ہیں۔ سب جنازے سے لوٹ کر اپنے کام کاج میں لگ چکے ہیں۔ کسی کو بچاری یتیم لڑکی کا خیال نہ آیا۔ تو نے یہ بات بتا کر مجھے دُکھ میں ڈال دیا۔ اپنی ذات برادری کی ہوتی تو میں اُسے اپنے گھر لے آتا۔ اچھا! اب میں چوہدری کے ہاں جاتا ہوں۔ تو کنوئیں پر چل۔"

میں کنوئیں پر چلا گیا۔ میں نے چارہ کاٹا، کترا اور مویشیوں کے آگے ڈال دیا۔ رات

گئے وہ لوٹا تو اُس نے بتایا کہ شیماں کو گاؤں کے دوسرے بڑھئی کے ہاں بھیج دیا گیا ہے۔ چوہدری نے کہا تھا۔ "شیماں اِس گاؤں کی یتیم بچی ہے۔ وہ گاؤں ہی میں رہے گی۔"

"بابا! اِس کی ماں بھی تو زندہ ہے۔ وہ اسے آ کر لے جائے تو ـــ"

"تُو اتنا دانا نہ بن ماجے!" میرے باپ نے کہا۔

میں نے سوچا "جو شیماں کی ماں اُسے آ کر لے جائے تو کیا ہو گا؟" میری سوچ نے شیماں کے آنگن کو سائیں سائیں کرتے دیکھا، تو اس کا چہرہ اتر گیا۔ شیماں سے ملے مجھے ایک عرصہ ہو گیا تھا پھر بھی شیماں کے بغیر گاؤں کا تصور مجھے سونا سونا سا لگا۔

تب دوسرے دن صبح سکول جاتے ہوئے میں شیماں کے گھر کی طرف سے ہو کر گزرا۔ شیماں کا آنگن خالی تھا اور بکائن کے سوگوار درخت پر چڑیاں حسب دستور چوں چوں کر رہی تھیں۔ مجھے بابا نتھو کا خیال آیا اور اس کی باتیں یاد آئیں۔ پھر شیماں کے ساتھ کھیل کود کے لمحے زندہ ہوئے اور میں غم میں ڈوب گیا۔ میری آنکھیں بھر آئیں اور گلا رکنے لگا۔ میں نے قدم بڑھا لیا۔ اس لمحے میرا بچپن شیماں کے آنگن میں دفن ہو گیا۔

اب میں اپنے بچپن کا سوگوار تھا۔ بھا اسلم یہاں ہوتا تو مجھے اس کی موت کا پُرسا ضرور دیتا۔ یکایک میری سوچ تلوار کی تیکھی دھار بن گئی۔ "شیماں میری ذات برادری کی نہیں ہے۔ عمر کے اِس موڑ پر میں اب اُس سے ملا بھی تو کوئی بات نہ کر سکوں گا۔" اس سے زیادہ میں کچھ نہ سوچ سکا۔

"ایک دو بار ہم گلی میں اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کے پاس سے گزر گئے اور تلوار کی نوک میرے دل میں چبھ جاتی رہی۔ میں یہ بھی نہ کہہ سکا کہ شیماں مجھے بابا نتھو کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔ میں نے کسی کھیت کی مینڈھ پر گوری کو چرتے ہوئے بھی دیکھا اور میرا جی چاہا کہ اس کے پنڈے پر ہاتھ رکھ کر شیماں سے ایک دو باتیں کر لوں، پر میں ایسا نہ کر سکا۔

سردیاں آئیں اور گزر گئیں۔ میرا امتحان ہوا اور میں پاس ہو گیا۔ میں نے کتابیں بستے میں لپیٹ کر ایک طاقچے میں پھینک دیں اور ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ لیا۔ مجھے کتاب سے جدائی کا اب اتنا دکھ بھی نہ ہوا تھا۔ میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ دھرتی کی باس میں بڑی کشش ہے۔ دھرتی بھی تو کتاب ہے۔ ہل کے پھالے سے اس پر ٹیڑھی

ٹیڑھی سطریں لکھی جاتی ہیں۔ انہیں پڑھنے کے لئے نظر چاہئے۔ مٹی خود سوچنے پر اکساتی ہے۔ مٹی نرم اور نم ہوتی ہے تو دانہ اُگ آتا ہے' اکھوا پھوٹتا ہے اور مٹی اور پانی کے ملاپ سے کونپل پروان چڑھ کر پودا بنتی ہے اور پودا لہلہاتا ہے۔ پودے میں بالی لگتی ہے تو ایک دانہ سو سو دانوں کے روپ میں جنم لیتا ہے۔ پھر یہی دانہ چوہدری کی چکی میں پس کر سفید سفید آٹے میں بدل جاتا ہے اور ہمارے گوشت پوست میں گھلتا ہے اور خون پسینے میں بہہ کر پھر مٹی میں رچ بس جاتا ہے۔ یہ زندگی کا چکر ہے۔ جب سوچ چکر میں گھومتی ہے تو اس کا سرا نہیں ملتا۔ گھوم پھر کر پھر اسی نقطے پر آ جاتی ہے' جہاں اس کا سفر شروع ہوا تھا۔

پر میں تو اپنے گاؤں کی کہانی لکھ رہا تھا۔

بے شک میری یہ دنیا بہت چھوٹی سی ہے۔ سمندر میں ایک قطرہ لیکن میں تو اس قابل بھی نہیں کہ ایک قطرے کے پھیلاؤ کو لفظوں میں سمیٹ سکوں۔ میں نے تو گاؤں کے چند لوگوں کو چن لیا ہے۔ میں سارے گاؤں کی کہانی بھی نہیں لکھ سکتا۔ اتنے بہت سے لوگوں کے قصے ایک کہانی میں کیسے کھپ سکیں گے۔ ہر ایک کا قصہ میرے بس کا روگ نہیں۔ تاہم جن لوگوں کو میں اپنے گاؤں کی کہانی کا جزو سمجھتا ہوں اُن کی کچھ باتیں ضرور لکھوں گا اور اپنی عمر کے پندرھویں سال کے خاتمے اور سولہویں سال کے آغاز پر جو نقطہ آتا ہے وہاں کھڑے ہو کر اپنے گردوپیش پر نظر ضرور ڈالوں گا۔ اس نقطے پر میرے اندر جو ابال ہوئی تھی' اس نے صرف مجھے ہی نہیں بدلا تھا بلکہ سارا گاؤں اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ جس طرح موسم بدلے تو گاؤں کی بُو باس' رنگ اور آوازیں بھی بدل جاتی ہیں' اس طرح میرے اندر جو تبدیلی آئی تھی اس سے گاؤں کا منظر بدل گیا تھا۔

اس نقطے سے پہلے گاؤں پر میرے بچپن کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ اب دھند چھٹ رہی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ میرا گاؤں نکھر کر سامنے آ رہا ہے۔۔۔ یوں بھی اس دن شروع بیساکھ کی دھوپ میں بہت تیکھا پن تھا۔ گندم پر سونے کا رنگ چڑھ رہا تھا۔ دور دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان کے درمیان پگڈنڈیاں اپنا رستہ بھول چکی تھیں۔ میں کنویں سے گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں درانتیاں تھیں' جنہیں لوہار کی دکان سے تیز کروانا تھا۔ بڑھئی کے ہاں جا کر ایک دو درانتیوں کو دستیاں بھی لگوانی تھیں۔ گاؤں کے جوہڑ کے کنارے پہنچا تو گاؤں کے لپے پُتے کچے مکانوں سے بچپن کی یادوں کے ریلے

نپک کر آئے۔ جوہڑ کے گدلے پانی سے بُو کا ایک بھبکا بھی آیا۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے سڑی بُسی باس بھی ناک میں گھس آئی۔ ان پر دانہ دنکا چگتی ہوئی مرغیوں کی کڑکڑ کی آواز بھی گویا میں نے پہلی بار سنی۔

یہ میرا گاؤں تھا۔ یہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا پر آج اس میں مجھے اجنبیت محسوس ہو رہی تھی۔ گاؤں سے باہر کھیتوں کی کھلی فضا میں دیکھنے سننے اور سونگھنے کی حسیں بدل جاتی ہیں۔ وہاں فصلوں کی خوشبو ہوتی ہے۔ پرندوں کے چہچہے خوشبو میں مل جاتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ میں ایک مہینے سے کنویں کا باسی بن چکا تھا۔ سکول چھوڑنے کے بعد سے گاؤں سے میرا رشتہ کٹ گیا تھا۔ میرا دوپہر کا کھانا ماں کنویں پر لے آتی۔ رات کا کھانا میں کبھی کبھار گھر آ کر کھاتا۔ پر اندھیرے اور دیوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں میں گاؤں کے در و دیوار میری نظروں سے اوجھل رہتے۔ میرا باپ گھر میں سوتا اور میں کنویں پر لوٹ آتا۔ میں خوشبو اور نغمے کا عادی ہو چکا تھا اور آج گاؤں مجھے اوپرا اوپرا سا لگ رہا تھا۔

جب میں بڑھئی کے گھر کی طرف جانے والی ٹیڑھی میڑھی تنگ سی گلی میں داخل ہوا تو پہلی ملاقات ماسی ریشم سے ہوئی۔ میں اُسے دیکھ کر مسکرانے لگا تو اُس نے پوچھا "ماہنے! کہاں رہتے ہو؟"

"یہیں ماسی۔ اپنے گاؤں میں۔"

"ماہنے! وہ مہاجر لڑکا ابھی تک نہیں لوٹا؟"

"نہیں تو۔۔۔" میں یکایک اُداس ہو گیا۔

ماسی کے سر پر سوکھے اُپلوں سے بھرا ٹوکرا تھا۔ اُس کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ بھیگے چہرے پر جھریوں کا جال تنا ہُوا تھا۔ میرے جواب پر جھریاں گہری ہو گئیں اور آنکھوں میں اداسی کی گدلاہٹ نمایاں ہو گئی۔

"ماسی! میرے بھا کے متعلق کیوں پوچھتی ہو؟"

"پوچھتی ہوں۔۔۔ کیوں پوچھتی ہوں؟ تیرے بھا کے بارے میں مجھے پوچھنے کا حق نہیں ہے ماہنے؟"

"نہیں۔۔۔ یہ بات تو نہیں۔۔۔"

"ماہنے! وہ مجھے بھی تو اچھا لگتا ہے۔"

"ماسی تو کتنی اچھی ہے! وہ آئے گی۔ ضرور آئے گی۔"

"ماہنے! تو شیماں سے اب تو نہیں ملتا؟"

"نہیں تو۔۔۔"

"بابا نتھو کے مرنے پیچھے تو اُسے نہیں ملا؟"

"نہیں ماسی۔"

"دینے ترکھان کے ہاں وہ بچاری نوکرانی بن کر رہ گئی ہے۔"

"وہ اُس کی ذات برادری کی ہے اور کہاں جاتی بچاری؟"

"جھنڈو تو راج بیٹھ گئی ہے۔"

"جھنڈو کون؟"

"دینے کے گھر والی۔ سارا دن پیڑھی پر بیٹھ کر حکم چلاتی ہے بچاری پر۔ روٹی پکائے تو وہ' بچوں کو سنبھالے تو وہ' اُپلے تھاپے تو وہ' بھینس کے لئے سانی بھی کرے تو وہ۔ بچاری لڑکی کا پھول سا چہرہ کملا کر رہ گیا ہے۔"

میرے دل پر یکایک ایک بوجھ سا آن گرا۔

"ماسی! میں دینے کے ہاں جا رہا ہوں۔"

"جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ اور ہاں وہ مسافر لڑکا جب آئے تو مجھے بتانا۔"

"اچھا" میں نے ایک بوجھل قدم اٹھا کر کہا۔

"ٹھہرو ماہنے!"

"کیا بات ہے ماسی؟"

"وہ بھی پوچھ رہی تھی اُس کا۔"

"وہ کون ماسی؟"

"وہی جو گھڑوں کی رانی ہے۔"

"وہ کون ہے ماسی؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"وہی ماہنے وہی۔ وہی جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ پر مجھے تیرا بھا اچھا لگتا ہے نا۔"

"پہیلیاں بجھوا رہی ہو ماسی۔"

"جا ماہنے! بھلا اُس سے پوچھ تو" وہ میرے پاس کیوں آئی' تیرے بھا کے بارے میں پوچھنے کو۔۔۔ میں نے اُسے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ پر مجھے اس کا دل تو نہیں توڑنا چاہئے تھا ماہنے۔"

"کس کا دل؟"

"جانے میری بلا۔" ماسی نے میلے دوپٹے کے پلو کے ایک کونے کو آنکھوں پر رکھ کر کہا۔

ماسی چلی گئی تو میں بڑھئی کے گھر کی طرف یہ سوچتا ہوا بڑھا کہ وہ کون تھی جو ماسی کے پاس آئی تھی۔ تب پندرھویں اور سولہویں سال کے سنگم پر ایک بجلی سی کوندی اور حیداں کا دکھ جلتے سورج کی ایک کرن بن کر میرے دل میں اتر گیا۔ مجھے بھا کی جدائی شدت سے محسوس ہوئی۔ میرا جی چاہا کہ حیداں کو بھی اس غم میں اپنا شریک بنا لوں۔

دینے ترکھان نے مجھ سے درانتیاں لیں اور دستے لگانے لگا۔ میں اُس کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا۔ میں دینے کے آنگن کے کونے کونے میں کچھ تلاش کرنے لگا تو اُس نے پوچھا "چوہدری ماہنے! تو نے پڑھنا وڑھنا کیوں چھوڑ دیا؟"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"چوہدری سلیمان نے۔"

میں دینے کی بات کا جواب دینے والا تھا کہ پچھواڑے سے شیماں نکل اور باہر جہاں دیوار کا سایہ تھا آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہاں دینے کی بیوی جھنڈو اناج پھٹک رہی تھی۔ اُس نے کہا "کھڑی میرا منہ کیوں تک رہی ہو' تور تیا لو۔" شیماں دینے کے قریب آ کر زمین پر بکھرے ہوئے لکڑی کے ٹکڑے اکٹھے کرنے لگی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ میری موجودگی سے بے خبر ہے۔ وہ لکڑی کے ٹکڑوں سے جھولی بھر کر سیدھی ہوئی تو اُس کی نگاہ میری نگاہ سے مل گئی۔ اُس نے آنکھیں پھیر لیں۔ میں نے سوچا کہ شیماں مجھے پہچان نہیں سکی اور دینے کی موجودگی میں میں شیماں کو پکار بھی نہ سکا حالانکہ میں اُسے بلا بھی لیتا تو کچھ حرج نہ ہوتا پر میرا بچپن گزر چکا تھا اور اب جوانی کی زبان پر جو پکار آتی' اُس میں بچپن کا بھولپن نہ ہوتا۔ بچپن تو کسی پابندی سے نہیں ڈرتا لیکن میری جوانی ڈر گئی تھی۔ شیماں دو تین بار

ٹکڑے اکٹھے کرنے کے لئے آئی اور اس نے میرے ساتھ آنکھیں نہ ملائیں۔

میں نے دینے سے کہا "گوری تو اب پوری گائے بن چکی ہے۔"

"گوری؟" دینے نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ "اچھا! اللہ بخشے بابا نتھو کی بچھیا کی بات کر رہے ہو تم؟"

"ہوں!"

"کیا پتہ اس سال بیاہی بھی جائے۔"

"بابا نتھو جب اسے خرید کر لایا تھا تو یہ اِتّی سی تھی۔" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"چوہدری ماجے! جانور بڑی جلدی بڑھتے ہیں۔ یہ انسان کا بچہ ہے کہ جوان ہونے کا نام نہیں لیتا۔ سالوں اسے پالتے پوستے رہو، پھر کہیں جوانی کا منہ دیکھتا ہے۔"

پہلے تنور سے دُھوئیں کا مرغولہ بلند ہوا، پھر شعلے بھڑکے اور بھڑبھڑ کی آواز کے ساتھ بولنے لگے اور ان کی تپش میرے جسم کو چھُونے لگی تو میں بے چین سا ہو گیا۔ یوں بھی دینے کے آنگن میں جس دریک کے پودے کے سائے میں ہم بیٹھے تھے، وہ ابھی پورے جوبن پر نہیں آیا تھا۔ تب جھنڈو آٹے کی کنالی لے کر تنور پر آئی۔ وہ ایک ڈھیلے ڈھالے جسم کی کم کوس عورت تھی۔ ایسی عورتیں دوڑ دوڑ کر کوئی کام نہیں کر سکتیں اور بیٹھ کر دوسروں پر حکم چلانا خوب جانتی ہیں۔ شیماں پیڑے بنا رہی تھی اور جھنڈو روٹی بنا کر تنور میں لگا رہی تھی اور تنور پر کوئی سایہ نہیں تھا اور چلچلاتی دھوپ میں شعلوں کی گرمی رچ گئی تھی۔

جب روٹیاں تنور سے اُترنے لگیں تو میری درانتیوں کو دستے لگ چکے تھے۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ شیماں نے پسینے میں بھیگی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ تمتمائے ہوئے چہرے پر پسینے کی نمی کو بھی آگ سی لگ گئی تھی اور آنکھوں میں دھوپ اور شعلوں کی لراہٹ ٹھہر گئی تھی اور مجھے یوں لگا جیسے میرے چاروں طرف آگ لگ گئی ہو۔

دینے نے کہا "چوہدری ماجے! روٹی کھا کر جاؤ۔"

"نہیں چاچا! کچھ اور کام بھی ہیں۔ میں یہاں سے سیدھا لوہار کے ہاں جاؤں گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

میں لوہار کے ہاں گیا۔ اس نے درانتیاں تیز کر دیں تو میں نے گھر کا رُخ کیا۔ تب

میرا جی چاہا کہ حیداں کو بھی ایک نظر دیکھ لوں۔ میں چوہدری کی حویلی کی طرف مُڑ گیا۔ اُس وقت تک دوپہر ہو چکی تھی اور تنگ گلیوں کے سائے سمٹ کر دیواروں سے لگ گئے تھے۔ گلیاں سونی اور سنسان تھیں۔ چوہدری کی حویلی کے دروازے پر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اندر آنگن بھی خالی تھا۔ سَلی ابھی سکول سے نہیں لوٹا ہو گا۔ وہ دوپہر سکول میں گزارتا ہو گا۔ گلی میں سائیکل کی گھنٹی بجی تو میں چونک گیا۔ وہ گلی میں بھی سائیکل چلا رہا تھا۔ اس نے کہا "ماجے! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں ـــ درانتیاں تیز کروا کر لوہار کے ہاں سے آیا ہوں۔"

"اِدھر کا رستہ کیسے بھُول گئے؟"

میں نے کہا "نہیں تو ـــ رستہ نہیں بھُولا میں۔"

اس نے پھر گھنٹی بجائی تو میں نے پوچھا۔ "اب گھنٹی کیوں بجا رہے ہو؟"

"حیداں کے لئے۔"

گھنٹی کی آواز سن کر حیداں اندر سے نکل آئی تو سَلی ہنسنے لگا۔

"کس بات پر ہنس رہے ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"یونہی ـــ حیداں گھنٹی کی آواز سن کر اندر سے فوراً نکل آتی ہے پر جب میں کہتا ہوں حیداں سائیکل پر میرے پیچھے بیٹھ جاؤ، میں تمہیں سیر کراؤں گا تو وہ بہت ڈرتی ہے۔"

"کہیں لڑکیاں بھی سائیکل پر بیٹھی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں بیٹھتیں؟" سَلی بولا "سیدپور کے ذیلدار کا بڑا بیٹا اپنی بیوی کو سائیکل کے پیچھے بٹھا کر اُسے اُس کے میکے میں چھوڑ آتا ہے اور وہاں سے لے بھی آتا ہے۔"

"بڑا بے شرم ہے۔" میں نے کہا "اسے گھوڑی پر بٹھا کر لائے تو کوئی بات بھی ہے یہ بھی تو مل سکتا ہے۔"

جتنا عرصہ میں اور سَلی باتوں میں مصروف رہے، میں نے حیداں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جب میں نے حیداں کی طرف دیکھا تو وہ مجھے شرمائی شرمائی سی نظر آئی۔ اُس کے سانولے چہرے پر پسینے کی نمی تھی اور اُس کی آنکھیں جُھکی ہوئی تھیں۔ وہ حسبِ معمول صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھی اور اُجلی اُجلی نکھری نکھری سی نظر آ رہی تھی۔

"جانتے ہو حمیداں کیوں شرما رہی ہے؟"

"نہیں تو——"

"میں نے سید پور کے ذیلدار کے بیٹے کا جو ذکر کر دیا ہے نا۔"

"چپ رہو بے شرم!" حمیداں نے لجائی ہوئی آواز میں سلی کو ڈانٹا۔

کھی—— کھی—— کھی—— سلی نے قہقہہ لگایا۔ "حمیداں! آج بھی اس نے تیری بابت مجھ سے پوچھا تھا۔"

"کس نے؟" میں نے پوچھا۔

"ذیلدار کے بیٹے نے۔"

"چپ رہو بے شرم۔" حمیداں پکاری اور اس نے اوڑھنی کے پلو سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"وہ جو سائیکل پر اپنی بیوی کو——"

"نہیں۔ نہیں۔ میں اس سے چھوٹے کی بات کر رہا ہوں ماہنے!" سلی نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"جاؤ! سائیکل اندر لے جاؤ۔" حمیداں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

سلی نے مجھ سے کہا "ماہنے! جب سے تو نے سکول چھوڑا ہے، میرا تو جی نہیں لگتا۔ کبھی کبھار شام کو گاؤں آ جایا کرو۔ گلی ڈنڈا کھیلیں گے۔ شیماں کا آنگن تو اب خالی ہو گیا ہے۔ پھر ہم بڑے بھی تو ہو گئے ہیں۔ لڑکیوں سے کھیلیں گے تو انگلیاں اٹھیں گی۔ کیوں حمیداں؟"

"ہاں ہاں اب جاؤ بھی اندر۔"

"ماہنے! شام کو آؤ گے کھیلنے کو؟"

"نہیں سلی! مجھے کل کالج سے فرصت نہیں ملے گی۔"

سلی سائیکل لے کر حویلی کے اندر چلا گیا تو حمیداں بولی "ماہنے! سلی بڑا بے شرم ہو گیا ہے۔"

"بے شرم ہو گیا ہے کیوں؟"

"اپنی جوان بہن سے بھائی اس قسم کی باتیں تو نہیں کرتے۔"

"اس نے ذیلدار کے چھوٹے بیٹے کی کچھ بات کی تھی حمیداں! وہ تیری بابت کیوں پوچھتا تھا؟"

"میری بلا جانے کیوں پوچھتا ہے وہ؟" حمیداں نے کہا "ماہنے!"

"کہو۔"

"تیرا بھا اب لوٹ کر نہیں آئے گا اس گاؤں میں؟"

"کون جانے؟—— پر میرا جی کہتا ہے، وہ آئے گا۔ ماسی ریشم بھی پوچھ رہی تھی۔"

"اچھا! وہ آئے گا نا؟"

"میرا جی کہتا ہے۔"

"میرا جی بھی یہی کہتا ہے۔"

"پر تو میرے بھا کے متعلق کیوں پوچھتی ہے حمیداں؟"

"نجانے کیوں؟"

تب پندرھویں اور سولھویں سال کے سنگم پر کھڑے ہو کر میں نے حمیداں کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکا اور میں نے اس کی پلکوں پر ایک کرن کو لرزتے ہوئے دیکھا۔ اس کی لرزش مجھ سے ہم کلام ہو گئی۔ میں نے اس بے لفظ بات کو سمجھنے کی کوشش کی تو مجھے اس کرن کے آئینے میں شیماں کی تصویر نظر آئی اور میں حیران ہو گیا۔ مجھے اس میں بھا کی تصویر نظر آنی چاہئے تھی۔ یہ تو حمیداں کی پلکوں پر کانپنے والی کرن تھی۔ میں بے چین سا ہو گیا۔

میں نے کہا "حمیداں! بھا آئے گا تو——"

لیکن میری آواز میرے دل میں ڈوب گئی۔ حمیداں اندر جا چکی تھی۔ میں حویلی کے دروازے پر تنہا کھڑا تھا۔ گاؤں مجھے خالی خالی نظر آیا۔ میں گھر جانے کے لئے تیز تیز چلنے لگا۔ تیزی سے بیتی گلی یکدم ختم ہو گئی۔ میں گھر کے آنگن میں داخل ہوا تو میری ماں نے پوچھا "کہاں سے آ رہے ہو ماہنے؟"

"درانتیاں تیز کروا کے لا رہا ہوں ماں۔ مجھے روٹی دو۔ کنویں پر لے جاؤں گا۔"

"عائشہ لے جائے گی۔ تم آج دوپہر یہیں گھر میں رہو۔"

"کیوں ماں؟"

"جب سے تم نے مدرسہ چھوڑا ہے، تم گھر میں نہیں سوئے۔ میرا تو جی ترس گیا ہے۔ تم سوؤ گے، میں تمہیں پنکھا جھلوں گی اور ہاں ماہنے! آج آٹا بھی تو پسوانا ہے چکی لے جاؤ گے نا دانے؟"

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ "اچھا ماں! جیسے تمہاری مرضی۔" میری ماں خوش ہو گئی۔ اس نے مجھے چپڑی روٹیاں دیں۔ لسوڑوں کے اچار کے ساتھ ان کا بڑا مزہ آیا۔ عائشہ کھانا لے کر کنویں پر جانے لگی تو میں نے اس کے سراپے پر ایک نظر ڈالی۔ اب وہ بڑی ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے اڑھائی تین سال چھوٹی ہو گی۔ ایک دو سال بعد وہ جوان ہو جائے گی تو میرے ابو کو اس کی شادی کی فکر گھن کی طرح کھانے لگے گی۔ اس وقت وہ سوچے گا:

"اس کا جہیز کہاں سے آئے گا؟ میرے پاس تو تین گھماؤں زمین ہے۔ اس کی آمدنی سے گھر کا خرچ بھی مشکل سے چلتا ہے۔" بیٹی کو اچھا جہیز نہ ملے تو جاٹ کا سر نیچا ہو جاتا ہے۔

پندرھویں اور سولھویں سال کے سنگم کی یہ سوچ مجھے اجنبی سی معلوم ہوئی پر اس کا دھارا خود بخود پھوٹ بہا تھا۔ عائشہ چلی گئی تو مجھے اس سوچ سے چھٹکارا ملا۔ میں اپنے چھوٹے بھائی عبدالغفار سے کھیلنے لگا۔ تب مجھے نیند آ گئی۔ میں نسار کے پیچھے کی کوٹھڑی میں جا کر ایک کھاٹ پر لیٹ گیا۔ ماں میرے پاس بیٹھ کر مجھے پنکھا جھلنے لگی۔ میں نے کہا "نہیں ماں بس!" کوٹھڑی کے اندر ٹھنڈک تھی۔ بیساکھ کے مہینے میں چھت کا سایہ بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ میں سو گیا۔ جب میں جاگا تو صحن میں دیواروں کے سائے اتر آئے تھے۔ یکایک گُگ گُگ کی آواز آئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ماں پسار میں جس کھاٹ پر سو رہی تھی، اس کے سرہانے فرش پر اناج کی گٹھڑی رکھی تھی۔ عائشہ باہر دیوار کے سائے میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ میں نے عائشہ کو بلایا۔ اس نے گٹھڑی سر پر رکھنے میں میری مدد کی اور میں چکی کی طرف روانہ ہو گیا۔

گلی سے نکل کر میں کھلی جگہ پر آیا تو کھیتوں کی خوشبو آئی۔ چکی کی گُگ گُگ نے بچپن کو آواز دی تو میں نے گٹھڑی کے بوجھ تلے کان بند کر لئے۔ اب میں بچپن سے ہم کلام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جب میں چکی پر پہنچا تو بڑی رونق لگ چکی تھی۔ اب آس پاس کے گاؤں کے لوگ یہیں سے آٹا پسوانے آتے تھے۔ آٹا پسوانے والوں میں لڑکیوں کی تعداد بڑھ

گئی تھی۔ مجھ سے پہلے بہت سی "پنڈیں" ترکڑ کے ارد گرد پڑی تھیں۔ یہ گٹھڑیاں تھیں۔ مستری اندر تھا۔ وہ گیروے کپڑے پہنے باہر آیا تو میں ہنس پڑا۔ اب کے اس نے میری ہنسی کا برا نہ مانا۔

"آہا! چودھری ماہنا یہاں؟ —— واہ جی واہ —— کہاں سے ٹپک پڑے تم؟"

"آج چکی کی رونق دیکھنے کو جی چاہا تھا۔"

"چودھری ماہنے! تیری باری دیر سے آئے گی۔ ذرا گٹھڑی ترکڑ پر رکھ دے۔" گٹھڑی تل گئی تو اس نے پرچی میرے ہاتھ میں تھما کر کہا "پرچی کھو گئی تو آٹا نہیں ملے گا۔"

"میں وزن یاد رکھوں گا۔"

"آج تیری سفارش کرنے کو کوئی یہاں نہیں ہے۔"

"کوئی کون؟" میں نے پوچھا۔

"بھول گئے۔" مستری نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا "یاد کرو۔"

"مستری!" اندر سے ایک آواز آئی۔ "گلا ختم ہے۔"

"جس کی باری ہے وہ ڈال دے نا اپنے دانے۔"

پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "اچھا جی! تم اپنی سفارش بھی ساتھ لے کر آئے۔"

"کیا کہہ رہے ہو مستری۔"

"اودھر دیکھو تو۔" اس نے گاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے گاؤں سے چکی کی طرف آنے والی پگڈنڈی پر حیداں کو دیکھا تو مستری نے پھر آنکھ میچ کر کہا۔ "بڑے کائیاں ہو چودھری؟"

مستری اندر چلا گیا تو میں نے سوچا آج مستری میری بہت عزت کر رہا ہے اور مجھے چودھری کہہ کر پکار رہا ہے۔ آخر کیوں؟ اتنے میں حیداں آ گئی۔ آج مستری اس کے سامنے جو گزارن گر کڑانہ ہوا۔ اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا۔ "بی بی آج چکی پر آنے کی کیا وجہ ہوئی؟"

"کچھ بھی نہیں مستری۔ تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"یونہی —— میرا مطلب تھا شاید چودھری صاحب نے بھیجا ہو آپ کو؟ مجھے تو نہیں

بلایا انھوں نے؟"

"نہیں!" حمیداں نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

وہ مجھے کنکھیوں سے ایک نظر دیکھ کر اندر چلا گیا۔ اس وقت تک بہت سی [illegible]
حمیداں کے گرد جمگھٹا باندھ کر کھڑی ہو چکی تھیں۔ وہ چہچہا کر باتیں کرنے لگیں تو میں [illegible]
الگ ذرا دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے ان کی باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ہم [illegible]
کبھی کبھار میری طرف دیکھ لیتی، تو میں بے چین سا ہو جاتا۔ پھر حمیداں ان سے [illegible]
میری طرف آئی، تو میری بے چینی اور بڑھ گئی۔ اس نے میرے قریب آ کر پوچھا "[illegible]
چکّی پر کیوں آئے ماہنے؟"

"رونق دیکھنے کے لئے۔ کل سے کٹائی شروع ہے۔ پھر گاؤں آنے کی کے [illegible]
ملے گی؟"

وہ گاؤں کی طرف سے آنے والی پگڈنڈی کو دیکھ کر مسکرائی "یہی بات ہو گی۔"

میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے پگڈنڈی پر جھنڈو نظر آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے شیماں [illegible]
رہی تھی۔ اس کے سر پر اتنا بڑا گٹھڑ تھا کہ وہ بوجھ سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے [illegible]
کر دکھ ہوا پر میں اس کا بوجھ اپنے سر پر نہ رکھ سکا۔ حمیداں میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ
سے میرے من کی بات پا چکی تھی۔

اس نے بڑی گمبھیر آواز میں کہا "جاؤ ماہنے! آگے بڑھ کر اس کا بوجھ اپنے سر پر [illegible]
لو۔"

"نہیں تو ـــــ" میں نے کہا۔

میں نے سوچا "اتنی لڑکیوں کی نظروں کے بیچ میں سے راستہ کیسے بنا سکوں گا؟"

"ہاں! دوسروں کا بوجھ اپنے سر پر رکھنا بہت مشکل ہے ماہنے!" حمیداں نے اسی [illegible]
میں کہا۔

مستری لپکا۔ اس نے گٹھڑ شیماں کے سر سے اُتار لیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں نے [illegible]
زندگی کی پہلی مات کھائی ہو۔

اس نے کہا "بھلی جھنڈو! یہ کہاں کا انصاف ہے؟ سارا بوجھ تو نے بچاری لڑکی کے
سر پر لاد دیا۔ خود تو مٹک مٹک کے چلتی آ رہی ہے۔"

"چل ــ چل ــ مستری! بچاری لڑکی کا اتنا ہی دُکھ ہے تو خود لے آتا دانے میرے
گھر سے۔"

"بھلی جھنڈو! بھائی دین محمد سے شکایت کروں گی تیری۔"

"کر لینا۔ ایک بار نہیں سو بار۔ میں اس سے ڈرتی تھوڑی ہوں۔" جھنڈو نے مٹک
کر کہا۔

"دن میں تین تین بار ٹھونستی ہے تو تو دیکھنے آتا ہے کبھی۔ ذرا دانے پسوانے کو آ
گئی تو تجھے اس کا غم کھانے لگا۔"

مستری نے گٹھڑ ترکڑی پر رکھا۔ دوسرے پلڑے میں من کا بٹا ڈالا۔ ایک آدھ سیر کے
ہیر پھیر سے پلڑے برابر ہوئے تو مستری بولا "بھابھی جھنڈو! اتنا بوجھ تو کسی گدھے پر یا بھائی
دین محمد کے سر پر لد کر آنا چاہئے تھا۔"

"چل چپ بھی کر مستری!" جھنڈو نے چڑی ہوئی آواز میں کہا۔

شیماں چپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ مستری کو دیکھ رہی تھی، نہ مجھے۔ اُس کا چہرہ سُرخ
تھا اور سُرخی گردن تک پھیل آئی تھی۔ میلی اوڑھنی سے نکلے ہوئے بالوں کا ایک گچھا اس
کے گیلے ماتھے پر چپک سا گیا تھا۔ آج دوپہر کو جب میری اُس سے نظر ملی تھی اور اب اس
لمحے جب دن ڈھلے کی دھوپ کملا رہی تھی، مجھے شیماں کے دو روپ نظر آئے۔ دوپہر کو میں
نے شیماں کے روپ میں دکھ کی تصویر دیکھی تھی اور اب وہ سارے جہان سے روٹھی ہوئی
تھی۔ اسے مستری کی ہمدردی بھی متاثر نہ کر سکی تھی۔ میں اُس سے کوئی بات نہ کر سکا۔

میرا آٹا پس گیا۔ مستری نے پرچی لیتے ہوئے حمیداں سے کہا "بی بی! اب تو ماہنا بہت سیانا ہو
گیا ہے۔ اس نے پرچی نہیں کھوئی۔ یاد ہے جب ماہنا پہلی بار دانے پسوانے آیا تھا۔"

"ہاں یاد ہے۔" حمیداں بے دلی سے بولی۔

میں گٹھڑی سر پر رکھنے ہی والا تھا کہ چکی والے کمرے کی اوٹ سے نکل کر چوہدری
یکدم ہم میں آ موجود ہوا۔ اس کی آمد پر مستری اٹن شن کھڑا ہو گیا۔ اس عرصے میں بھیڑ
چھٹ چکی تھی۔

"اُس نے حمیداں کو دیکھ کر کہا "تو چکی پر کیوں آئی حمیداں؟"

"یونہی۔"

"تیری جگہ سلیمان کو آنا چاہئے تھا۔ کاروبار کی دیکھ بھال لڑکے کرتے ہیں' لڑکیاں تو نہیں کرتیں۔ کیوں مستری؟"

"ٹھیک ہے چوہدری!"

پھر اُس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا "ماہنے تُو نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا ہے؟"

"جی ہاں!"

"یہ لڑکی کون ہے؟" اُس نے شیماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ بابا نتھو کی پوتی شیماں ہے۔"

"اوہو! میں بھول ہی چکا تھا۔ لڑکی کیا حال ہے تیرا؟"

"اچھا ہے جی!" شیماں بولی۔

"بہت اچھا ہے چوہدری جی! اب تو یہ ایک من کا گٹھڑ سر پر اُٹھا سکتی ہے۔" مستری بولا۔

"بڑا اچھا ہے ــــ اتنا بوجھ! ــــ ہوں ــــ" اُس نے شیماں کو غور سے تکتے ہوئے کہا۔ تب اُس کی آنکھیں شیماں کو سر سے لے کر پاؤں تک جانچ گئیں۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی جیسے کسی بچے نے گُڑ کی بھیلی دیکھ لی ہو اور دیکھتے ہی اُس کے منہ سے رال ٹپک پڑی ہو۔ تب پندرھویں اور سولھویں سال کے سنگم پر کھڑے ہو کر میں نے چوہدری کی آنکھوں میں جھانکا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ گہرے گدلے پانی کے جوہڑ ہوں اور شیماں ان میں ڈوب رہی ہو۔ میں نے حمیداں کی طرف دیکھا۔ اُس کی نظر میری نظر سے ملی۔ وہ نظر شرم کے پسینے میں غرق تھی اور اُس کے چہرے کی سنولاہٹ میں سُرخی بھی جھلملا رہی تھی اور مستری اتنا بوکھلا گیا تھا کہ اُس کے ادھ کُھلے ہونٹوں پر اُس کی عاجزانہ مسکراہٹ گوند سے چپک کر رہ گئی تھی۔

"شیماں! تو نے اپنی ماں کو کبھی دیکھا ہے؟" چوہدری نے یکایک اپنے آپ میں آکر پوچھا۔

"نہیں جی ــــ اب تو نہیں ــــ میں چھوٹی سی تھی جب ــــ" اُس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

"ہاں! ہاں! وہ بھی تیری ہی طرح تھی۔ اللہ بخشے تیرا باپ فضل دین بڑا کلّے ٹھلے کا

گھبرو تھا۔ آہ! موت بڑی ظالم ہے۔ بھر جوانی میں اُسے جھپٹ کر لے گئی ــــ جھنڈو!"

"جی چوہدری جی!"

"اس لڑکی کو اپنی اولاد کی طرح رکھنا۔"

"ہم پہلے ہی کون سی کسر اٹھا رہے ہیں چوہدری! جو خود کھاتے ہیں' وہی اسے کھلاتے ہیں۔"

"شاباش! ــــ حمیداں! چلو گھر چلیں۔"

چوہدری حمیداں کو ساتھ لے کر گھر کی طرف چلا گیا تو میں نے آنے کی گٹھڑی سر پر رکھ لی۔ مستری جھنڈو کی مدد سے شیماں کے دانے اٹھا کر اندر لے گیا تھا۔ اس لیے چاہتا تو شیماں سے ایک دو باتیں کر لیتا پر میرا جی بجھ سا گیا تھا۔ میں گھر پہنچا تو میں اکیلا تھا۔ شیماں دُور کہیں بہت دُور رہ گئی تھی یا کسی گہرے جوہڑ کے گدلے پانی میں ڈوب گئی تھی۔

پندرھویں اور سولھویں سال کے دھارے جس نُقطے پر ملے تھے' وہاں آج دوپہر کو دھوپ کی چمک تھی اور اب دن ڈھلے وہ کالے سمندر کی پاتال میں غرق ہو چکا تھا!

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۸

○

بیساکھ کے مہینے میں جب زمین کا سارا رس کھینچ کر خوشوں میں چلا آتا ہے تو زمین کی نمی سوکھ جاتی ہے اور پودوں کی بالیاں کڑکڑا جاتی ہیں۔ دھوپ خوشوں کو پکاتی ہے اور جب بالیوں سے پکتے اناج کی خوشبو آتی ہے تو کسان کا جی لہلہا اٹھتا ہے۔ اس سے وہ دُنیا جہان کا مالک بن جاتا ہے۔ وہ اپنے دُکھ درد بھول جاتا ہے۔ پکے ہوئے خوشوں کی خوشبو صدیوں سے میرے خمیر میں رچی ہوئی تھی۔ میں نے درانتی ہاتھ میں لی اور کھیت کا رُخ کیا تو میں ملنگ نہیں تھا، ایک کسان تھا۔

تین کھیتوں کی کٹائی ہم باپ بیٹا آسانی کے ساتھ کر سکتے تھے پر "رت" آخر "رت" ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے ساتھ دو لاوے لگائے اور کام شروع کر دیا۔ ان کھیتوں میں ان کا بھی تو حق تھا۔ ایک نکّے کا کھیت چار درانتیوں کی زد پر ہو، تو اس کی کیا بساط ہوتی ہے۔ جب ہم مینڈھ پر ایک کیکر کی چھدری چھاؤں میں دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھے تو کھیت دو حصے کٹ چکا تھا اور ایک حصہ باقی رہ گیا تھا۔ ابھی سہ پہر کی دھوپ کی چمک کند بھی نہ ہوئی تھی کہ پورا کھیت کٹ گیا۔

میرے باپ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "بس بھئی! آج اتنا ہی کام کافی ہے۔"

"کیوں چوہدری؟" ایک لاوے نے پوچھا۔

"میرے تین کھیت دو دنوں میں کٹ سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں خالی کھیتوں کو دیکھتا رہوں گا تو میرا جی جلتا رہے گا۔"

"کم جتنی جلد ختم ہو جائے۔ اچھا ہوتا ہے بابا!"

"ہاں بابا! ٹھیک کہتے ہو ماہنے۔ پر گندم کی کٹائی اور گاہی پیچھے جو دن آتے ہیں، وہ کسان کی بے کاری کے دن ہوتے ہیں۔ وہ آسمان کی طرف تکتا رہتا ہے کہ کب بادل

آئیں، اساڑھ کی پہلی بوچھار پڑے اور بھربھری گیلی زمین میں ہل کا پھالا لگ سکے۔ اتنے دن بے کار رہ کر کیا کرو گے؟"

ہم پولے باندھ رہے تھے اور اسی کھیت کے ایک کونے میں کھلیان لگا رہے تھے کہ سلا چننے والیاں آ گئیں۔ ان میں شیماں نہیں تھی، ماسی ریشم تھی۔ جب کھیت کی کٹی ہوئی ساری گندم کھلیان میں پہنچ گئی تو میں ماسی کے پاس گیا۔ میں نے پوچھا "ماسی! اچھی تو ہو۔"

"ہاں اچھی ہوں ماہنے!"

"پار سال تو شیماں بھی تیرے ساتھ تھی ماسی۔"

"پار سال کی بات پار سال کے ساتھ گزر گئی۔ اب وہ جھنڈو کے ساتھ چوہدری کے کھیتوں میں چلی گئی ہو گی۔"

"وہ یہاں کیوں نہیں آئی؟"

"میں کیا جانوں؟ جھنڈو سے پوچھو۔"

"جھنڈو سے پوچھنے کون جائے ماسی؟ —— وہاں سلّی بھی ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو تیرے کھیت میں سلا چگ رہی ہوں مجھے سلّی کا کیا پتہ۔"

میں نے سر پر لپٹے صافے کے پلّو سے پسینہ پونچھا اور سوچا "یہ سال پار سال سے کتنا مختلف ہے؟"

تین کھیت تین دنوں میں کٹ گئے تو ہم نے گاہی شروع کر دی۔ اس میں بھی کچھ زیادہ دن نہ لگے۔ اڑائی کے لئے ہم نے صرف ایک آدمی لگایا۔ جب بھوسہ الگ ہوا اور گندم کا چھوٹا سا ڈھیر لگا تو میراثی بیٹھ گیا۔ بڑھئی، لوہار، نائی، دھوبی اور مولوی اور دوسرے سیپیوں کا حصہ دینے کے بعد گندم کا ڈھیر اور بھی کم ہو گیا تو میں نے سوچا "کسان کی کمائی میں کتنے لوگ شریک ہیں؟" مجھے ڈھوم ڈھاری، میراثی، شیخ، بھرائیں اور کھیت منگتے یاد آئے جو کٹی فصل میں سے اپنے حصے لے کر جا چکے تھے اور سلا چننے والیوں نے گرا پڑا ہر خوشہ اٹھا لیا تھا اور پنچھی پکھیرو بچے کھچے دانوں سے اپنے پوٹے بھر چکے تھے اور کسان کے حصے کا ڈھیر گھٹتا رہا، گھٹتا رہا حتی کہ چھ مہینوں کی محنت، سردی، گرمی، بیماری، دکھ اور لہو پسینے کا ڈھیر اس سے بلند ہو گیا۔

میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تو میرے باپ نے پوچھا "کیا بات ہے ماہنے؟"

"کچھ بھی نہیں بابا!"

"تُو نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔"

"یونہی۔۔۔بابا۔۔۔ کسان اس ڈھیر کے لئے کتنی محنت کرتا ہے۔" میں نے گندم کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"محنت بنا دنیا کا کون سا کام ہوتا ہے ماہنے؟"

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے۔۔۔ بابا! تیری محنت میں کتنے لوگ شریک ہیں۔ کل تک تو یہ ڈھیر اتنا چھوٹا نہیں تھا۔"

"دل چھوٹا نہ کر ماہنے۔ یہ لوگ بھی تو چھ مہینوں سے اس ڈھیر کی راہ تک رہے تھے میں تو خوش ہوں، میں نے کسی کا حق نہیں مارا۔"

پر اس فصل پر ہمارے گھر کا ایک "بھڑولا" بھی نہ بھر سکا۔

اور ہم ساونی کی فصل بونے کے لئے آسمان کی طرف تک رہے تھے کہ بھا اسلم آ گیا۔ میں ٹوکے پر چارا کتر رہا تھا۔ میرا باپ ٹوکے میں چارے کے "دتھے" لگا رہا تھا۔ وہ اتنا چپکے سے آیا کہ ہم اس کے پاؤں کی چاپ بھی نہ سن سکے۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ماہنے!"۔ میں اس کے لہجے کے پیار پر چونکا بھی نہیں تھا کیونکہ میں اُس کا محرم تھا پر میرے تن بدن میں تھرتھری سی آئی اور پھر آنکھوں میں نمی کا غبار آ گیا اور اُس کی شکل دُھندلا گئی۔

"اسلم تم آ گئے؟" میرے باپ کی آواز لرز رہی تھی۔

"ہاں چاچا!"

"ماہنے! بھا سے ملو۔۔۔ پر یہ کون ہے اسلم؟"

بھا نے ابھی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ میں دُھند کے غبار میں سے بول اٹھا "عائشہ! تم کیوں آئیں کنویں پر اس وقت؟"

"یہ عائشہ نہیں ہے ماہنے!" بھا نے کہا۔

"پھر کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ وہی ہے جس کے وجود سے میں انکار کرتا رہا ماہنے! میں نے اکو کی بجائے اسے گھائل دیکھنا چاہا۔ آج میں اس سے بہت شرمندہ ہوں۔" بھا نے کہا اور میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا تو میرے باپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُسے سینے سے لگا لیا اور کہا۔

"ماہنے! یہ عائشہ نہیں تو اور کون ہے؟"

تب میں نے اس لڑکی کو انکھیوں سے دوسری بار دیکھا۔ اب میری آنکھوں میں نمی کا غبار بھی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ مجھے عائشہ ہی نظر آئی۔ وہی شکل صورت، وہی اوڑھنی جو آدھے ماتھے کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ وہی کبوتر کی طرح سہمی سہمی آنکھیں جن سے بچپن بھی جھانک رہا تھا اور چھپا چھپ آتی ہوئی جوانی کی لپا بھی چھلک رہی تھی۔ عائشہ کے علاوہ گاؤں کی کسی اور لڑکی کو میں نے اس روپ میں نہیں دیکھا تھا۔ عائشہ کا ایک اور روپ دیکھ کر میں حیران بھی نہ ہوا۔

میں نے پوچھا "بابا! اس کو عائشہ کے نام سے پکاروں میں؟"

"نام میں کیا ہوتا ہے پر اسلم! میری اس بیٹی کا نام کیا ہے؟"

"زینت۔"

"آؤ بیٹی! میں تمہیں گھر لے چلوں۔"

زینت نے بھا کی طرف دیکھا۔ بھا نے کہا "جاؤ زینو! اپنے گھر جاؤ۔"

میں نے باپ اور بیٹی کو کٹے ہوئے کھیتوں کے درمیان چمکتی ہوئی پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلتے ہوئے دیکھا تو میرا جی بھر آیا۔ میرے باپ کو وہ بیٹی مل گئی جو اندھیری رات کی کوکھ میں گم ہو گئی تھی۔ میں نے ٹوکے کے چکر کو گھمایا تو بھا نے چارے کا ایک دتھا اس میں لگا دیا۔

میں نے چکر کے دستے پر سے ہاتھ اٹھا کر کہا "بھا! پانی وانی تو پی لے پہلے۔ اتنی گرمی میں آئے ہو۔"

"پیاس تو لگ رہی ہے ماہنے!"

میں کوٹھے کے اندر گیا اور گھڑے سے مٹی کے پیالے میں پانی بھر کر لے آیا۔ بھا ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی پی گیا۔ میں نے پوچھا "اور؟" بھا نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ ٹوکے کا چکر گھومنے لگا اور کٹ کٹ چارا کٹنے لگا۔ میں کٹے ہوئے چارے میں بھوسہ ملانے لگا تو ہلد پر بندھے بیل میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ہمارے کنویں کے شریک ایک ایک کر کے ٹوکے پر چارا لانے لگے اور بھا سب سے باری باری ہاتھ ملاتا رہا اور اُن سے گلے ملتا رہا۔ وہ

اس سے حال چال پوچھتے رہے۔ بھا ان سے ہنستا بولتا رہا اور تب رات ہو گئی اور بیلا گلاں سے ہمارا کھانا لے آیا۔ اس نے بتایا کہ عائشہ اور زینت یوں ملیں جیسے مدّت سے بچھڑی ہوئی بہنیں ہوں اور "ماجھے! تمہاری ماں تو بے اختیار رو پڑی۔ عورتوں کے دل بڑے نرم ہوتے ہیں۔ پھر بچھڑی ہوئی بیٹیوں سے مائیں اتنی دیر بعد ملیں تو جی بھر ہی آتا ہے۔" دیوار کے طاق میں جلتے ہوئے دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں میں بھا کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا پر میرے گلے میں لقمہ پھنس گیا تھا۔

بھا کبھی اپنی کہانی مسلسل نہیں کہتا تھا۔ کئی ٹوٹے ہوئے سلسلوں کو جوڑ کر کہانی مکمل کرنی پڑتی تھی اور وہ بھی کئی دنوں میں جا کر۔ بھا اس بار بھی گاؤں گاؤں پھرا۔ جہاں کہیں اسے اپنے علاقے کے لوگوں کا پتا لگا' وہ وہاں پہنچا۔ اس طرح وہ سیالکوٹ سے گوجرانوالہ پہنچا وہاں سے شیخوپورہ گیا۔ لائل پور کے ایک چک میں اسے اپنی طرف کے چند آدمی ملے۔ ان سے اُسے اپنے چچا کی خبر ملی۔

"ماجھے! مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرا چچا زندہ ہے---- پر جب حقیقت سامنے موجود ہو تو اس پر یقین ہی کرنا پڑتا ہے۔" بھا کو زندہ سلامت دیکھ کر چچا کو اُس سے بھی زیادہ حیرت ہوئی۔ وہ کچھ دیر تک بھا کو یوں تکتا رہا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ اس نے پوچھا "تو اچھا ہے یا اکّو؟" بھا نے جواب دیا کہ وہ اکو نہیں اچھا ہے۔ اکو تو ایک ظالم کی برچھی کا شکار ہو گیا تھا۔ جب بھا نے اکّو کی موت کا پورا واقعہ سنایا تو چچا کی خشک آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ آیا۔ چچا کا ایک نوجوان بیٹا بھی شہید ہو گیا تھا اور ایک لڑکی دریا کے طوفان کی نذر ہو گئی تھی۔ وہ کس کس کو روتا؟ تب بھا کو معلوم ہُوا کہ اس کے ماں باپ کشتی اُلٹنے سے دریا میں ڈوب گئے تھے تو وہ بھی نہ رو سکا۔

بھا نے صرف اتنا پوچھا "چچا! دریا نے زینت کی بھی پردہ پوشی کر لی ہو گی۔"

"نہیں!" چچا نے کہا اور بھا تڑپ گیا۔

بھا نے پوچھا "چچا اُسے تم کہاں چھوڑ آئے؟"

"وہ یہیں ہے اچھے! وہ یہیں ہے۔"

تب ایک لڑکی نے بھا کا دامن کھینچا تو طوفان کے سامنے بند ٹوٹ گیا۔ بھا رو پڑا۔ یہ خوشی کے آنسو تھے یا غم کے؟ بھا اس کا فیصلہ نہ کر سکا۔

چچا کے کہنے پر اس نے اپنے حصّے کی زمین اسی چک میں الاٹ کروالی۔ اس کام میں بہت سا وقت لگ گیا۔

"پر ماجھے! میرا اس چک میں جی نہ لگا۔ چچا نے بہت روکا لیکن میں یہاں آگیا۔"

بھا نے اپنے کُرتے کے اندر کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر مجھے دکھایا۔

میں نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

"یہ دکان کا پروانہ ہے۔ تحصیل دار نے لکھا ہے---- چک مراد کے سفید پوش کے نام"

"چک مُراد؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اپنے گاؤں کا نام بھول گئے ماجھے؟" بھا نے مسکرا کر کہا۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میں اپنے ہی گاؤں کا نام بھُول گیا تھا پر میرا گاؤں میرا گاؤں تھا اس کے لئے کسی نام کی بھی کیا ضرورت تھی!

"بھا! تو برج لال کی گدی پر بیٹھنے کو تیار ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں! ہاں!"

"تجھے یہ پروانہ کیسے ملا؟"

"لائل پور سے واپسی پر میں سیالکوٹ میں اُترا تو مجھے یکایک دکان کا خیال آگیا۔ مجھے دکان وکان کی خواہش تو نہیں تھی ماجھے! مجھے چودھری سے بھی کوئی بیر نہیں ہے پر میں چک مراد سے اپنا تعلق نہیں توڑنا چاہتا۔"

"بھا! آج کل کے افسر کتنے اچھے ہیں! تحصیل دار نے تیری بات سن لی اور پروانہ بھی لکھ دیا۔"

"نہیں ماجھے! ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ تحصیل میں ایک چپڑاسی مل گیا جو میرے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس کی کوشش سے پروانہ ملا۔"

"تو اب تم دکان پر بیٹھو گے نا؟"

"ہاں ہاں بیٹھوں گا۔" بھا نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"پر تم خوش معلوم نہیں ہوتے۔"

"نہیں---- نہیں---- میں خوش ہوں۔ بڑا خوش ہوں۔ اس طرح میری جڑ چک

حمیداں وہاں کب آئی؟ میں نہیں جانتا۔ وہ ہجوم میں تو نظر نہیں آئی تھی۔ یوں بھی اُس کا وہاں آنا ایک اچنبھے سے کم نہیں تھا' وہ چوہدری کی بیٹی تھی اور چوہدری اِس رسم میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اُس کی بیٹی کا اچانک دکان کے تھڑے پر آموجود ہونا لوگوں کی پہچان کو دھندلا نہ دیتا تو اور کیا ہوتا۔ حیران آنکھوں کے سامنے جو اپنی ہی حیرت کو دیکھتی ہیں' حقیقت دھندلا ہی جایا کرتی ہے۔ اُس نے مٹھی میں بند چاندی کا ایک روپیہ بھا کے سامنے پھینک کر کہا "مجھے سودا دو۔" اور تب وہ شرما گئی۔ سنولاہٹ میں خون کی اُجلی اُجلی سُرخی تیرنے لگی۔ بھا کچھ دیر ٹھٹکا سا رہا۔ وہ جھکی جھکی آنکھوں سے اپنے سامنے پڑے روپے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ڈوبی ڈوبی آواز میں پوچھا "کیا دوں؟"

"جو کچھ چاہو دے دو۔"

بھا نے بڑی بے بسی سے حمیداں کی طرف دیکھ کر کہا "کتنے کا سودا دوں؟"

"جتنے کا جی چاہے۔"

اُس وقت میرا باپ بھا کے آڑے آیا۔

اُس نے کہا "اسلم بیٹا! حمیداں جیسی سگھڑ بیٹیوں کو کشیدہ کاری کا شوق ہوتا ہے۔ اسے رنگین دھاگے کے لچھے گن دو۔"

بھا نے مختلف رنگوں کے دس بارہ لچھے ایک ڈبے سے نکالے اور حمیداں کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ حمیداں نے کانپتے ہاتھوں سے لچھے لئے اور لوگوں کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ اُس کی بھیگی بھیگی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

بابا حیات نے کہا "بیٹی! تو بھاگوان ہے۔ آخر بڑے گھر کی بیٹی ہو نا! نصیبوں والے لوگ پتھر کو بھی چھو لیں تو وہ سونا بن جاتا ہے۔ اسلم بیٹا! تو بڑا خوش قسمت ہے۔ تیری دکان خوب چلے گی۔"

"آمین!" مولوی صاحب نے کہا۔

دو چار لوگوں نے سودا لیا تو بھیڑ چھٹ گئی۔ میں اور بھا اکیلے رہ گئے۔ اس نے کہا "ماہنے! تو نے مجھے کسان سے دکاندار بنا دیا۔"

"بھا! اب اس بہانے تو یہاں رہے گا۔ تیری وجہ سے گاؤں میں رونق رہے گی۔"

"ہاں ہاں! رونق رہے گی پر میری وجہ سے سارے گاؤں نے چوہدری کی دشمنی بھی

تو مول لے لی ہے۔ دکان پر گاؤں کی لڑکیاں بھی آئیں گی اور لڑکے بھی۔ چوہدری کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مجھے تنگ کرتا رہے گا۔۔۔ اور حمیداں نے سودا لینے میں پہل کر کے مجھے تو اور بھی ڈرا دیا ہے ماہنے!"

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے بھلا؟"

"چوہدری کی بیٹی نے اُس کے حکم کی نافرمانی کی ہے ماہنے!"

"کچھ نہیں ہو گا بھا! تو وہم نہ کر۔"

بھا کچھ کہنے والا تھا کہ ماسی ریشم دکان کے تھڑے پر آ کر کھڑی ہوئی۔ میں اُسے دیکھ کر مسکرانے لگا تو اُس نے مجھے ڈانٹ کر کہا "تو کیوں دانت نکال رہا ہے ماہنے؟"

"تجھے دیکھ کر ماسی!"

"مجھے دیکھ کر؟ کیوں میں کوئی تماشا ہوں؟"

"نہیں تو ماسی! یہ بات نہیں۔ تو دکان کے تھڑے پر یوں حیران پریشان کھڑی ہو گئی جیسے۔۔۔"

"ماہنے! اِس گدی پر برجا کھتری بیٹھتا تھا۔ اُس پر اِس مہاجر لڑکے کا بیٹھنا کچھ اچرج سی بات نہیں؟"

"ماسی! جب دکان کھلی تھی' تو اُس وقت کہاں تھی؟"

"یہیں گاؤں میں۔۔۔ تم نے مجھے کون سا بلاوا بھیجا تھا؟"

"بلاوا تو کسی کو نہیں بھیجا تھا ماسی۔"

"تیرا نام کیا ہے لڑکے؟"

"میرا نام پوچھ کر کیا کرو گی ماسی؟" بھا نے مسکرا کر کہا۔

ماسی نے زیرِ لب کہا "تو نے گاؤں میں ہٹی ڈال کر اچھا نہیں کیا۔"

"کیوں ماسی؟" میری آواز میں غصے کی چمک تھی۔

"موج دین کے بیٹے! تو نہ بول۔ میں تیرے ساتھ بات نہیں کر رہی۔ تو میری بات نہیں سمجھے گا۔ مہاجر لڑکے! تو میری بات سمجھ رہا ہے نا؟"

بھا اپنے آپ میں گم ہو گیا۔

میں پھر بول اٹھا "ماسی! کوئی بات کھول کر بھی تو کرو۔"

اب ماسی نے میری بات کا غصہ نہ کیا۔ اُس نے ڈوبی ڈوبی آواز میں کہا "میں نے جو کچھ کہنا تھا، کہہ دیا ہے ماہنے!"

ماسی کے جانے کے بعد میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "پگلی"۔ بھا نے میرے قہقہے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ میں بھا سے رخصت ہو کر کنویں کی طرف جا رہا تھا تو ایک موڑ پر میرے خیالوں میں ایک کرن سی چمکی۔

"بھا اب کنویں سے گاؤں پہنچ چکا ہے۔" میں نے سوچا۔

"کنویں اور گاؤں کے درمیان کوئی چناب تو حائل نہیں؟" میری سوچ کی دوسری لہر نے جواب دیا۔

پر مجھے یوں لگا جیسے تخت ہزارے کا رانجھا چناب پار کر کے ہیر کی بستی میں پہنچ گیا ہو اور میں کانپ گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۹

○

گندم کی فصل کٹنے کے بعد چار کھونٹ ویرانی سی چھا جاتی ہے۔ چلچلاتی دھوپ کا لہریا دُور دُور تک ننگے بچے کھیتوں کی عریانی کو ڈھانپنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہراتی بل کھاتی دھوپ میں مہین دھول کا غبار ہلکا سا رہتا ہے۔ کٹے ہوئے کھیتوں کا سلسلہ دُور تک چلا جاتا ہے اور اُن سے پرے نیلے پہاڑ دُور سے دُور تر ہو کر دُھندلے سے ہیولوں میں بدل جاتے ہیں۔ اُس وقت جی پر ایک بوجھ سا آن گرتا ہے۔ ہلکا ہلکا دکھ۔۔۔۔ دھوپ اور لُو سے جُھلسا جُھلسا سا دکھ۔ شفتل کے پھولوں کی طرح جو کھلتے ہی مُرجھا جاتے ہیں اور روں روں چلتے کنویں سے نکلنے والی پانی کی پتلی سی دھار اُن کی پیاس نہیں بجھا سکتی اور جب بھر دوپہر کو اُن پھولوں کی مُرجھائی ہوئی خوشبو دھوپ کے لہریے اور پانی لگی کھیت کی گیلی مٹی کی عرق آلود بھاپ میں رچ کر کنویں کے گرد تھکا تھکا سا ناچ کرتی ہے، تو یوں لگتا ہے جیسے زندگی کی تازگی اور نمی دم توڑ رہی ہے اور دھرتی بانجھ ہو رہی ہے۔ تب کسان کی آنکھیں گرد آلود آسمان سے پانی کی بھیک مانگنے لگتی ہے۔

اس سال گرمی تھی بھی بہت سخت اور لُو لگنے سے دل جھلس سے گئے تھے۔ میں اکثر کنویں پر رہتا پر سہ پہر کو گاؤں ضرور آتا۔ بھا اسلم کی دکان کے تھڑے پر پانی چھڑکتا اور جب مٹی سے جلی ہوئی خوشبو اٹھتی تو بوری کا ایک ٹکڑا بچھا کر بیٹھ جاتا۔

بھا کہتا "ماہنے! تم لوگوں نے مل کر مجھے قیدی بنا دیا ہے۔"

"کس کا قیدی؟" میں پوچھتا۔

"گاؤں کا قیدی۔۔۔ ماہنے! گاؤں میں میرا جی نہیں لگتا۔"

"کنویں پر لُو چلتی ہے اور دھوپ لہراتی ہے تو جی بجھ جاتے ہیں۔"

"وہاں جی گھٹتے تو نہیں ماہنے! یہاں تو میرا جی گھٹتا رہتا ہے۔"

"دوپہر کنویں پر گزار لیا کرو بھا!"

جب گلی سے دھوپ اٹھ کر مکانوں کی دیواروں پر سے رینگتی ہوئی چھتوں پر جا چڑھتی تو گاؤں جاگ اٹھتا۔ بھا کی دکان پر اکّا دکا گاہک آنے لگتے۔ ان میں زیادہ تر گاؤں کے بچے بچیاں ہوتیں۔ وہ جھولی میں گندم لے کر آتے۔ بھا ان کا وزن کر کے قیمت لگا، پھر گڑ، مرچ، تیل وغیرہ انہیں دیتا۔ دکان کے ایک کونے میں گندم کی ڈھیری آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ بھا کے گلے میں پیسوں، آنوں، دوّنیوں اور چونیوں کے سکوں میں کبھی کبھار کوئی چونّا ہوتا تو میں چونک اٹھتا۔ میں گلے کی طرف دیکھتا تو بھا کہتا "ماہنے خوش ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ابھی اسلم جاٹ سے سیٹھ اسلم بننے میں بہت وقت لگے گا۔"

دکان گاؤں کے مغربی کونے میں واقع تھی۔ یہاں مشرق کی طرف سے آنے والی گاؤں کی سب سے بڑی گلی ختم ہو جاتی تھی۔ مشرق کی طرف سے دیہات سے آنے والے راہی اسی گلی میں سے گزر کر اس تنگ سی سڑک پر آتے تھے، جو کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی شہر کی طرف جانے والی پکی سڑک سے جا ملتی تھی۔ اس تنگ سڑک پر چھکڑوں اور یکوں کے گزرنے سے دو طرفہ لکیریں پڑ چکی تھیں جن کی دھول میں پہیے دھنس جاتے تھے۔ جب کوئی یکہ شہر سے آتا تو بھا کی دکان کے سامنے رکتا۔ کبھی کبھار کوئی راہی لیمپ اور تار کے دو چار سگریٹ خرید لیتا۔ ایک دن چوہدری بھی یکّے پر بیٹھ کر آیا اور بھا کی دکان کے سامنے اُترا تو میں بوری پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چوہدری کا چہرہ دُھول سے اَٹا ہوا تھا۔ اُس نے صافے سے منہ پونچھ کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"ماہنے! دکان خوب چل رہی ہے نا؟"

"جی ہاں!"

"سیٹھ جی کہاں ہیں؟" چوہدری نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

"دکان کے اندر ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ذرا باہر تو آؤ سیٹھ جی!" چوہدری نے آواز دی۔

بھا اسلم نے دکان سے باہر کر پوچھا "چوہدری جی! کوئی خدمت؟"

"نہیں ـــــ میں صرف اتنی بات پوچھتا ہوں۔ دکان چل رہی ہے نا؟"

"جی ہاں! خدا کے فضل سے ـــــ ٹھنڈا پانی پلاؤں۔"

"صرف ٹھنڈا پانی! جب برج لال اس گدی پر بیٹھتا تھا تو وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا اور جب تک شربت پانی نہ پلا لیتا، مجھے گھر نہ جانے دیتا۔ کیا دن تھے وہ؟"

چوہدری نے آہ بھری تو بھا مسکرانے لگا۔

"تم کیوں مسکرائے جوان؟"

"شربت کا ایک گلاس پلا کر، وہ آپ سے سارے گاؤں کو لوٹنے کی اجازت بھی حاصل کر لیتا ہو گا۔"

"نہیں ـــــ اسے دکانداری کرنی آتی تھی ـــــ مسلمان کو ہٹی چلانے کا گُر کبھی نہیں آئے گا اور پھر ایک جاٹ کو! ـــــ نہیں ـــــ زمانے بدل گئے ہیں ـــــ جاٹ کبھی اس گدّی پر نہ بیٹھتا۔ تُو جاٹ ہو کر اس میں اپنی ہتک محسوس نہیں کرتا جوان؟"

"نہیں تو چوہدری۔"

"پھر مجھے تمہارے جاٹ ہونے میں شک ہے۔" چوہدری نے مسکرا کر کہا۔

"چوہدری جی! آپ مجھے کچھ سمجھ لیں جاٹ یا بنیا پر میں برج لال نہیں بنوں گا۔"

"کیوں؟" چوہدری نے پوچھا۔

بھا نے چوہدری کے سوال کا جواب نہ دیا۔ وہ بھنچے ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے خاموش رہا۔ چوہدری جانے ہی والا تھا کہ گاؤں کی طرف سے آنے والی گلی کے ایک موڑ سے نیداں نکل کر ہمارے سامنے یوں آ کھڑی ہوئی جیسے وہ آسمان سے ٹپک پڑی ہو۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُسے دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بھا اسلم بھی بھونچکا سا ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔ اُس نے کہا "ہٹی والے ریشم کے لچھے ہیں؟" اور اُس کی نگاہ اچانک چوہدری پر پڑ گئی تو اُس کے چہرے کی سنولاہٹ یکدم پھیکی پڑ گئی اور کھلے ہوئے ہونٹوں پر آنے والے لفظ کانپ کر دم توڑ گئے۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ کلی کلی بے جن پتیوں سے دیے بجھ گئے۔ چوہدری اُسے چند لمحوں تک غور سے دیکھتا رہا۔ میں نے سمجھا جیسے ان لمحوں میں صدیاں بیت گئی ہوں۔ تب چوہدری کی آواز میری کان میں یوں آئی جیسے پاتال سے نکلی ہو "نیداں!"

"جی!"

"کیا لینے آئی ہو؟"

"ریشم کے لچھے۔"

"جب میں شہر گیا تھا تو مجھے کیوں نہ کہا؟"

"یاد نہ رہا تھا۔"

"چلو گھر چلیں۔"

چوہدری حیداں کو لے کر گلی کا وہ موڑ مڑ گیا جس سے حیداں تیر کی طرح نکل تھی۔ ابھی بیر بیلے میں پہنچی بھی نہ تھی کہ کیدو نے اس کا رستہ کاٹ لیا!

"اب کیا ہو گا؟" میں نے سوچا۔

بیلے پر اندھیری رات کے کالے پنکھ پھڑ پھڑا رہے تھے اور بجھے ہوئے ستاروں کی راکھ بکھر گئی تھی۔

پر ابھی سہ پہر کے ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنوں میں تیز چمک بھی تھی اور گرمی بھی میں نے کنویں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر پہلا قدم رکھا تو نجانے کیوں مجھے محسوس ہوا جیسے شیماں میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہو۔ میں حیران تھا کہ اس موقعے پر مجھے شیماں کیوں یاد آئی۔ میں تو اسے گزرے ہوئے کئی دنوں سے بھول چکا تھا۔ میں نے اپنے من میں جھانکا تو اسے شیماں کے وجود سے لبالب بھرا ہوا دیکھا۔ تب میرا وجود بکھر کر میری حیرت کے غبار میں گم ہو گیا۔ غبار چھٹا تو مجھے یوں لگا جیسے پگڈنڈی کے ایک موڑ پر میرا وجود دو سایوں میں بٹ گیا ہو یا میرے وجود کا ایک پر تو مجھ سے الگ ہو کر شیماں کی گلی کی طرف چلا گیا ہو اور دوسرا پر تو اس کنویں کی طرف جا رہا ہو جہاں مویشی میرا انتظار کر رہے تھے کہ کب چارا ان کی ناند میں ڈالوں اور وہ شکر مندانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ کر کہیں "تم بے زبانوں کا کتنا خیال رکھتے ہو۔" پگڈنڈی کے ایک اور موڑ پر اچانک دونوں سائے ایک ہی وجود میں اکٹھے ہو گئے تو مجھے عجیب سا اطمینان ملا جیسے میں بکھرنے اور ٹوٹنے سے بچ گیا ہوں اور میں رانجھا ہی رہا ہوں اور رانجھا بن کر چناب کی لہروں کی نذر نہیں ہوا ہوں۔

شفتل کے کھیت سے دو چار پولے کاٹ کر جب میں ٹوکے پر آیا تو میرے باپ نے بجھی بجھی آواز میں کہا "ماہنے! سکول میں پھر نام لکھوا لو اپنا۔"

"کیوں ابا؟"

"میں چار کھیتوں کی کاشت میں اکیلا بھی کر سکتا ہوں تجھے خواہ مخواہ کیوں اپنے ساتھ

باندھ رکھوں؟"

باپ کی بات سن کر تھوڑا سا بے چین ضرور ہوا۔ میں نے ٹوکے کی دستی پر مٹھیاں جمائیں تو ٹوکہ گھومنے لگا۔ شفتل کا چارہ کترنے میں زور نہیں لگتا۔ نرم نرم پولے ٹوکے کے تیز پھلوں کے سامنے آتے ہی پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ میں نے انہیں بھوسے میں ملایا اور ناند میں ڈال دیا۔ تب تک میری بے چینی جاتی رہی تھی۔ میں نے باپ سے کہا "بابا! میں سکول سے جلد آ جایا کروں گا۔ میں تجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔"

دوسرے دن جب میں دو مہینوں کی غیر حاضری کے بعد سکول پہنچا تو میری جماعت کے منشی جی بہت خوش ہوئے۔ ان کی مہربانی سے میرا نام ابھی تک رجسٹر میں موجود تھا۔ سلی نے مجھے دیکھا تو حیران ہوا۔ اس نے پوچھا "ماہنے! سرٹیفکیٹ لینے آئے ہو؟"

"نہیں تو ــــ میں پڑھنے آیا ہوں۔"

"معلوم ہوتا ہے تمہاری دکان چل نکلی ہے؟"

"دکان ہماری نہیں۔ بھا اسلم کی ہے۔"

"پھر کتابوں اور فیسوں کے لئے پیسے کہاں سے لاؤ گے؟"

"اللہ دے گا۔"

"آسمان سے برسائے گا؟"

"ہاں! ہاں!"

سلی ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی میں وہی طنز تھی جو چوہدری کی مسکراہٹ میں تھی۔

"تم ہنستے کیوں ہو سلی؟" میں نے پوچھا۔

"میں سوچتا ہوں ماہنے! تم آٹھویں جماعت پاس کر بھی گئے' تو اس کا کیا فائدہ ہو گا؟"

"میں پٹواری تو لگ ہی جاؤں گا۔"

"پٹواری!" سلی نے غرور سے منہ پھلا کر کہا "ابا سے بگاڑ کر بھی پٹواری لگ جاؤ گے؟"

"میں نے تمہارے ابا سے کوئی بگاڑ نہیں کیا۔"

"نہیں کیا؟ تم نے اس مہاجر لڑکے کو شہ دے کر دکان الاٹ نہیں کروائی؟"

"دُکان ہماری نہیں سَتّی' بھا اسلم کی ہے۔ تم لوگ تو خواہ مخواہ ہمارے دشمن بن گئے ہو۔"

اتنے میں ایک لڑکے نے کہا ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے دفتر میں بلا رہے ہیں۔ میں بھاگم بھاگ دفتر میں پہنچا تو وہ بولے۔ "میں نے تمہاری فیس معاف کر دی ہے۔ دو چار آنے چندے کے تو دے سکو گے نا؟"

"جی ہاں"

"کچھ پُرانی کتابیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔ دیکھو! اب سکول نہ چھوڑنا۔"

"جی نہیں چھوڑوں گا۔"

کتب میرے ہاتھ میں آئی تو میرا سینہ دُھل سا گیا۔ سَتّی کی باتوں کا زہر میری رگ رگ سے خارج ہو گیا۔ غریبی کا دکھ بھی زنگ کی طرح اُتر گیا۔ ایک ہی دن میں میری کایا پلٹ گئی۔ کتب اکسیر ہے' کتنی بیماریوں کا علاج اس کے ہاتھ میں ہے۔

اس دوپہر کو میں درختوں کے سمٹے ہوئے سایوں کے ساتھ لگ لگ کر گھر پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے ایک مدت کے بعد میں پھر گاؤں کی گلیوں کا محرم بنا ہوں۔ روٹی کھا کر میں ذری بھر کو دکان پر گیا۔ بھا اسلم میرے ہاتھ میں بستہ دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ میں اس کے پاس چند لمحوں کے لئے رُکا اور کنویں کی طرف چل پڑا۔ اس دوپہر کنویں پر سایہ کرنے والے درختوں کی چھاؤں میں میں تھکے ہوئے مسافر کی طرح بیٹھا ہی تھا کہ دوپہر گزر گئی اور سفر کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ میں نے چارا وارا بنایا تو میرے باپ نے کہا "اب سکول کا کام کر لو۔" میں نے شام کا اندھیرا چھا جانے سے پہلے پہلے کام ختم کر لیا اور بستہ بغل میں داب کر گاؤں کا رُخ کر لیا۔

گزرے ہوئے دو تین مہینوں میں میری راتیں کھلے کھیتوں میں بسر ہوتی رہیں۔ آج جب میں نے چارپائی گھر کی چھت پر بچھائی تو گاؤں کی گھٹن سے میرا جی گھبرانے لگا۔ میں نے آسمان پر آنکھیں لگا دیں۔ تاروں کی چمک میں کھو کر میرا جی ذرا سا بہلا تو مجھے نیند آ گئی۔ اگر مجھے صبح سویرے گھر سے روٹی کھا کر سکول نہ جانا ہوتا تو میں کنویں سے گاؤں میں نہ آتا پر اب میں مجبور تھا۔

مجھے یاد ہے اس سال اساتذہ کی ...

ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ میں دوپہر کی تیز دھوپ اور لو میں گھر آتا تو میرے جسم کی تپی زمین دھرتی کی طرح سوکھ جاتی تھی۔ سلی میرا ساتھ نہ دیتا۔ وہ دوپہر سیدپور کے ذیلدار کے ہاں گزارتا۔ صبح گھر سے سکول جاتے وقت بھی وہ سائیکل کی گھنٹی بجا کر میرے پاس سے گزر جاتا۔ وہ میرے بعد گھر سے نکلتا اور مجھ سے پہلے سکول پہنچ جاتا۔ ایک دن جب رات ہی سے ہوا میں گھٹن اور حبس تھی اور صبح بھی خنکی پیدا نہ ہوئی تھی اور میں اس کے باوجود اس امید پر خوش تھا کہ اب پروا چلے گی اور پھر نہ جانے کیوں پورب کی بجائے پچھم سے گرجتے برستے بادل آئیں گے اور تڑتڑ اساڑھ کا پہل چھلا برسے گا' سلی نے گھنٹی بجائی اور میرے قریب آ کر سائیکل سے اتر گیا۔ چند قدم ہم چپ چاپ چلتے رہے' پھر اس نے کہا

"ماجے!"

"ہوں" میں نے جواب دیا۔

"تم کبھی شیماں سے ملے؟"

شیماں کا نام اچانک سن کر میرے جسم میں تھرتھری سی پیدا ہوئی۔

"نہیں--- کٹائی سے لے کر اب تک میں--- پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کٹائی کے دنوں میں جھنڈو کے ساتھ وہ ہمارے کھیتوں میں سلا چگتی رہی تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟ تمہارے کھیت زیادہ تھے۔ وہ وہاں چلی گئی--- پار سال وہ---"

سلی نے میری بات کاٹ لی۔

"ایک شام کھلیان کی اوٹ میں کھڑے ہو کر میں نے اس سے باتیں کی تھیں۔"

"باتیں؟" میں نے پوچھا "کون سی باتیں؟"

میں نے اسے کہا تھا "شیماں! ہمارے کھیتوں سے تم ہر روز سلا چگ سکتی ہو۔ تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔"

میں بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تو سلی سٹپٹا گیا۔ اس نے پوچھا "تم ہنستے کیوں ہو ماجے؟"

"تمہاری حماقت پر--- سلی! گرا پڑا سٹا کسان کا نہیں ہوتا۔ اسے جو بھی چگ لے' وہ اسی کا ہوتا ہے۔"

"پر وہ کھیت تو ہمارے تھے نا؟" سلی نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

"ٹھیک ہے ـــــ تو شیماں بڑی خوش ہوئی ہو گی تمہاری بات سن کر؟"

"نہیں تو ماہنے!" سلی نے منہ لٹکا کر کہا "اس نے مجھ سے ٹھیک سے بات بھی نہ کی۔ اس نے پوچھا ماسی جھنڈو کہاں ہے۔ میں نے کہا یہیں کہیں ہو گی۔ وہ چپکے سے وہاں سے کھسک گئی۔"

"بس اتنی سی باتیں ہوئیں؟"

"ماہنے! میں نے جب بھی اُسے دیکھا‘ وہ چپ چاپ سی نظر آئی۔"

"وہ بیچاری غم کی ماری بلبل کی طرح کیسے چہکتی رہے۔ جھنڈو بھی تو اس سے اچھا سلوک نہیں کرتی۔"

"پر ماہنے! میرا تو جی چاہتا ہے‘ وہ مجھ سے کوئی بات کرے۔"

"وہ کیوں کرے تجھ سے بات سلی؟"

"کیوں کرے؟ میں نہیں جانتا۔ میرا جی چاہتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے ابا نے اس سال دینے مستری کو دو من گندم اس لئے زیادہ دی کہ شیماں اُس کے گھر رہتی ہے۔"

"چوہدری بڑا سخی ہے پر اُس کی سخاوت کے بدلے میں تم شیماں سے باتیں کرنا چاہتے ہو؟"

"ماہنے! اُس نے میرے کان کے قریب منہ لا کر کہا "ایک بات سنو گے؟"

"ہاں!"

"ہاں کہو۔"

"اس عمر میں جس میں میں اور تو ہیں‘ کسی سے پیار بھی تو ہو جاتا ہے نا؟"

"پیار! شیماں سے؟" میں نے بے خیالی میں پوچھا۔

"ہاں! ہاں! ماہنے! مجھے شیماں سے پیار ہے۔" اُس نے آہ بھر کر کہا۔

میں اب بھی حیران ہوں کہ سلی کی اس بات پر کیوں نہ چونکا۔ مجھے اس کی بات پر ہنسی بھی نہ آئی۔ مجھے غصہ بھی نہ آیا۔

عجیب بات ہے کہ اس لمحے "شیماں" مجھے یوں نظر آئی جیسے چناب کے دوسرے کنارے پر کھڑی کسی کا انتظار کر رہی ہو اور میں اور سلی اس کنارے پر چناب کی بپھری ہوئی لہروں سے ڈر رہے ہوں اور سوچ رہے ہوں کہ کون مچلتی لہروں کی گود میں پہلے گرے اور

کون منجدھار میں ڈوبے اور کون دوسرے کنارے جا کر شیماں کے پیار کا پلو اپنے ہاتھ میں تھام لے۔ اس لئے میں نے سلی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ یوں بھی اسی لمحے سلی میرے لئے سلی نہیں رہا تھا۔ وہ میرا دشمن تھا نہ دوست اور اس لمحے ماہنے سے بھی میرا تعلق ٹوٹ گیا تھا۔

اور اُس دن جھومتے جھامتے بادل آئے۔ موٹی موٹی بوندیں تڑتڑ برسیں تو مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھی اور میرے من میں رچ گئی۔ پھر موسلا دھار بارش ہوئی اور بادل برس کر تھک بھی گیا اور بھیگی بھیگی سہ پہر کو ڈھلی ڈھلی دھوپ اور نم آلود گرمی نے ایک نیا روپ دیا تو میں کنویں سے گاؤں میں آیا۔

وہ مجھے گلی میں نظر آئی۔ اس کے سر پر اپلوں کا ٹوکرا تھا۔ دوپٹے کا اس نے پٹوں بنا لیا تھا۔ اُپلوں کے ٹوکرے تلے کا چہرہ مجھے بڑا مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔ بچپن میں اس چہرے کو دیکھ کر میں ہنس دیا کرتا تھا۔ ذرا پچکا ہوا چہرہ۔ بھنوؤں تلے دبی ہوئی آنکھیں پیشانی پر سلوٹیں اور گرمی ہو تو بھیگا ہوا چہرہ یوں کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے "میرے سر سے اپلوں کا ٹوکرا اتار لو۔ میں اس کے بوجھ تلے پس گیا ہوں۔" حالانکہ اپلوں کا کوئی زیادہ بوجھ بھی نہیں ہوتا۔

اس دن شیماں کے چہرے پر اساڑھ کی پہلی بارش کی نمی دیکھ کر میرا جی نرم ہو گیا جیسے یہ نمی اس میں رچے گی تو اس زمین میں پیار کی کھیتی اگ آئے گی۔ میں تیز تیز قدم بڑھا کر اس کے پہلو میں پہنچا تو تنگ گلی کی دیواروں نے ذرا سا سمٹ کر مجھ سے بڑی پیاری سی شرارت کی۔ میرا وجود شیماں کے وجود سے چھُو گیا اور میرا جسم بے اختیار پکار اٹھا۔ "شیماں!" پر شیماں کے وجود نے میری آواز نہ سنی۔ تنگ بھیگی ہوئی گلی میری آواز کو یوں چوس گئی جیسے وہ سیاہی چوس کا ٹکڑا ہو اور میری آواز کا لفظ جسم کے کاغذ سے اُتر کر اس میں جذب ہو گیا ہو۔ دوسری پکار پر میں مَیں نہیں تھا‘ کوئی اور تھا جو چناب کے دوسرے کنارے پر کھڑا تھا۔ اس وقت شیماں بولی۔ "ماہنے! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"مجھے تم سے پیار ہے شیماں!"

یہ پھر میری آواز نہیں تھی کیونکہ بہت دُور سے آئی تھی پر اس آواز سے گلی گونج اٹھی تھی اور سارے گاؤں کی دیواروں سے اس کی گونج لوٹ لوٹ کر آئی تھی لیکن شیماں نے اس آواز کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ جھنڈو کے گھر کی طرف جانے والی گلی میں مُڑ گئی اور

میں اس موڑ پر حیران پریشان کھڑا ہو گیا اور کھڑے کا کھڑا رہتا جو ماسی ریشم میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نہ پوچھتی کہ ماجھے یہاں کیوں کھڑے ہوں۔ میں اس کی طرف بٹ بٹ تکنے لگا تو وہ جھنجلا کر بولی۔ "میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ کچھ منہ سے بھی پھوٹو۔" میں نے سوچا جس آواز کی گونج سے گلیوں کے در و دیوار ہل گئے تھے' وہ ماسی کے کان میں کیوں نہ پہنچی۔ تب ایک جھٹکا سا لگا اور میں جاگ اٹھا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ آواز جو میں نے سنی تھی' میرے ہونٹوں کے پنجرے سے باہر نہیں آئی تھی' وہ تو کسی اور کے ہونٹوں پر آ کر لفظوں کی گونج میں ڈھلی تھی اور وہ میں نہیں تھا کوئی اور تھا۔ میں تو ابھی چناب کے دوسرے کنارے پر کھڑا تھا۔

"کچھ بھی تو نہیں ماسی!" میں نے کہا۔

"ماجھے! سچی بات کرو۔"

"سچ ماسی! کوئی بات نہیں۔"

"میں نے ابھی ابھی جس لڑکی کو دوسری گلی میں مُڑتے دیکھا تھا' وہ شیماں تھی نا؟"

"ہاں ماسی وہ شیماں ہی تھی۔"

"تم نے شیماں سے کیا کہا؟"

"کچھ بھی نہیں پر ماسی! میں کچھ کہنا ضرور چاہتا تھا۔"

"نہ کہو تو اچھا ہے۔"

"کیوں؟"

"میں نہیں جانتی۔ وہ بیچاری لڑکی یتیم بھی ہے اور بے آسرا بھی۔ اس کے کان میں کوئی ایسی ویسی بات نہ ڈالنا ماجھے!"

"ماسی! جو سلّی نے پہل کر لی تو کیا ہو گا؟"

"سلّی کا نام سن کر ماسی ریشم کو غصہ آ گیا۔ اس کے اُوپر کے ہونٹ پر تل چاولے روئیں کانپنے لگے۔ میں ڈر گیا۔"

ماسی نے میرے بازو کو زور سے دبا کر کہا "کیا کہا؟ سُلّی نے۔"

"ماسی! تمہیں اتنا غصہ کیوں آ گیا؟" میں نے بازو کو شکنجے میں کسا محسوس کر کے پوچھا۔

"بدمعاش باپ کا بدمعاش بیٹا!"

"کون؟"

"میں بیچاری لڑکی سے ملوں گی اور اُسے خبردار کر دوں گی۔ مجھے اب تیری طرف سے کوئی ڈر نہیں ماجھے! تیرا باپ شریف ہے۔ اس نے کبھی دوسروں کی بہو بیٹیوں کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔۔۔ مجھے سلّی سے ڈر ہے۔"

اس سے اگلے دن سکول جاتے ہوئے سلّی نے رستے میں مجھے آ لیا۔ وہ سائیکل سے اُتر کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے بات کرنے میں پہل نہ کی تو وہ بولا "ماجھے! کل شیماں ہمارے گھر آئی تھی۔"

"تمہارے گھر کیوں؟"

"کل دوپہر کے بعد۔ جھنڈو اس کے ساتھ تھی۔"

"وہ کیوں آئی؟"

"اماں نے اُنہیں بلایا تھا۔ بھڑولوں میں اناج بھرنے کے لئے۔"

"یہ کون سی ایسی بات تھی جو تم مجھے سنانے کے لئے سائیکل سے اُتر پڑے۔"

"بات تو آگے آئے گی۔ تم نے مجھے رستے ہی میں ٹوک دیا۔"

"کہو۔"

"جب میری اماں' جیداں اور جھنڈو اناج والی کوٹھڑی میں تھیں اور شیماں باہر صحن میں بھڑولوں کو بند کرنے کے لئے مٹی گوندھ رہی تھی تو میں اُس کے قریب چلا گیا پر یار وہ ڈر کیوں گئی؟"

"کس سے؟"

"مجھ سے۔ وہ مجھے دیکھ کر کبوتر کی طرح سہم گئی تھی۔ ماجھے اُس کی آنکھیں کتنی کالی ہیں!"

"بس جانے دو سُلّی۔" میرا جی یکایک بیٹھ سا گیا۔

"پوری بات تو سن لو ماجھے!"

"نہیں۔۔۔ میں نہیں سنوں گا۔"

"میں تو سنا کر رہوں گا۔" سلّی نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

میں تیز تیز قدم بڑھا کر اس سے آگے نکل گیا۔

اُس نے اونچی آواز کے ساتھ میرا پیچھا کیا۔ "ماہنے! میں نے آگے بڑھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ بازو کتنا نرم تھا۔ آہ! مکھن کی طرح گدگدا۔۔۔"

"بدمعاش باپ کا بدمعاش بیٹا۔" میں نے رک کر کہا۔

"کون؟" سلی نے پوچھا۔

"تم!"

"سلی دم بخود رہ گیا۔ کچھ عرصہ ہم ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر اس نے دھیمے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے مجھے گالی دی ماہنے؟"

میں نے ہاں میں سر ہلا دیا تو اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔

"مم۔۔۔ مم۔۔۔ ماہنے! شیماں تیری ماں لگتی ہے یا بہن؟" اُس نے غصے میں تتلاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں پَر وہ میرے گاؤں کی ایک بیٹی ہے جس طرح تیری بہن حمیداں۔" میں نے غصہ پی کر کہا۔

"تو پھر کان کھول کر سن لے ماہنے! میں نے جب تیرے گاؤں کی بیٹی کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ مٹی گوندھتے گوندھتے مسکرائی تھی۔"

"بس سلی! اب تو نے ایک لفظ اور کہا تو۔۔۔"

"کیا کر لو گے؟ مجھے مار ڈالو گے؟ آؤ مجھے ہاتھ لگا کر دیکھو۔" اس نے پیڈل پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اچک کر کاٹھی پر جا بیٹھا۔ مجھ سے دو چار قدم دُور جا کر اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ پھر میری طرف منہ موڑ کر کہا "ماہنے! مرد لوگ اسی طرح پہل کرتے ہیں۔ پکے ہوئے پھل کو دور سے لالچی نگاہ کے ساتھ دیکھنے سے خود بخود منہ میں نہیں آ گرتا۔ اس کے لئے ہاتھ بڑھانا ہی پڑتا ہے۔"

میں اس دن سکول میں گم سم رہا۔ اُس دوپہر کو ماسی ریشم سے بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ بھا اسلم سے میں اس قسم کی بات کیسے کرتا۔ وہ تو عمر میں مجھ سے بڑا تھا۔ میں ایک دھیمی دھیمی آگ میں جلتا رہا، سکول جاتا رہا، پڑھتا اور سوچتا رہا۔ تب برسات کا موسم آیا۔ چھٹیاں ہوئیں اور ایک دن جب میں بھا کی دکان میں بیٹھا کالے بھجنگ بادلوں کا نظارہ کر رہا

تھا تو تڑ تڑ بارش شروع ہو گئی۔ عین اس لمحے گلی میں شیماں نظر آئی۔ وہ دکان تک پہنچتے پہنچتے بھیگ چکی تھی۔

بھا نے کہا "اندر آ جاؤ لڑکی!"

وہ اندر آنے سے ہچکچائی تو بھا نے کہا "کیا لو گی؟"

"نمک اور تیل۔"

اس نے دہلیز کے اندر ایک قدم رکھ کر جھولی میں بھرے دانے بھا کی ترکڑی کے پتے میں ڈال دیئے۔ بھا نے جلدی جلدی قیمت لگا کر نمک اور تیل اُسے دے دیا۔ وہ بھیگتی ہوئی چلی گئی تو بھا نے پوچھا "یہ لڑکی اتنی ڈری سہمی کیوں نظر آتی ہے ماہنے؟"

"مجھے نہیں پتہ بھا۔"

"اس لڑکی کو اتنا شکل مند نہیں ہونا چاہیے تھا ماہنے!"

"کیوں بھا؟"

"بیچاری بے آسرا ہے، ماں نہ باپ، چاچا نہ ماموں۔ جس درخت کی حفاظت کے لئے کوئی مالی نہ ہو، جس کا جی چاہے اس کا پھل اُتار لیتا ہے۔"

"بھا اب کیا ہونا چاہیے؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں کیا بتاؤں؟ میں تمہارے گاؤں میں اجنبی ہوں نا!"

میں نے بھا کو سُلی والی بات نہ بتائی ورنہ وہ اور بھی دکھی ہو جاتا اور میرے بس میں کیا تھا؟ میں کیا کرتا؟ میں تو چناب کے دوسرے کنارے سے اسے پکارتا رہا تھا اور میری پکار ابھی اس کے کان میں نہیں پہنچی تھی کہ ماسی ریشم نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۱۰

○

کبھی کبھار گندم' مکی' جوار یا باجرے کے کھیت میں کوئی اجنبی سا پودا بھی اُگ آتا ہے۔

اس کا وجود ان سے الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ وہ کیوں اُگتا ہے؟ میں نہیں جانتا۔ پر مجھے اتنا پتا ہے کہ میں بھی تو اِسی قسم کا ایک پودا تھا۔۔۔ اجنبی سا۔۔۔ الگ تھلگ۔۔۔ اُس پودے کا بیج بھی اسی کھیت کی مٹی میں چھپا تھا۔۔۔ یہیں پھوٹا۔۔۔ کونپل بنا اور پروان چڑھا۔۔۔ پھر بھی وہ گندم' مکی' جوار یا باجرے کے عام پودوں سے الگ رہا۔ آخر کیوں؟

گاؤں میں میرے ہم عمر بہت سے لڑکے تھے۔ اُن کے نام میں نہیں لکھوں گا۔ میں اُن میں تھا اور اُن سے نہیں تھا۔ اُن سے کبھی کبھار گاؤں کی کسی گلی میں کنویں پر یا رستے میں ملاقات ہو جاتی' وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے اور کہتے "ماہنے! دو حرف کیا پڑھ گئے ہو کسی سے بات بھی نہیں کرتے۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں ایک ہی جواب دیتا۔

"سکّی تو خیر بڑے چوہدری کا بیٹا ہے' اس کے پاؤں زمین پر نہ بھی ٹکیں تو ٹھیک ہے لیکن تم تو۔۔۔"

"میں تمہیں سے ہوں۔" میں ہنستا۔ "تین کھیتوں کے مالک کسان کا بیٹا۔"

کبھی کبھار اُن میں سے کوئی لڑکا اپنی داستان عشق بھی سناتا۔

یہ داستان جو اکثر نگاہوں اور زبان تک محدود ہوتی' کسی پگڈنڈی کے جھکیے موڑ یا کسی کھیت کی اوٹ میں ماہیے کے کسی بول کی گنگناہٹ میں جنم لیتی اور ایک دو ملاقاتوں کے بعد کہاروں کے کندھوں پر جھولتی ہوئی ڈولی کے چیختے چلاتے ہلکوروں میں دم توڑ دیتی۔ ہیر نہ تو بابل کے حضور میں استغاثہ بلند کرتی' نہ قاضی سے سوال و جواب ہوتے' نہ کوئی رانجھا

ڈولی کا پیچھا کرتا' نہ کوئی منچلا مرزا اپنی صاحباں کو بکی پر بٹھا کر لے اڑتا۔ میرے چھوٹے سے گاؤں میں ہر غبار پر بڑا کڑا پہرہ تھا۔ ماں کا' باپ کا' بھائی کا' برادری میں ناک کٹ جانے کے ڈر کا۔ میرے گاؤں کی اکثر محبتیں دل اور ہونٹ سے آگے نہ بڑھتیں اور جب کوئی پیار اس حد کو پھلانگ جاتا اور بدن سے چھو کر بامراد ہو جاتا تو گاؤں میں زلزلہ آ جاتا اور میرے ہم عمر ساتھیوں میں سے کسی نے اِس حد کو نہ پھاندا تھا۔ پھر بھی گاؤں میں دو چار حادثے ہوئے تھے جن کی کڑوی یاد اب تک باقی تھی۔ ماسی ریشم کا خاوند ایک عورت کو لے بھاگا تو پھر اُس نے گاؤں کا منہ نہ دیکھا۔

اور میں تو چھوئی مُوئی کا پودا تھا۔

کوئی لڑکا شیماں کی بات مجھ سے کرتا تو میں اپنے آپ میں سمٹ جاتا اور مجھے غصّہ آتا کہ وہ پیار جو میرے من میں ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی بن کر بسا ہے' دوسروں کے ہونٹوں تک کیوں جا پہنچا۔ میں نے تو پیار کے اظہار کے لئے نہ ہیر رانجھا کا کوئی بیت گنگنایا تھا' نہ مرزا صاحباں کے کسی شعر کا سہارا لیا تھا۔ مجھے تو اس گھسے پٹے فقرے سے بھی نفرت تھی جو اکثر لڑکوں کی زبان پر تھا "سوہنیو! ہمیں بھی ایک نظر دیکھ لیجئے۔" یہ فقرہ میری جوانی کے زمانے میں بڑا مقبول تھا۔ اس سال گل بہار میں ایک شادی کے موقعے پر جالندھر سے نقلیے آئے تھے۔ یہ رہس ڈالتے تھے۔ انہوں نے ہیر رانجھا' سوہنی مہینوال اور مرزا صاحباں کے کھیل کھیلے۔ میں بھی ہر رات دیکھنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ ٹولے کا مسخرا آنکھ بھینچ کر یہ فقرہ کہتا تو ہم ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے پر رانجھے' مہینوال اور مرزے کی زبان پر یہ فقرہ نہیں آیا تھا۔ وہ تو اکثر شعروں میں بات کرتے تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں وہ رہس دھاریا کتنا بھلا لگتا تھا جس نے رانجھے' مہینوال اور مرزے کا روپ بھرا تھا۔ ہم لڑکوں نے چاہا تھا کہ ہمارے گاؤں میں بھی رہس پڑے اور رہس دھاریوں کے سردار نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں "سوہنا زینی" کا نیا کھیل دکھائے گا لیکن چوہدری نے مخالفت کی تھی۔ اُس نے کہا تھا "میں اپنے گاؤں میں پیار محبت کی لیلا نہیں رچانا چاہتا۔"

تب میں سوچ رہا تھا کہ پیار کے اظہار کے لئے کون سا لفظ ہے جو برکھا کی پہلی بوند کی طرح میرے من میں ٹپک جائے گا اور میں بھی کسی سے اپنے دل کی بات کہہ سکوں گا۔ میں سوچتا "یہ لفظ نرالا اور انوکھا ہونا چاہئے۔" پھر مجھے ماسی ریشم کی تنبیہ یاد آتی جس نے

میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور سولہویں سال کی کچی جوانی کو یہ بھی ڈر تھا' کہیں تتّی کوئی گھسا پٹا شعر پڑھ کر شیماں کے کان میں پیار کا جادو نہ پھونک دے اور میں چناب کے دوسرے کنارے پر کھڑا سُرسنگیت کے نکلنے کا انتظار کرتا رہوں۔

ایک دن جب میں کنویں سے گاؤں کی طرف آ رہا تھا تو ڈھلتے ہوئے دن کی دھوپ میں سایوں کی خنکی گھُل مل گئی تھی۔ یہ بھادوں کے مہینے کا ایک دن تھا۔ بھادوں کی کڑی دھوپ میں ہل چلانے والوں کے رنگ سنولا جاتے ہیں اور جگر میں گرمی بڑھ جاتی ہے پر چھاؤں میں ٹھنڈک ہوتی ہے اور بھیگی بھیگی دھرتی سے جو بھاپ اٹھتی ہے وہ بھی سایوں کی ٹھنڈک سے چھُو کر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہوا کے جھونکوں میں گرمی اور سردی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ناچ رہے ہوں۔ اُس دن صبح سویرے گرجتی برستی بھاگتی دوڑتی کالی گھٹا ذری بھر کو آسمان پر چھائی تھی اور ایک "سرلاٹا" ہوا تھا۔ پھر پُورب سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا تھا اور گھٹا پھٹ کر بکھر گئی تھی اور اب اُجلی سفید اُون کے گالے گرے آسمان پر تیر رہے تھے اور زمین پر دھوپ چھاؤں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف کملو کے اُونچے اُونچے کھیت تھے اور ہوا ان پودوں کو گدگدا رہی تھی اور بڑی پُراسرار آواز میں اِن سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ دھیمی' میٹھی' زیرِ لب سراسراہٹ میں پگڈنڈی کے ایک موڑ پر زمین کا ایک خالی ٹکڑا تھا۔ یہ ایک تکون سی تھی جس کے تینوں سروں پر کملو کے کھیت تھے۔ یہ ٹکڑا سبز گھاس سے ڈھکا ہوا تھا اور ابھی تک ہل کا پھالا یہاں نہیں لگا تھا۔ شیماں کھیت کی ایک مینڈھ پر بیٹھی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گوری کی رسّی تھی۔ گوری کھیت میں چَر رہی تھی۔ اب وہ پوری گائے بن چکی تھی۔ میں نے آج سے تین سال پہلے گوری کی جوانی کو جس منزل پر خیال ہی خیال میں دیکھا تھا' وہ منزل آ چکی تھی۔ گوری کے پُٹھے پنڈے پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ میں ایک دو لمحوں کے لئے پگڈنڈی پر ٹھٹکا۔ تب میں سبز گھاس کو روندتا ہوا شیماں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا اور شیماں یوں بیٹھی رہی جیسے اُس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ گوری نے گھاس کا ایک تنکا منہ میں لے کر سر اٹھایا اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"بڑی دیر بعد ملے ہو اور وہ بھی زندگی کے کس موڑ پر؟"

"گوری!" میں اپنی ہی دھیمی آواز کی اجنبیت پر حیران ہو گیا۔

شیماں نے اُداس اُداس آنکھوں سے مجھے دیکھا تو میں نے پوچھا "تم گوری کو چرانے کے لئے گاؤں سے اتنی دُور کیوں نکل آئی شیماں؟"

"تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"یونہی۔"

"ماسی جھنڈو کھیت کے اس پار گھاس کھود رہی ہے۔ اُس نے کہا تم اس کھیت میں گوری کو چراؤ۔"

وہ سائے کی طرح تمہارے ساتھ کیوں لگی رہتی ہے شیماں؟"

"مجھے کیا پتا؟"

"ابھی کل ہی کی بات ہے ہم ایک آنگن میں کھیلتے تھے شیماں!"

"اُن دنوں بابا زندہ تھا نا!"

"اُس نے تو نہیں کہا تھا' میرے مرنے کے بعد ماہنے سے روٹھ جانا۔"

شیماں مسکرائی۔ زرد زرد بجھی بجھی سی مسکراہٹ جیسے راکھ میں کوئی چنگاری چمکی ہو۔ پھر چنگاری بجھ گئی۔ ایک آنسو اس پر گرا اور اُس کے بجھنے کی آواز بھی نہ آئی۔ ان آنسوؤں کی پھوار میرے دل پر پڑی تو مجھے ایک عجیب سی تازگی کا احساس ہوا۔ ایک بدلی نے ڈھلتے ہوئے سورج کو ڈھانپ لیا تو ہرے بھرے کھیت پر گہرا سایہ چھا گیا۔

شیماں تم رو رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ ماہنے!"

"شیماں! نتّی تمہارے گھر آتا ہے؟"

"ہاں! آتا تو ہے۔"

"جھنڈو اسے کچھ نہیں کہتی۔"

"نہیں تو۔"

"وہ تم سے باتیں کرتا ہے؟"

"کرتا ہے۔"

"تمہیں وہ اچھا لگتا ہے؟"

"ہاں' وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"اور میں ؟"

"تم بھی اچھے لگتے ہو۔" اُس نے مسکرا کر کہا "پر ماہنے! وہ مستری مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"مستری بھی تمہارے گھر آتا ہے ؟"

"آتا ہے --- روز آتا ہے ماہنے۔ ماسی جھنڈو اُسے کچھ نہیں کہتی۔ وہ آنگن میں دیئے کے پاس بیٹھا رہتا ہے اور مجھے دیکھتا رہتا ہے۔ میں چلتی پھرتی ہوں تو اُس کی نظریں میرا پیچھا کرتی رہتی ہیں پر ماہنے! مجھے اس سے ڈر نہیں لگتا۔"

"ڈر نہیں لگتا اس سے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مجھے چوہدری سے کیوں ڈر لگتا ہے ماہنے؟" شیماں نے سہمی سہمی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"چوہدری سے" میری آواز حیرت کے مارے چیخ اُٹھی تو شیماں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"کونچا نہ بولو ماہنے۔ ماسی جھنڈو سُن لے گی۔"

"شیماں! تمہیں چوہدری سے کیوں ڈر لگتا ہے؟ میں نے تو سنا ہے چوہدری نے اِس سال تمہارے لئے دو من گندم دینے کو دی تھی، تمہیں یتیم اور بے آسرا سمجھ کر۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں! ماہنے! ٹھیک ہے۔ پھر بھی مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ وہ کبھی کبھار ماسی جھنڈو کے گھر آتا ہے، چھپ چھپا کر جیسے کوئی چور ہو اور مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے ---"

وہ رُک گئی تو میں نے پوچھا "جیسے کیا؟"

"مجھے پتہ نہیں۔ وہ جھنڈو سے ایک دو باتیں کرتا ہے اور کچھ کہے بغیر آنگن سے نکل جاتا ہے۔"

"شیماں! تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔" میں نے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ماہنے! اب جاؤ۔ ماسی جھنڈو ادھر آنے ہی والی ہو گی۔"

میں نے شیماں کی بات فوراً مان لی اور پگڈنڈی کی طرف قدم بڑھا لیا۔ ابھی میں

پگڈنڈی کے اگلے موڑ پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ جھنڈو سامنے آ گئی۔ اُس کے سر پر گھاس کا گٹھا تھا اور ہاتھ میں کھرپا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا۔ "ماہنے! کہیں شیماں کو دیکھا تُو نے؟"

"پچھلے کھیت میں وہ گوری کو چرا رہی ہے۔"

"شیماں! نی شیماں!"

"آئی ماسی!" شیماں نے جواب دیا۔

میں نے گاؤں کی طرف قدم بڑھائے۔ شیماں کے آنسوؤں کی نمی سے میرے دل میں جو شادابی آئی تھی، وہ لُو کے ایک جھونکے سے مُرجھا گئی۔ شیماں چوہدری سے کیوں ڈرتی ہے؟ کیوں ڈرتی ہے؟ یہ آواز میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی جیسے کوئی آسیب ہو جو مجھ سے چمٹ گیا ہو۔ اتنے میں بدلی کا سایہ بھی ہٹ گیا اور ڈھلتے دن کی اُداس اُداس دھوپ میں کھلار کی سرسراہٹ نے میرے کان میں بڑی پُراسرار سی سرگوشی کی۔ "اُس دن جب چکی پر شیماں دانے لے کر آئی تھی تو چوہدری نے اُسے جن نگاہوں سے دیکھا تھا، اُن پر حیداں بھی شرما گئی تھی۔ کیا ایک عورت ہی اُن نگاہوں کے اسرار سے واقف ہوتی ہے؟ کیا وہی نگاہیں اب بھی شیماں کا پیچھا نہیں کر رہیں؟" میں کس سے پوچھوں؟ حیداں سے --- نہیں --- ماسی رحیم سے؟ --- نہیں --- پھر کس سے پوچھوں؟ --- بھا اسلم سے؟ --- نہیں ---"

گاؤں کے جوہڑ کے کنارے میرے قدم خود بخود رُک گئے!

برسات میں جوہڑ کئی بار کناروں سے چھلکا تھا اور اب لبالب بھرا ہوا تھا۔ ابھی تک پانی صاف تھا اور اس میں اڑتے ہوئے بادلوں کا عکس نظر آ رہا تھا اور پچھم کی ہوا اس پر لہریے بنا رہی تھی اور کُرھکتا ہوا سورج لہروں میں کانپ رہا تھا۔ تب میرے ہاتھ پر پانی کے قطرے گرے تو میں نے گوری کو دیکھا جس نے چلتے چلتے میں جوہڑ سے دو گھونٹ پانی کے پی لئے تھے اور اُن میں سے ایک دو قطرے اُس کے منہ سے میرے ہاتھ پر گر پڑے تھے۔ اُس کی رسّی شیماں کے ہاتھ میں تھی جو میرے پاس سے گزر گئی تھی!

میں اس لئے ٹلّی بھی کہیں سے آ نکلا۔

اُس نے پوچھا "ماہنے! اسکول کب کھل رہا ہے ؟"

"آنے والے سوموار کو۔" میں نے بے خیالی میں جواب دیا۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

"یونہی۔"

"جھوٹ ابھی شیماں تمہارے پاس سے گزری تھی؟ تم۔"

"ہاں گزری تھی۔" میں نے اس کی بات کاٹ لی۔

"ایک بات کا پتا چلا تمہیں؟"

"کون سی بات؟"

"ابا نے سوچا ہے کہ شیماں کا نکاح مستری سے کر دیا جائے۔"

"کیوں؟"

"ہم اس کے سر پر ہاتھ نہ رکھیں گے تو اور کون ہے شیماں کا اس گاؤں میں ماجے؟"

"تم اس کے کیا لگتے ہو؟" میں نے چڑی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میرا ابا گاؤں کا چوہدری نہیں ہے ماجے؟"

"ہے تو سہی پر شیماں کوئی گرا پڑا مال تو نہیں کہ جس کی جھولی میں چاہے پھینک دیا جائے۔"

"ماجے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"تم اس جوگڑے کی کشکول میں آخر بھیک کا ایک ٹکڑا ڈال دینے پر تیار ہو ہی گئے نا سلی؟"

"وہ جوگڑا کون ہے؟"

"تمہاری چکّی کا مستری۔ لوگ کہتے ہیں وہ جوگڑا کشکول لے کر گاؤں کی ہر مٹیار کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔"

"وہ جوگڑا ہے؟"

"ہاں!"

"وہ ہماری مشین کا مستری ہے۔"

"اسی لئے تم چاہتے ہو کہ شیماں کو اس کے پلّو سے باندھ دیا جائے تاکہ وہ گاؤں چھوڑ کر نہ جائے اور تمہاری چکی چلتی رہے۔"

"ماجے! اگر شیماں کا بیاہ مستری سے نہ ہوا تو پتا ہے کیا ہو گا؟"

"کیا ہو گا؟"

"وہ گاؤں سے بھاگ جائے گی اور اپنے ساتھ گاؤں کی عزت کو بھی لے ڈوبے گی۔"

"سلی! ایسی کمینی بات نہ کرو، شیماں ایسی نہیں —— وہ ایسی نہیں ہو سکتی۔"

"ابا کہہ رہا تھا جن لڑکیوں کے سر پر ماں باپ کا سایہ نہ ہو اور ہوں بھی چھوٹی ذات کی، ان کا کیا اعتبار؟ وہ جوان ہو کر کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلاتی ہیں۔"

"سلی! میں چوہدری کی عزت کرتا ہوں لیکن انہیں ایسی بات منہ سے نہیں نکالنی چاہیے تھی۔ آخر وہ بھی ایک جوان لڑکی کے باپ ہیں۔"

"ماجے! تو بڑا بد زبان ہو گیا ہے۔"

"نہیں! میں نے کوئی بد زبانی نہیں کی۔"

"تم جسے اتنا نیک پاک سمجھتے ہو، جانتے ہو، وہ کیا ہے؟"

سلی کے ہونٹوں سے زہر ٹپکنے والا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے تڑاک سے میرے منہ پر چانٹا لگایا۔ میں نے بھنا کر اس کے منہ سے ہاتھ اٹھا لیا۔

"وہ کمین ہے۔ اسے عزت بے عزتی کا کیا خیال؟ مجھے ابا کی عزت کا خیال نہ ہوتا تو اب تک کسی کھیت کی لوٹ میں اس کے ساتھ ——"

اب میری باری تھی۔ میرا ہاتھ بے اختیار اٹھا اور اس کے گندے ہونٹوں پر وہ گندا لفظ ٹوٹ گیا جس کی سڑاند چار کھونٹ بکھر جانے والی تھی۔ اس کا ہونٹ کٹ گیا۔ اس نے خون تھوک کر کہا "ماجے! تجھے کیا پتا" میں اس کے ساتھ کب سے کھیل رہا ہوں۔ میں نے اس کا انگ انگ ٹٹولا ہے۔ اب صرف کھیت کی لوٹ کا تماشا باقی تھا کہ ابا نے ——"

تب نجانے کیوں میرا غصہ اپنے آپ مر گیا اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مجھے پتا تھا کہ سلی جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ مجھے غصہ دلانا چاہتا ہے۔ اب میں نے اس پر ہاتھ اٹھایا تو شیماں کی بدنامی ہو گی اور سلی کا جھوٹا غرور اس کے لئے ہمیشہ کا سچ بن جائے گا۔ میں ہنستا ہوا وہاں سے چلا اور گلی کے نکڑ پر بھا کی دکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بھا اکیلا تھا اور تھڑے پر چارپائی بچھائے بیٹھا تھا۔ میرے ہونٹوں پر قہقہے کے بچے کھچے آثار دیکھ کر اس نے پوچھا

"ماہنے آج بڑے خوش ہو؟"

"ہاں بھا۔"

بھا نے میری خوشی کی وجہ نہ پوچھی۔ یکایک میرا گلا رُندھ گیا۔ پھانس سی لگی تو میں نے گلے پر ہاتھ رکھ لیا اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ تب بے اختیار آنسو بہ نکلے تو بھا حیران ہو گیا۔

اُس نے کہا "ماہنے! ابھی ابھی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور دھوپ میں یکایک بارش ہونے لگی۔ آخر کیوں؟"

"بھا! کیا یہ بات سچ ہے؟"

"کون سی بات ماہنے؟"

"وہی شیماں والی بات۔"

"کیا ہوا شیماں کو؟"

"سلی کہہ رہا تھا اس کا نکاح مستری سے کر دیا جائے گا۔"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی پُر ماہنے!" بھا نے رُک کر میری آنکھوں میں جھانکا اور کہا "ایسا ہو جائے تو اس میں کیا برائی ہے؟"

میں چُپ رہا تو بھا نے کہا "ماہنے! میری بات کا جواب دو۔"

"بھا! چوہدری کو کیا حق ہے کہ وہ گاؤں کی ایک بے کس لڑکی کو مستری کی جھولی میں ڈال دے اور وہ ہمارے گاؤں کا بھی تو نہیں۔"

"ماہنے! میں تیرے دل کی بات سمجھ گیا ہوں۔ پر میں تیرا ساتھی نہیں بنوں گا۔ شیماں کا نکاح مستری سے ہو جائے تو سارے گاؤں کے سر سے بوجھ اُتر جائے گا۔ وہ بے آسرا لڑکی بھی تو ٹھکانے لگ جائے گی۔"

"بھا! مستری اچھا آدمی نہیں۔"

"سبھی لوگ اچھے ہوتے ہیں ماہنے! اُنہیں اچھا بننے کا موقع تو دو۔"

"شیماں کو وہ اچھا نہیں لگتا۔"

"اُسے کون اچھا لگتا ہے؟"

"میں اور سلی۔"

بھا نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا، تب وہ مسکرانے لگا۔ بھا کی ویسی ہی مسکراہٹ نے میرے جلتے دل پر پھاہا رکھ دیا۔ میں نے تن بدن میں ٹھنڈک سی محسوس کی جیسے جلتی دوپہر میں پانی بھری بدلی کا سایہ زمین پر اُتر آیا ہو۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "سلی کو تو میں نہیں جانتا ماہنے! پر تجھے تو جانتا ہوں۔ تو شیماں کے ساتھ ناطہ جوڑنے کی جرات رکھتا ہے ماہنے؟"

"م۔۔۔ م۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔"

"کہو ماہنے!۔۔۔ نہیں۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ اپنے من کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھو جب تمہارا دل کوئی فیصلہ کر لے تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

بھا کی اس بات نے مجھے خاموش کر دیا!

پھر سکول کھل گیا۔ میں پڑھائی میں لگ گیا۔ مجھے اپنے من میں جھانکنے کی فرصت ہی نہ ملی اور ایک سال ختم ہو گیا۔ زندگی کا سولہواں سال اور سترھویں سال کا آغاز ہوا تو زمانہ یکسر بدل گیا۔ زمانے کا تعلق بھی اپنے دل سے ہوتا ہے۔ میرا گاؤں نہیں بدلا تھا۔ وہی کچے مکان تھے، وہی گلیاں تھیں، وہی جوہڑ تھا جس کا پانی اب کالا پڑ چکا تھا کیونکہ اب اس میں تازگی نہیں رہی تھی۔ چوہدری کی مشین چلتی رہی اور گاؤں کی زندگی بھی اپنی رفتار پر قائم رہی۔ پھر بھی زمانہ بدل گیا تھا۔ بھا کی دلہن چل نکلی تھی۔ بھا نے گروی رکھے ہوئے زیور چھڑوا لئے تھے۔ اس کی دلہن بھری بھری معلوم ہوتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا "شیماں سے میرا کیا جوڑ، میں رانجھا نہیں، مرزا نہیں، مہینوال نہیں، میں جاٹ ہوں اور اب میں پڑھ لکھ گیا ہوں۔۔۔ میں اُسے بھگا کر لے جاؤں تو لوگ کیا کہیں گے۔۔۔ جاٹ کا بیٹا نرا بے کی پوتی کو بھگا کر لے گیا۔۔۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔۔۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا۔۔۔"

تب مجھے اپنے خیالات پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ "میں بدل گیا ہوں۔۔۔ میں بزدل ہوں۔ میں وہ سپاہی ہوں جو ہتھیار اُٹھائے بغیر میدان سے بھاگ گیا۔۔۔ میں کچھ بھی نہیں۔۔۔ میں راکھ ہوں۔۔۔ بنجر مٹی کی ایک مُٹھی۔۔۔ میں اپنی سوچ کے بگولے میں بکھر کر رہ گیا ہوں۔۔۔ بزدل۔۔۔ بزدل۔۔۔" میں نے اپنے من کی گہرائیوں میں جھانکنے کی آخر جرات کر ہی لی تھی اور اس آئینے میں اپنا ہارا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے شرم آئی تھی۔ مجھ میں

اتی ہمت نہیں تھی کہ میں زمانے کو ایک ٹھوکر سے اُڑا دوں۔ اپنے سے باہر کا زمانہ خود نہیں بدلتا اسے بدلنا پڑتا ہے اور میں اُسے نہیں بدل سکتی۔

انوکھا ہے پر کا پرندہ ہے جو نظر بھی نہیں آتا پر آنکھ کی ایک جھپک میں وہ پورب سے پچھم اور اتر سے دکھن پہنچ جاتا ہے۔

"کچھ سنا تم نے؟"

"نہیں تو——"

ایک سرگوشی—— بدبو کا ایک سانس——

"میں تو مدت سے کہہ رہی تھی کہ یہ لڑکی کوئی گل کھلائے گی۔"

"پر وہ ہے کون؟"

"جانے میری بلا۔"

"منشو۔"

بدبو کا ایک اور سانس!

"نہیں نہیں—— اُسے کیا ضرورت تھی؟ وہ پھل کے پکنے کا بھی انتظار نہ کر سکا اس نے کچے پھل کو اُچک لیا۔"

"وہ شیرا۔ مجھے تو شروع سے اُس کے لچھن اچھے نہیں لگتے تھے۔ میں جب بھی چکی پر دانے پسوانے گئی، اس نے کھیسیں نکال دیں۔ وہ سمجھتا جیسے گاؤں کی نیار دانے پسوانے نہیں آتی، اس سے آنکھیں لڑانے آتی ہے۔"

"ہم اسے ذلیل کر کے گاؤں سے نکال دیں گے۔"

"چوہدری سے کون بچے گا؟"

"یہ مشین ساری خرابی کی جڑ ہے۔"

"جھنڈو بھی تو سدا کی ولی ہے۔ وہ اس کے گھر آتا رہا اور اسے اُس ممدیے کی نیت کا پتا نہ چلا۔"

"نہیں جی وہ سب کچھ جانتی تھی۔ وہ اُس سے مال کھاتی رہی۔"

"جوانی کے زمانے میں جھنڈو کون سی اچھی تھی۔ ویسے ترکھان کے گھر آنے کے بعد بھی وہ کئی بار کھیتوں میں پکڑی گئی۔"

"سنا ہے چوہدری بھی——"

"چپ! چپ رہو۔ چوہدری کا نام نہ لو۔"

"سنا ہے بابا تھو نے شیلاں کی ماں کا حق کرنے میں بہت جلدی کی تھی۔"

"ٹھیک کیا اس نے! جوان بیوہ اپنا رنڈاپا کاٹ لیتی ہے پر جن کے من میں کھوٹ ہو وہ اسے پاک صاف نہیں رہنے دیتے۔"

"چھوڑو اس قصے کو—— تم کسی کا نام لے دو گی اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"ماجے! تم نے کچھ سنا؟"

"نہیں!" میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ "میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔"

سرگوشی کا سانس بولا "تمہیں سننا پڑے گا۔ سننا پڑے گا۔"

اب میں نے کانوں سے ہاتھ اٹھائے تو ماسی ریشم کہہ رہی تھی "اس گاؤں میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔"

"ریشم بی بی اے! یہ کمال نہیں ہو گا۔" گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی آدمی نے کہا۔

وہ چلا گیا تو میں نے پوچھا "ماسی! کیا ہوا؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں ماجے!"

"نہیں ماسی کچھ تو بتاؤ۔"

"کوٹھوں چڑھی بات تم نہ سن سکے ماجے؟ تم نے کان بند کر رکھے تھے کیا؟"

"ہاں ماسی!"

"پھر کان بند ہی رہنے دو۔ سن کر کیا کرو گے؟"

ماسی یہ کہہ کر گلی میں گم ہو گئی۔

"بھرا گاؤں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ بدبو پھیل رہی ہے۔ سارا گاؤں زہر سے بھر گیا ہے۔ یہ کیا ہوا! یہ کیوں ہوا؟ وہ کون تھا جس نے ایسا کیا؟"

"ماجے! تم نے بہت سارے سوال ایک ساتھ پوچھ لئے ہیں۔ ان سب کا جواب میں ایک سانس میں کیسے دے سکتا ہوں۔ کیا ہوا؟ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ ایک بے آسرا لڑکی تھی۔ اُس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ وہ شکل مند تھی۔"

اچھی چیز کی طرف کون للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتا؟ وہ کون تھا جس نے ایسا کیا؟ ماہے! وہ میں نہیں تھا' وہ تو نہیں تھا' سلی نہیں تھا اور کیا پتا وہ مستری بھی نہ ہو جس کا نام گاؤں کی ہر زبان پر چڑھ گیا ہے؟"

"بھا!" میں حیران ہو کر چیخا "تم کیا کہہ رہے ہو؟ سب لوگ تو اُسی کا نام لے رہے ہیں۔"

بھا نے کوئی جواب نہ دیا۔

اور افواہ کا بے پر پرندہ گاؤں کی فضا میں اڑتا رہا اور تب ایک دن گاؤں نے سچ کا کڑوا گھونٹ گلے سے اُتار لیا۔ چوہدری کی حویلی میں گاؤں کے لوگوں کا اکٹھ ہوا۔ اس میں جو لوگ شریک تھے اُن کے ہونٹوں پر گاؤں کی عزت کا سوال تھا اور اُن کے دلوں میں زہر بھرا ہوا تھا۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ مستری اور شیماں کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے۔ کسی کو سزا دینے میں انسان کو کتنا مزا ملتا ہے بشرطیکہ مجرم بے بس ہو اور گُتھے ہوئے ہاتھ کو موڑ کر توڑ نہ سکتا ہو۔

میں پنچایت سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ ابھی میری عمر اتنی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے پنچایت میں بیٹھنے کا حق ملتا۔ سُلی نے میرے پاس آ کر کہا "دیکھ لیا اپنی شیماں کو۔"

میں نے اس کی طنز کا کوئی اثر نہ لیا۔ میں نے کہا "نہیں سلی! شیماں بے قصور ہے۔"

"پھر قصور وار کون ہے؟" اُس نے نفرت سے مسکرا کر پوچھا۔

"سارا گاؤں—— میں بھی اور تُو بھی—— اور کیا پتا! مستری بے چارہ نردوش ہو۔"

"تم سے کس نے کہا؟"

"بھا اسلم نے۔"

"تیرا بھا افلاطون بنا پھرتا ہے۔ سارا گاؤں تو یہی کہتا ہے کہ——"

"سلی! میں تم سے لڑوں گا نہیں۔" میں اُس سے دُور ہٹ گیا۔

ساری پنچایت چارپائیوں پر بیٹھی تھی اور حقہ چل رہا تھا۔ چوہدری ایک چارپائی پر اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کا طرہ حسب معمول بلند تھا پر وہ کچھ بُجھا بُجھا سا تھا۔ مجھے اُس دن چوہدری کے چہرے پر بُجھاپا نظر آیا۔

اس نے کہا "چوہدریو! گندگی اُچھلے تو چھینٹے ضرور اڑتے ہیں۔ کون جانے کس کس کے دامن پر دھبا لگے۔ ہم سب گناہگار ہیں۔ لڑکی بھولی بھالی تھی' پھسل گئی۔ میں اسے بے قصور تو نہیں سمجھتا پر یتیم ہے' اس لئے اس پر رحم کھانا بہتر ہے۔ اصل قصور تو مستری کا ہے۔ وہ میری مشین پر کام کرتا ہے۔ اس کا قصور میں اپنے سر لیتا ہے۔" مولوی جی یہیں موجود ہیں کیوں نا! اس کی بلا اس کے سر منڈھ دی جائے۔"

"پر چوہدری! مستری کو ڈنڈ ضرور لگنا چاہئے۔" بابا حیات بولا۔

"ہاں! ہاں! ڈنڈ بھی لگنا چاہئے۔ کہو! کیا ڈنڈ تجویز کرتے ہو؟"

"اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرایا جائے اور اسے سارے گاؤں میں پھرایا جائے۔"

"نہیں اس طرح گاؤں کی بدنامی ہو گی۔ چک مراد کے نام پر دھبا لگے گا۔" چوہدری نے کہا۔

مستری اور دینا ترکھان فرش پر بیٹھے تھے۔ اُن دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں کیں۔ میں نے دیکھا کہ بھا اسلم اُنہیں غور سے تک رہا ہے۔ مستری سہما سہما سا تھا۔

"مستری کو جُوتے مار کر گاؤں سے نکال دیا جائے۔" چوہدری رحمت نے کہا۔

اس وقت میرے باپ نے کہا "نہیں چوہدری! معاملے کو اتنا لمبا نہ کرو۔ چوہدری کی بات مان لو۔ بیچاری یتیم لڑکی ٹھکانے لگ جائے گی۔"

چوہدری نے میرے باپ کی طرف بڑی احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھا۔ میرے باپ نے آنکھیں پھیر لیں۔ چند لمحوں تک لوگ آپس میں مشورہ کرتے رہے۔ پھر یکایک سب کا ایک بات پر اتفاق ہو گیا کہ مستری اور شیماں کا نکاح کر دیا جائے اور مستری سے کہا جائے کہ وہ اسے ساتھ لے کر راتوں رات گاؤں سے چلا جائے۔ چوہدری کو یہ فیصلہ ناگوار گزرا کیونکہ وہ مستری کو گاؤں سے نہیں نکالنا چاہتا تھا لیکن اس نے کہا "پنچایت کے فیصلے کے سامنے میں دم نہیں مار سکتا چوہدریو! پر اسے دو ایک دن کی مہلت ضرور دو۔ کل کسی وقت انہیں رخصت کر دوں گا۔"

تب مولوی صاحب نے دو بول پڑھے اور پنچایت اُٹھ گئی۔ اُس وقت مجھے یوں لگا

جیسے گاؤں نزع کے عالم میں ہو اور اس کا دم نکل رہا ہو!

اور دوسرے دن میں جوہڑ کے کنارے کھڑا تھا جب مستری اور شیماں تانگے میں بیٹھے۔ گاؤں کی عورتیں پیچھے گلی میں کھڑی رہیں۔ شیماں کو رخصت کرنے کے لئے کوئی عورت جوہڑ تک بھی نہ آئی حالانکہ گاؤں کی کوئی بیٹی جب گاؤں چھوڑتی تو سارا گاؤں اسے رخصت کرنے کے لئے اُٹھ آتا۔ عورتیں روتی تھیں، مرد روتے تھے اور بچوں کے ہونٹوں پر بھی ہنسی اور قہقہوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا تھا پر آج شیماں کو رخصت کرتے وقت میں نے صرف ایک آنکھ میں چنگاری دیکھی وہ آنکھ میری تھی اور ایک جلتا چمکتا آنسو میرے پپوٹوں کو جلا رہا تھا۔ میں نے اس آنسو کو لڑھکنے نہ دیا ورنہ سارے گاؤں میں آگ لگ جاتی۔ اس وقت ماسی ریشم گلی میں سے تیز تیز آئی اور اُس نے شیماں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ تانگے کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ تانگہ کھیتوں کی اوٹ میں اوجھل ہوا تو میں بھا کی دکان پر آ بیٹھا۔

"ماہنے! کیا ہوا؟" بھا نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں—— گاؤں مر گیا ہے۔"

"نہیں ماہنے! گاؤں زندہ ہے۔"

میں کچھ کہنے والا تھا کہ حمیداں دکان کے تھڑے پر آ کر ایک لمحے کو رک گئی۔ اس نے دکان سے کوئی چیز نہ خریدی۔ اُس نے بھا کو ایک نظر دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔ وہ جب تک گلی کے موڑ پر نہ پہنچی مڑ مڑ کر بھا کو دیکھتی رہی۔ اُس دن حمیداں کے چہرے پر ایک عجیب سا غم تھا جیسے وہ کسی بات پر کسی سے شرمندہ ہو۔

حمیداں کو گلی کے موڑ نے نگل لیا تو ماسی ریشم دکان کے تھڑے پر آن کھڑی ہوئی۔

"ماسی!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کہو ماہنے!"

"تو نے میرے منہ پر ہاتھ کیوں رکھ دیا تھا؟"

"کب؟" ماسی نے چونک کر پوچھا۔

"اس دن جب گلی میں——"

"چپ رہو ماہنے!" ماسی نے میری بات ٹوک لی۔ بھا مجھے عجیب سی نظروں سے تکنے لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا مہاجر لڑکے؟"

"اسلم!" بھا نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے کہا نہیں تھا تم گاؤں میں پھٹی نہ ڈالو۔"

"کہا تو تھا ماسی! پر اب کیا ہو سکتا ہے؟" بھا نے کہا۔

ماسی شاید اس کی محرم تھی کہ وہ بات کو سمجھ کر بولی "تم اب بھی گاؤں چھوڑ جاؤ۔"

"کیوں ماسی؟" میں نے اچانک غصے میں آ کر کہا۔

"کسی بات کا پتا نہ ہو تو چپ رہنا اچھا ہوتا ہے ماہنے!" ماسی سختی سے بولی۔

"ماسی!" بھا سوچ سوچ کر بولا "اب میری اس گاؤں میں جڑ لگ چکی ہے۔ اب میں نہیں جا سکتا۔"

"نہیں جا سکتے؟" ماسی نے بجھے بجھے انداز میں کہا اور حمیداں کی طرح بھا کو مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی گلی کی نکڑ پر غائب ہو گئی۔

"بھا! ماسی کیا پہیلیاں بجھوا رہی تھی؟"

"کچھ بھی نہیں ماہنے!" بھا نے اپنے اندر گم ہوتے ہوئے کہا۔

اور میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا اور سال بیتتا رہا اور گاؤں میں کچھ عرصے تک مستری اور شیماں کی باتیں ہوتی رہیں اور چوہدری کی تعریف بھی ہوتی رہی جس نے گاؤں کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا تھا اور شیماں کو رخصت کرتے وقت اسے ایک جوڑا بھی دیا تھا اور ایک بھرا سونا زیور بھی پہنایا تھا۔

گاؤں شیماں کو بھول گیا اور میں نے بھا سے پوچھا "بھا! وہ کون تھا؟"

"وہ کون؟—— نہیں ماہنے! مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

تب الوہ کا بے پر کا پرندہ گاؤں کے گدلے جوہڑ میں ڈوب گیا!

اور ایک دن اچانک چوہدری ہمارے کنویں پر آیا۔ اس نے کہا "سوچ دینا! اگلی فصل سے نہلے والے کھیت پھر تیرے ہیں۔ اُن میں جو چاہے کاشت کر لینا۔"

میرا خیال تھا کہ میرا باپ چوہدری کی پیشکش کو قبول کر لے گا۔ نجانے کیوں! اس خیال سے مجھے شرم آئی اور میں اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے باپ کو بہت کم غصہ آتا تھا پر اس دن اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آنکھوں میں الاؤ بھڑکنے لگا تھا۔ اس نے

کانپتے ہونٹوں سے پوچھا "چوہدری! یہ مہربانی کیوں؟"

"مہربانی کیوں؟ ـــ اس لئے کہ تمہیں ان کی ضرورت ہے اور میں ـــ"

"نہیں چوہدری! میں نے اُس دن پنچایت میں تیری حمایت صرف اس لئے کی تھی کہ اس طرح بچاری یتیم لڑکی ٹھکانے لگ جائے گی۔ میں نے تین کھیتوں کے لئے تو ایسا نہیں کیا تھا۔"

چوہدری شرمندہ ہو کر چلا گیا۔ تب میں خوش ہوا۔ میرا باپ تین کھیت قبول کر لیتا تو میں شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتا۔ میں نے باپ کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھا تو اس نے منہ پھیر لیا!

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۱۱

○

گزشتہ دو سال سے ہم لشتم پشتم گزارا کر رہے تھے! ہماری گندم چھ مہینے بھی نہ چلتی۔ ساونی کی فصل اچھی ہو جاتی تو سال گزر جاتا۔ ہم کبھی بھوکے پیٹ نہیں سوئے تھے پر کسان کی کوٹھڑی میں غلہ نہ ہو تو اسے گھر اور پیٹ دونوں خالی خالی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بھا سے ہم کوئی مدد نہ لیتے۔ بھا کو اس کا بڑا احساس تھا پر میرا باپ کہتا "اسلم! چوہدری نے دکان کھلنے سے پہلے طعنہ دیا تھا کہ ہم تیری دکان اپنے فائدے کے لئے کھلوا رہے ہیں۔ میں دشمن کو زبان کھولنے کا موقع کیوں دوں؟"

"پر چاچا! اس دکان میں تمہارا ساجھا بھی تو ہے۔ تمہارے زیور گروی رکھ کر میں نے دکان شروع کی تھی۔"

"لوگ اس بات کو نہیں سمجھیں گے اسلم!"

"لوگ پھر بھی تو باتیں بناتے ہی رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے پر میں تو جاٹ ہوں۔ میں اپنی آن اکھ پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا۔"

جب اکتوبر میں میں نے آٹھویں جماعت کے امتحان کے لئے داخلہ بھیجنا تھا تو میں گھر سے ایک من گندم بھا کی دکان پر لے آیا۔ بھا نے مجھے آٹھ روپے دیئے اور کہا۔ "لاجے! اب معلوم ہوا ہے میں غیر ہوں۔ تمہارا کچھ بھی لگتا ہوتا تو آج تم مجھے یوں شرمندہ نہ کرتے۔" بھا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں نے منہ پھیر لیا۔

داخلہ چلا گیا تو سردیوں کے مہینے بڑی سُرعت سے گزر گئے۔ اُس زمانے میں ہمارے استاد ہمیں بہت محنت کرواتے تھے۔ ہمیں کہیں سورج ڈوبنے پر چھٹی ملتی۔ سلی نے یہ مہینے بیدپار کے ذیلدار کے ہاں گزارے۔ مجھے ہر روز گھر آنا پڑتا۔ تب امتحان کے دن بھی آ گئے۔ ہمیں سیالکوٹ جا کر امتحان دینا تھا۔ میں اس سے پہلے صرف دو بار سیالکوٹ گیا تھا۔ بھا

کے ساتھ وہاں سے دکان کا سامان خرید کر لایا تھا۔ سیالکوٹ شہر کی سیر کا موقع نہیں ملا تھا۔ شہر ہمارے گاؤں سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ان دنوں وہاں یکے پر جانا پڑتا تھا۔ شہر سے آنے والی سڑک۔ گاؤں سے ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے اور یہ سڑک گوندل جاتی ہے اور پھر توی کو عبور کے علاقہ بجوات کے سبزہ زاروں میں کھو جاتی ہے۔ سیدپور بھی اسی سڑک کے کنارے واقع ہے۔

اس سال مڈل سکول سیدپور سے آٹھویں جماعت کا امتحان دینے والے لڑکوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی۔ دو یکے کرائے پر لئے گئے تھے۔ یکوں نے سیدپور سے آنا تھا۔ مجھے اور سلی کو یہ رعایت ملی تھی کہ ہم اپنا سامان لے کر سڑک کے کنارے بیٹھ جائیں۔ میں اور سلی الگ الگ سڑک کے کنارے پہنچے تھے۔ میں اپنے سامان کی گٹھڑی اپنے سر پر اٹھا کر لایا تھا' کتابیں بستر اور کپڑوں کا دھلا ہوا ایک جوڑا۔ ہمیں ہیڈ ماسٹر صاحب نے تاکید کی تھی کہ ہم شلوار قمیص میں امتحان دیں تاکہ شہریے ہمیں پینڈو کہہ نہ کر چھیڑیں۔ سلی اپنے ایک نوکر کے سر پر سوٹ کیس اور بستر اٹھوا کر لایا تھا۔ آٹا' گھی اور پانچ پانچ روپے نقد ہم ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس سکول ہی میں جمع کروا آئے تھے۔ پچھلے سال سے سلی کے ساتھ میری بول چال بند تھی۔ ہم سڑک پر تھوڑے سے فاصلے پر الگ الگ کھڑے تھے اور یکوں کا انتظار کر رہے تھے۔ تب میں نے دیکھا بلکہ محسوس کیا کہ سلی آہستہ آہستہ کھسک کر میرے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس نے کہا "عبدالرحمن!"

"کون عبدالرحمن؟" میں نے سوچا۔

"دیکھو عبدالرحمن شہر جا کر مجھے سلی نہ کہنا۔ محمد سلیمان کے نام سے پکارنا۔"

"بہت اچھا! پر ہماری تو بول چال بند ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

تب یکے آ گئے۔ لڑکوں نے ہمیں دیکھ کر نعرہ لگایا اور یکے ہمارے قریب آ کر رک گئے۔ ہم نے اپنا اپنا سامان یکے میں پھینکا اور پائدان پر پاؤں رکھ کر یکے پر چڑھ گئے۔ یکے ہچکولے کھاتے ہوئے چلے۔ سڑک پر سایہ تھا۔ دونوں کناروں پر شیشم اور کیکر کے بڑے بڑے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ فروری کے مہینے میں سائے اچھے نہیں لگتے۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا اور دور دور تک گندم کے سرسبز کھیتوں پر چمکیلی سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ جنوری میں جو بارشیں ہوئی تھیں ان کی وجہ سے کچی سڑک کی دھول بیٹھ گئی

تھی۔ پھر بھی نم آلود دھول کے ہلکے ہلکے مرغولے اڑ رہے تھے اور ان میں بھیگی بھیگی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ سورج درختوں کی پھننگوں کے اوپر پہنچا تو سائے سمٹ گئے اور حد نظر تک سڑک دھوپ میں نہا گئی۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ دھوپ' سایوں' گرمی اور خنکی کا خواب۔ اس خواب میں درختوں کے ہیولے بھی تھے اور گرد کے مرغولے بھی۔ اس میں کسی انسان کا ہیولیٰ شامل نہیں تھا۔

میں شہر جانے کے شوق میں منہ اندھیرے جاگا تھا اور رات کو بھی دیر سے سویا تھا۔ میری آنکھوں پر نیند کے چھاپے تھے اور نیند کی دھندلی وادی میں کھو کر یکے کے ہچکولے مجھے لوریاں دے رہے تھے۔ میں اونگھ گیا تو ادھ کھلی آنکھوں کا خواب بند پپوٹوں کی اوٹ میں جا پہنچا اور یکدم نکھر سا گیا۔ میں گاؤں کے جوہڑ کے کنارے کھڑا تھا اور جوہڑ میں سورج چمک رہا تھا اور لوگ کھڑے تھے اور ایک یکے میں مستری اور شیماں بیٹھے تھے۔ شیماں دلہن بنی ہوئی تھی۔ اس نے سرخ جوڑا پہنا ہوا تھا۔ اس کے ماتھے پر جھومر تھا۔ یکہ چلا تو اس نے مجھے ایک نظر دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو "تم بھی میرے دیس نکالے میں سب کے ساتھ شریک ہو؟" پھر یکایک منظر بدل گیا۔ میں نے شہر جانے والی سڑک کے اس سنگم پر جہاں کچی سڑک پکی سڑک میں مل گئی تھی' اُسے کھڑا دیکھا جیسے وہ میرا استقبال کرنے کے لئے وہاں آئی ہو اس نے مجھے ایک نظر دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ "تم وہ نہیں ہو جس کا مجھے انتظار تھا۔" ان الفاظ پر مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میری آنکھ کھل گئی۔

میرے ایک ہم جماعت نے کہا "سو گئے تھے ماہنے؟"

"نہیں تو ـــ" میں نے پاگلوں کی طرح ایک ایک کو تکتے ہوئے کہا۔

کچی سڑک کا سفر بلہ بگھو کے پل پر آ کر ختم ہوا۔ اس سے آگے سیالکوٹ چھاؤنی کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں سے پکی سڑک بھی شروع ہو جاتی ہے۔ میرے کچھ ساتھیوں کے لئے چھاؤنی کے بنگلوں اور بارکوں کا نظارہ نیا تھا۔ وہ تو مبہوت سے نظر آتے تھے پر مجھے اور سلی کو فخر حاصل تھا کہ ہمارے لئے یہ نظارہ نیا نہیں ہے۔ کمپنی باغ کے پھاٹک پر دو شیروں کے مجسمے دیکھ کر ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ببر شیروں کے سرخ جبڑے یوں کھلے ہوئے تھے کہ ابھی دھاڑے کہ دھاڑے۔ ہم میں سے سلی کے سوا آج تک کسی نے زندہ شیر نہیں دیکھا ہوا تھا۔ ایک لڑکے نے ذرا کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "ماہنے! شیر

لوئے شیرا!" میں اور سلی ہنس پڑے۔ سلی نے کہا "تم پینڈو کے پینڈو رہے نا! یہ تھی تو فوجیوں کے پریڈ کے میدان آئے۔ یہاں فوجی سنگینیں چڑھائے بھس بھری بوریوں کے آدمیوں پر حملہ کرنے کی مشق کر رہے تھے۔ ایک ٹیلے کے قریب چاند ماری ہو رہی تھی۔ تب ہم ہیڈ بالہ کے پُل سے گزرے تو شہر کا علاقہ شروع ہو گیا۔ ان دنوں شہر سے باہر سنگترے اور مالٹے کے باغات تھے اور سرسبز کھیت بھی تھے۔ ان کے درمیان خوبصورت عمارتیں بھی تھیں۔ پھر سڑک کے دونوں کناروں پر آباد محلے شروع ہو گئے۔ اصلی شیر دیکھنے ہوں تو لاہور کے چڑیا گھر کی سیر کرو۔" کمپنی باغ کے کچھ آگے جا کر

ماسٹر صاحب نے یکایک پوچھا "تمہیں پتہ ہے کہ سیالکوٹ کیوں مشہور ہے؟"

"جی ہاں! جی ہاں!" سب نے ہاتھ کھڑے کر دیئے تو ماسٹر صاحب ہنسے۔

"ارے بھائی! یہ جماعت کا کمرہ تو نہیں---- ہاں تو! ماجے! تم بتاؤ۔"

"کھیلوں کا سامان' جراحی کے آلات' مصنوعی اعضا وغیرہ وغیرہ کے لئے مشہور ہے۔"

"یہ سیالکوٹ میں کھیلوں کے سامان کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔" انہوں نے کارخانے کے پھاٹک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ اوبیرائے کے کارخانے کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں سینکڑوں کاریگر کام کرتے ہیں۔"

سلی نے میرے کان میں کہا "یہیں مستری بھی کام کرتا ہو گا۔"

"کون مستری؟"

"وہی اپنے گاؤں والا----"

"وہ یہاں کہاں ہو گا! یہ کوئی آٹا پیسنے کی چکی تو نہیں سلی؟"

"مجھے محمد سلیمان کے نام سے پکارو عبدالرحمن۔"

ریلوے کا پھاٹک بند تھا۔ یہاں بڑا ہجوم تھا۔ ہم میں سے اکثر لڑکوں نے اتنی بھیڑ پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میرے ایک ساتھی نے کہا "شہروں میں بڑی بھیڑ ہوتی ہے ماجے!" مجھے اُس کی حیرت پر ہنسی آئی پر میں نے سوچا "اتنے شور و غل میں شہر کے لڑکے پڑھتے وڑھتے خاک ہوں گے۔" تب ایک گاڑی لائن پر سے آہستہ آہستہ گزرنے لگی۔ لڑکے منہ کھولے گاڑی کو دیکھتے رہے۔ ہم میں سے بہت سوں کو آج تک گاڑی پر سوار ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ پھاٹک کھُلا اور ہم شہر کے اندر اڈے پر پہنچ

گئے۔ اڈے سے قریب ہم نے ایک مکان کرائے پر لیا تھا۔ یہ مکان ایک گلی میں تھا۔ یہاں ہم نے سامان رکھا۔ ایک کمرے میں فرش پر ہی بستر بچھا لئے۔ دوسرے کمرے میں ماسٹر صاحب نے چارپائی بچھائی۔ ہم سید پور سے ایک نائی کو روٹی پکانے کے لئے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس نے باورچی خانے میں آٹا اور گھی رکھ دیا۔ تب ماسٹر صاحب نائی کو ضروری ہدایات دے کر ہمیں سیالکوٹ کے مشہور قلعے پر لے گئے۔ یہیں میونسپل ہال میں ہمارا امتحان ہونا تھا۔ سیالکوٹ کے قلعے کے اوپر سے شہر کا نظارہ بڑا بھلا لگتا تھا۔ سرسبز کھیتوں کے جنگل میں سے بڑے گرجے کا مینار اچانک ابھر آیا تھا۔ دُور سے نیلے پہاڑ بھی نظر آ رہے تھے۔ ان کی چوٹیوں پر سفید برف کو آگ لگ چکی تھی۔ جب شام کو شہر کے مکانوں میں بجلیاں روشن ہوئیں تو ہم لوٹ کر اپنے مکان میں آ گئے۔ رات بجلی کی روشنی میں پڑھنے میں بڑا لطف محسوس ہوا۔ جب بجلی بجھا کر ہم سونے کے لئے لیٹ گئے تو میرا دم گھٹنے لگا۔ ہمارے گاؤں میں سرِ شام ہی اندھیرا چھا جاتا تھا پر اس میں گھٹن نہیں ہوتی تھی۔ اندھیرے میں بھی کھلے کھیتوں کی وسعت سما جایا کرتی تھی اور کچے کوٹھے کے اندر بھی فراخی کا احساس ہوتا۔

اس سے اگلے دن پرچے شروع ہو گئے۔ سات آٹھ دن امتحان ہوتا رہا اور ہم امتحان میں مشغول ہو کر دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔ پھر یکایک امتحان ختم ہو گیا اور ہم دو دن شہر میں گھومتے رہے۔ شہریئے لڑکے ہم پر آوازے کستے رہے۔ ہم نے کھیلوں کے سامان کے بڑے کارخانے کی سیر کی۔ گاڑی پر بیٹھ کر وزیر آباد کے اسٹیشن تک کے سفر کا لُطف اٹھایا۔ واپسی پر سمبڑیال اُترے اور نہر اپر چناب کے کنارے کچھ وقت گزارا۔ جب ہم سیالکوٹ پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ ایک سڑک کے کنارے ایک جگہ جہاں مشینی آرے سے لکڑیاں چیری جا رہی تھی اور ایک چکی پھک پھک چل رہی تھی' سلی نے رک کر کہا۔ "عبدالرحمن! میرا خیال ہے ہمارا مستری اس کارخانے میں کام کرتا ہو گا؟"

"تم نے کوئی خواب دیکھا ہو گا۔"

"یونہی---- بس میرا خیال ہے۔"

اس وقت کارخانے سے کچھ لوگ نکلے۔ انہوں نے ملیشئے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں مستری بھی تھا۔ سلی سے پہلے میری نظر اس پر پڑی۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہا "سلی! دیکھو تو---- وہ مستری تو نہیں؟"

"مجھے سلیمان کے نام سے پکارو۔"

میں نے سلّی کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ میں نے پکار کر کہا "مستری جی!"

اُس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور پہچان لیا "اوہ! چوہدری ماہنے! تم یہاں کہاں؟"

مستری نے لپک کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے کہا "تم نے سلیمان کو نہیں پہچانا؟"

اُس نے سلیمان سے بھی ہاتھ ملایا۔ مستری مجھ سے ہاتھ ملا کر یقیناً خوش ہوا تھا لیکن سلیمان سے ہاتھ ملا کر اُس نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

سلّی نے پوچھا۔ "مستری! تم اس کارخانے میں کام کرتے ہو۔"

"ہاں چوہدری!"

"تمہارا مکان کہاں ہے؟"

"یہیں ایک محلے میں ہے؟"

ہم نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید مستری اپنے مکان کا اتا پتہ بتائے یا ہمیں اپنے ساتھ چلنے کو کہے پر مستری نے ایسی کسی خواہش کا اظہار نہ کیا تو میں اور سلّی دونوں مایوس ہو گئے۔ سلّی نے کہا "عبدالرحمٰن!" میں نے قدم نہ بڑھایا تو سلّی نے کہا "میں تو چلتا ہوں عبدالرحمٰن۔" میں نے مستری سے ہاتھ ملایا۔ اس نے میرا ہاتھ دبا کر ہولے سے کہا "اس کو جانے دو چوہدری ماہنے!" مستری کی سرگوشی شاید سلّی نے بھی سُن لی تھی کہ وہ منہ بنا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ تب مستری نے کہا "ماہنے! تیرا گاؤں بہت یاد آتا ہے۔ حیداں کا کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے!"

"وہ مہاجر لڑکا گاؤں میں ہی ہے؟"

"تم بھا اسلم کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! ہاں!"

"وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"اس سے کہنا جو حیداں اس کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو، تو میں انہیں اپنے گھر میں پناہ دینے کو تیار ہوں۔ مولوی کا انتظام بھی کر دوں گا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے ذرا سٹپٹا کر کہا۔

"ماہنے! مطلب نہ پوچھو جو کہہ رہا ہوں اپنے بھا کو پہنچا دینا۔"

میں نے چند لمحوں کے لئے سوچا تب میرے دماغ میں ایک کھٹکا سا ہوا۔ میں مستری کی بات سمجھ گیا۔ مجھے آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے کہا "مستری! بھا اسلم شریف آدمی ہے۔"

مستری نے میری بات کا غصہ نہ کیا۔ وہ مسکرانے لگا۔ اس نے کہا "چوہدری ماہنے! تیرا بھا یقیناً شریف آدمی ہے، میں بھی بدمعاش نہیں ہوں۔ بدمعاش تو وہ ہوتا ہے جو اپنی کالک کو اُجلے کپڑوں میں چھپائے پھرتا ہے۔"

"میں چلتا ہوں مستری!"

"نہیں ماہنے! میرا گھر یہاں سے نزدیک ہی ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"تم چلو گے ماہنے۔" مستری نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے تنگ گلیوں میں لے گیا۔ ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر اس نے دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ دروازے میں شیماں کھڑی تھی۔ اچانک وقت کی بہتی ندی کے سامنے ایک چٹان آ گئی۔ پانی کی دھار کو ٹھوکر لگی تو قطروں کی پھوار اٹھی۔ اس سے ایک قطرہ الگ ہوا، تو وہ میری زندگی سے کٹ گیا۔ یہ لمحہ میری گرفت میں نہیں آ رہا تھا کہ مستری بولا "شیماں! یہ اپنا ماہنا ہے۔"

شیماں جواب میں مسکرائی۔ اُس نے پوچھا "ماہنے! تم شہر کیوں آئے؟"

"امتحان دینے!" مستری نے کہا۔

"گاؤں ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"گوری سے کبھی ملے؟"

"کون گوری؟ —— ہاں —— نہیں تو۔"

"اس نے کچھ دیا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"ماہنے! مجھے ساتھ لے چلو گے گاؤں میں؟" شیماں نے اچانک مسکرا کر پوچھا پر اُس

نے لہجے کی حسرت سے میرا دل بھر آیا۔

"اگر چلو، تو میں تیار ہوں۔ کیوں مستری؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اس کا وہاں کون ہے چوہدری ماہنے؟ مستری نے پوچھا۔

"سارا گاؤں مستری!" میں نے کہا۔ "ہم گاؤں والوں کا دل بڑا کھلا ہوتا ہے۔ ہر بیٹی گاؤں کی بیٹی ہوتی ہے۔"

"جھوٹ۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔" مستری نے مجھے طنز بھری نگاہوں سے تک کر کہا۔

مستری کے مکان کے دو کمرے تھے۔ چھوٹا سا تنگ صحن۔ ایک کمرے میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ سارے شہر میں بجلی جلتی تھی لیکن مستری کے گھر لالٹین تھی جس کی چمنی ٹوٹی ہوئی تھی اور شعلے کے ساتھ دُھواں نکل رہا تھا۔ کمرے میں مٹی کے تیل کی بدبُو پھیلی ہوئی تھی۔ مستری نے مجھے چارپائی پر بٹھا کر پوچھا "چائے پیو گے چوہدری!"

میں نے انکار کر دیا۔ "گاؤں جا کر کیا کہو گے کہ مستری نے میری کوئی خدمت بھی نہ کی۔"

"نہیں میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔"

نجانے کیوں مستری کی اپنائیت کے باوجود میں اُس کے گھر میں اپنے آپ کو بھی بیگانہ سا لگ رہا تھا اور میرا دَم گھٹ رہا تھا۔

اتنے میں شیماں بھی اُسی کمرے میں آ گئی۔ لالٹین کی سرخ روشنی میں اُس کا چہرہ مجھے شلجم کی طرح پھیکا پھیکا سا لگا۔ اُس کے گالوں پر چھائیاں تھیں البتہ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، پیار سی آنکھیں۔ ان آنکھوں میں گاؤں والی شیماں کا سایہ سا موجود تھا۔ تب کڑوا دُھواں پھیلا اور شیماں کا چہرہ اس کے پیچھے چھُپ گیا۔

میں نے گھبرا کر کہا "مستری! میں اب چلوں گا۔"

"مستری نے کہا "شیماں! تم نے چوہدری ماہنے کی کوئی خدمت نہ کی۔"

"نہیں—— نہیں۔"

مستری میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے اُس کی مسکراہٹ میں خاموش قہقہوں کی مسلسل آواز سنی جیسے وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہو۔ تب اچانک خاموشی چھا گئی پر مجھے یوں لگا

جیسے چکّی کے پاٹ چل رہے ہوں—— گھرر—— گھرر—— اور پٹے گھوم رہے ہوں اور ٹھکو بول رہا ہو۔ گگ—— گگ—— گگ گگ

مستری نے پوچھا "چوہدری کی چکّی چلتی ہے؟"

"ہاں چلتی ہے۔" میں نے اپنی آواز کو پاتال سے آتے ہوئے سنا۔ مستری خاموش رہا تو میں نے کہا "اچھا! اب میں چلتا ہوں۔ ماسٹرجی ناراض ہوں گے۔"

میں مستری کے گھر سے یوں نکلا جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہو۔ میں نے مستری سے ہاتھ ملایا نہ شیماں کو خدا حافظ کہا۔ تنگ گلی نے مجھے بھینچ لیا تو مجھے گاؤں کی تنگ گلی یاد آ گئی جہاں میں نے شیماں کو پکارا تھا اور دو رویہ دیواروں نے میری آواز کو چُوس لیا تھا۔ گلی کے اندھیرے نے مجھے گرد کے اس بادل کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا جو آسمان پر چھا جاتا ہے تو زمین کا دَم گھُٹ کر رہ جاتا ہے۔ پھر نہ ہوا چلتی ہے، نہ کوئی بُوند برستی ہے۔ حبس اور گھٹن—— گلی یکدم ختم ہو گئی۔ بازار میں روشنی تھی اور زندگی کی گہما گہمی تھی۔ سُلّی اُس کونے پر کھڑا تھا جہاں گلی بازار میں مل جاتی تھی۔

اُس نے یکدم میرے سامنے آ کر پوچھا "مل آئے شیماں سے؟"

"نہیں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"نہیں؟" اُس نے حیران ہو کر کہا "میں نے تمہیں اُس کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔"

"سُلّی! سچ جانو شیماں وہاں نہیں تھی۔"

"جھُوٹ بولتے ہو ماہنے!"

"وہ شیماں وہاں نہیں تھی سُلّی جس کے ساتھ ہم آنگن میں کھیلا کرتے تھے۔"

"مستری تمہیں اپنے گھر لے گیا۔ مجھے لے کر کیوں نہ گیا حالانکہ ہمارے اُس پر بڑے احسان تھے؟"

"یہ بات اُس سے پوچھنا۔"

"میں نے اُس کا گھر دیکھ لیا ہے۔"

"چوروں کی طرح؟" میں نے پوچھا۔

"جس طرح بھی ہو' میں نے اُس کا گھر دیکھ لیا ہے۔"

"یہ تم نے کمینوں والی بات کی ہے۔" میں نے ذرا غصّے سے کہا۔

اُس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہمیں لڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اب چلو۔ نہیں تو ماسٹر صاحب ناراض ہوں گے؟"

مجھے نُبلی کا یہ مصالحتی رویّہ پسند نہ آیا۔ اس میں کچھ گلا ضرور تھا تاہم ہم دونوں اکٹھے واپس آئے۔ رات کی خاموشی میں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نہ کچھ سوچ سکتا تھا نہ دماغ کو سوچ سے خالی کر سکتا تھا۔ تب مجھے شہر میں گزرے آٹھ دس دن یوں لگے جیسے کئی سال ہوں اور گاؤں کی یاد ستانے لگی حالانکہ ابھی ہم نے ایک دن اور شہر میں رہنا تھا۔ اس سے اگلے دن ہمیں دوپہر سے پہلے پہلے گاؤں واپس پہنچ جانا تھا۔ ایک لہر سی آئی' خوشی کی لہر۔ میں گاؤں کے جوہڑ کے کنارے کھڑا تھا اور وہاں شیماں میرا انتظار کر رہی تھی۔

"تم نے شہر میں اتنی دیر لگا دی؟" شیماں نے پوچھا اور میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا اور رات خوشی کی اس لہر میں ڈوب گئی۔

شہر میں آخری دن بڑی رونق میں گزرا۔ یہ دن تھا بھی بڑا خوبصورت۔ دھوپ میں خُنکی بھی تھی اور چمک بھی۔ ہر چیز دُھلی دُھلی نظر آتی تھی۔ اس رات ہم نے منڈوا بھی دیکھا۔ اس کھیل کا نام پھیرے تھا یا لارے۔ پہلی بار سینما دیکھ کر عجیب سا احساس ہوتا ہے جیسے ہم زندگی سے کٹ گئے ہوں۔ تین گھنٹے گزرنے کے بعد آنکھوں سے جادو اُترتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میں نے سوچا "یہ کون سا گاؤں تھا جہاں میلوں ٹھیلوں میں لڑکیاں ناچتی گاتی ہیں۔ ہمارے ہاں مٹیاریں ایسی بے شرمی سے اُچھلتی کُودتی نظر آئیں تو لاٹھیاں چل جائیں اور وہ جوان جو شہر سے آیا اور ایک بھولی بھالی مٹیار کو جُل دے گیا' کس دُنیا کا رہنے والا تھا؟"

پر ایک بات ضرور ہوئی۔ میرے من میں ایک میٹھی میٹھی آگ لگ گئی تھی اور آگ کے شعلوں میں نہا کر شیماں نکھر گئی تھی۔ اب اس کے چہرے پر ایک بھی چھائی نہیں تھی۔ اگلے دن جب میں اپنا سامان سر پر اُٹھائے' گاؤں میں جوہڑ کے کنارے آیا تو وہاں کوئی شیماں میرے انتظار میں کھڑی نہ تھی البتہ بھا اسلم دکان کے تھڑے پر کھڑا مجھے گاؤں واپس آنے پر مسکرا مسکرا کر خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ گھر کے آنگن میں میری ماں کھڑی تھی اور

عائشہ اور زینت بھی اور میرا چھوٹا بھائی عبدالغفار بھی جو اب گلُ بہار کے پرائمری سکول میں پڑھتا تھا۔

اُس دن مجھے ماسی ریشم بھی ملی۔ اُس نے میری آنکھوں میں غور سے جھانکا۔ میں نے پوچھا "ماسی! ٹھیک ٹھاک ہو نا!"

"ہاں ٹھیک ہوں۔" اُس نے بدستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ماسی! میری آنکھوں میں کس کو تلاش کر رہی ہو؟"

"شیماں سے مل آئے ماہنے؟"

"ہاں!"

"لڑکیاں سسرال سے کبھی کبھار میکے بھی تو آتی ہیں ماہنے؟"

"آتی ہیں۔"

"پر اس بے چاری یتیم لڑکی کو میکے کون لائے گا؟"

"میں کیا بتاؤں ماسی؟"

"شیماں مستری کے ہاں خوش ہے؟"

"میں نے نہیں پوچھا۔"

"ماہنے!" ماسی ریشو کی آواز میں لکڑی جیسی سختی پیدا ہو گئی تو میں چونک گیا۔

"کیوں ماسی؟ کیا ہوا؟"

"تو شیماں کے گھر گیا تھا۔ وہ اسی گاؤں کی بیٹی ہے۔ اس سے حال چال پوچھنے میں کیا بُرائی تھی۔"

"ماسی میرا دل پتھر کا ہے۔"

"تو مجھ سے مل کر جاتا تو میں تجھے گاؤں والوں کی رسّت بتاتی۔ اُس کے لئے گھی' چاول' شکر کا تحفہ بھیجتی۔"

"اب تم چلی جاؤ نا ماسی!"

"جاؤں گی۔ مجھے کسی کا ڈر ہے۔ تم دیکھنا میں گاؤں کی بیٹی کے لئے کیا کچھ لے کر جاتی ہوں۔"

"کب جاؤ گی ماسی؟" میں نے پوچھا۔

"ماہنے! یہ پھاگن کا مہینہ ہے نا؟"

"ہاں!"

ماسی نے انگلیوں پر کچھ حساب کیا۔ میں اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ چہرہ جو لکڑی کی طرح سخت تھا اور جس پر تنی تنی جھرّیوں کا جال بچھا تھا' یکایک نرم پڑ گیا جیسے پڑا پانی میں بھیگ گیا ہو۔

اُس نے کہا "میں اگلے ہفتے شہر جاؤں گی۔ مجھے اُس کا پتہ دینا لڑکے۔"

"ضرور بتا دوں گا پر ماسی! تم انگلیوں پر کیا حساب کرتی رہیں؟"

"ماہنے!" ماسی نے درشت لہجے میں کہا "کچھ باتیں پوچھنے کی نہیں ہوتیں۔"

میں نے ماسی کے چہرے پر سُوکھے چمڑے کا کساؤ دیکھا تو چُپ ہو رہا۔

اُس دن میں گاؤں میں گھومتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اب گاؤں کے ساتھ میرا قریب کا تعلق ٹوٹ رہا ہو کیونکہ گاؤں سے ایک میل دُور رہ کر اب میں گاؤں سے زیادہ قریب نہیں رہ سکوں گا۔ دو چار گلیوں کے اینچ پینچ ایک نقطے پر ختم ہو جاتے تو میرا چکّر پھر سے شروع ہو جاتا۔ میں چوہدری کی چکّی پر بھی گیا۔ شیماں کے اُجڑے آنگن کے پاس سے بھی گزرا۔ چوہدری کی حویلی کے گرد بھی گھوما۔ تب میں کُل بہار کو جانے والی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف گندم کے کھیت تھے اور ان کھیتوں پر سنہری دھوپ کا پردہ سا تنا تھا۔ باغیچی کے سبز فرش پر سنگترے اور مالٹے کے پودوں کا سایہ تھا۔ میں ایک مدت بعد اس باغیچی میں آیا تھا۔ میں اپنے بچپن کے دوست مالٹے کے پودے کے نیچے بیٹھا تو میں نے سوچا وہ رنگ برنگی چڑیا ابھی آئے گی اور مجھ سے ہم کلام ہو جائے گی اور جب تتلی کے اُڑتے ہوئے رنگوں کا دھیما نغمہ میرے کانوں میں رَس گھولنے لگے گا اور دھنک کے سات رنگ نیلے آسمان تک پُل بنائیں گے تو گاؤں کی طرف سے ڈھول کے بجنے کی آواز آئے گی اور میرا بچپن زندہ ہو جائے گا۔

پر ایسا نہ ہوا اور میں گاؤں لوٹ آیا۔

دوسرے دن میں نے کتاب کو آخری سلام کیا اور کنویں پر جا پہنچا اور اب کی بار مجھے کتاب سے' بچھڑتے ہوئے اتنا صدمہ نہ ہوا جتنا پہلے ہوا تھا۔ شاید زندگی کی ایک منزل بیت گئی تھی۔ اُس وقت تو مجھے اس کا احساس نہیں تھا لیکن اب جب کہ میں اپنی ذات کو

اپنے گاؤں سے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو لگتا ہے جیسے گاؤں کی کہانی میری اپنی ہی ذات کے گرد گھوم رہی ہے۔ میں کہتا ہوں۔ "منشی عبدالرحمٰن اپنی کہانی نہ لکھو' گاؤں کی کہانی لکھو۔" جب سوچتا ہوں تو میں اپنے آپ کو گاؤں سے الگ بھی نہیں کر سکتا اور یوں گاؤں کی کہانی ہے بھی تو نہایت مختصر۔ اس میں سارا پھیلاؤ تو میری ذات کی وجہ سے آیا ہے۔

میری عمر کے اٹھارویں سال کا آغاز اُسی وقت ہوا' جب ہمارا نتیجہ نکلا! میں اپنی جماعت میں اوّل آیا تھا۔ فُلّی کا پانچواں یا چھٹا نمبر تھا۔ کسی ہائی سکول میں میرے داخلے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ ہمارے گاؤں کے نزدیک کوئی ہائی سکول نہ تھا۔ اپنے ہم جماعتوں میں فُلّی ہی وہ خوش قسمت لڑکا تھا جسے شہر کے ایک ہائی سکول میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ چوہدری نے اُسے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا تھا۔ باقی سب مٹی کے ساتھ مٹی بن جانے کو پیدا ہوئے تھے۔ ہم نے ہل کی ہتھّی پر ہاتھ رکھ لئے۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۱۲

○

گاؤں کے لوگوں کو گپ شپ کے لئے فرصت کم ہی ملتی ہے تاہم شاملات دیہہ میں سے ایک ٹکڑا سماجی میل ملاپ کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اسے ہمارے گاؤں والے دائرہ کہتے ہیں۔ کئی جگہ اسے تکیہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ عام طور پر قبرستان ملا ہوتا ہے اور اس کے ایک کونے میں مسجد بھی ہوتی ہے۔ تکیے کی دیکھ بھال کے لئے جو آدمی مقرر ہوتا ہے، اسے فقیر کہتے ہیں۔ گاؤں کی فصل میں اس کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ تکیے میں سایہ دار درخت لگے ہوتے ہیں۔ گرمیوں میں سائے کے نیچے اور سردیوں میں دھوپ میں چٹائیاں بچھی ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے بچپن میں یہاں پنچائتیں لگتی دیکھی ہیں، یہاں گاؤں کی باراتیں آتیں، یہیں نٹ، بازی گر اور سپیرے اپنا تماشا دکھاتے۔ یہیں ایک دو بار رہس بھی لگی تھی پر میرے دیکھتے دیکھتے تکیے کی بہار رخصت ہو گئی اور سماجی میل ملاپ کا مرکز چوہدری کی حویلی میں بدل کر آ گیا۔ اب میں سوچتا ہوں تو مجھے اس تبدیلی کے سبب کا پتا نہیں چلتا تاہم ایسا ہوا ضرور، چوہدری کی حویلی میں سہ پہر کو چارپائیاں بچھ جاتیں اور اکا دکا لوگ وہاں آ بیٹھتے۔ چوہدری کا کڑوا تمباکو بھی اپنے اندر خاصی کشش رکھتا تھا۔

تب گاؤں میں سماجی بیٹھک کا ایک اور مرکز بن گیا۔ یہ مرکز بھا اسلم کی صاف ستھری دکان کے تھڑے پر بنا۔ یہ تبدیلی اچانک نہ ہوئی۔ بھا اسلم اس سے خوش نہیں تھا۔ وہ اپنی دکان پر گاؤں کے گھبروؤں کو زیادہ دیر نہ ٹھہرنے دیتا۔ چنانچہ اُس نے دکان پر حقہ نہ آنے دیا۔ تھڑے پر صرف ایک چارپائی ہوتی۔ اس چارپائی پر بھا اسلم سوتا تھا۔ تب ایک دن چوہدری رحمت خان اپنا حقہ لئے ہوئے دکان پر آیا تو بھا کو اس کی خاطر تواضع کرنی پڑی۔ اس نے اسے شربت کا ایک گلاس پیش کیا تو رحمت خان بہت خوش ہوا۔

اُس نے کہا "کسی اچھے خاندان کے آدمی لگتے ہو؟"

بھا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک دو گاہکوں کو بھگتانے کے لئے دکان کے اندر چلا گیا۔ پھر حقے نے اپنا اثر دکھایا۔ دو چار آدمی اور تھڑے پر آ کر کھڑے ہوئے تو بھا کو ایک بوری بچھانی پڑی۔ اب باقاعدہ حقے کا دور چلنے لگا اور گاہے گاہے بھا کو کہنا پڑتا "چوہدری رحمت خان جی! مجھے خطرہ ہے سفید پوش اس کو پسند نہیں کرے گا۔"

"کیوں پسند نہیں کرے گا؟"

"دکان پر گاؤں کی لڑکیاں بھی آتی ہیں۔ یہاں لڑکے جمع ہونے لگے تو چوہدری کو دشمنی کا موقع مل جائے گا؟"

"اسلم! اوّل تو تیرے جیسے جوان کو ہتّی نہیں ڈالنی چاہئے تھی۔ ہم نے زبردستی ڈلوائی تو تمہاری شرافت کی ضمانت دی۔ تیرے ہوتے ہوئے ہتّی پر ایسے ویسے آدمی کو آنے کی جرات نہ ہو گی۔"

بھا نے شہر آنے جانے کے لئے سائیکل خرید لی تھی۔ وہ دوسرے تیسرے دن اخبار بھی خرید لاتا۔ اُس دن شام کو میں گاؤں ضرور آتا۔ اُسے پڑھ کر سنانے کا کام میرے سپرد تھا۔ اُس زمانے میں اخبار کی خبروں میں کوئی خاص بات نہ ہوتی۔ کشمیر میں مدت سے جنگ بندی ہو چکی تھی۔ قائداعظم وفات پا چکے تھے۔ لاہور اور کراچی ہم سے بہت سے دُور تھے۔ ہم ان لوگوں کو جو حکومت چلا رہے تھے، بالکل نہیں جانتے تھے۔ ہمارے علاقے کا ممبر بھی کبھی ہمارے گاؤں نہ آیا تھا۔ اور تو اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے مقامی ممبر کی بھی ہم نے شکل نہ دیکھی تھی، تاہم گاؤں کی سیاست پر بحث ہوتی تو چھوٹے چھوٹے معاملے ہمارے لئے بہت بڑے بن جاتے۔ شادی بیاہ، رشتے ناطے کی باتیں ہوتیں۔ بابا متّھو خرادیے کے مکان پر چوہدری نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس مکان کی زمین شاملات دیہہ تھی۔ مکان کا ملبہ بابا متّھو کی ملکیت میں تھا۔ اس میں چوہدری نے اپنی چکّی کے نئے مستری کو بٹھا دیا تھا جو بال بچوں والا آدمی تھا۔ چوہدری رحمت خان کو خطرہ تھا کہ سفید پوش شاملات دیہہ پر قابض ہو جائے گا۔ اس موضوع پر خاصی گرم بحث ہوتی۔ اس سلسلے میں شیماں کا ذکر آتا تو چہروں کا رنگ بدل جاتا۔ جب مغرب کی اذان ہوتی، تو محفل برخاست ہو جاتی۔

میں تھڑے کی بیٹھک میں اکثر شریک ہوتا۔ خاص طور پر اُس دن ضرور آتا جب بھا شہر سے اخبار لاتا۔ میں سورج ڈوبنے پر گھر جاتا اور کھانا کھا کر باپ کی روٹی کنوئیں پر لے

جاتا۔ ایک دن میں رات پڑے کنویں پر جا رہا تھا تو دکان کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے حمیداں کو دیکھا جو دن کی روشنی میں کبھی دکان پر نہ آیا کرتی تھی۔ حمیداں سے ملے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ گلی کی نکڑ پر کھڑی تھی۔ بھا کی دکان میں لالٹین جل رہی تھی۔ بھا اکیلا تھڑے پر بیٹھا تھا۔ میں نے اچانک اسے پکارا تو وہ چونک گئی۔

"کون ؟" اُس نے پوچھا۔

"میں ہوں ماہنا!"

"ماہنے ! تُو نے مجھے ڈرا دیا۔"

"بھلا ڈرنے کی کیا بات تھی ؟"

"کوئی بھی نہیں تھی۔ بعض اوقات آدمی اپنے سائے سے بھی ڈر جاتا ہے۔"

"ہاں ! دل میں چور ہوتا ہے' تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

"میرے دل میں تو کوئی چور نہیں ماہنے !"

"میں نے یونہی بات کی تھی حمیداں! پر یہ تو بتاؤ تم رات کے اندھیرے میں چھپکے چوری یہاں کیوں آئیں؟ ہٹی سے کوئی چیز لینی ہے؟"

"نہیں تو۔ گاؤں کی گلی سے گزرنے کا حق تو سب کو ہے نا ماہنے؟"

"ہاں ! کیوں نہیں ؟"

"پھر تُو نے کیوں شک کیا؟"

"نہیں تو۔۔۔" میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا "میں چلتا ہوں۔ مجھے دیر ہو جائے گی کنویں سے۔"

میں نے اس کی اجازت کا انتظار کئے بغیر قدم بڑھا لئے۔ دو چار قدم چلنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ حمیداں وہیں کھڑی تھی۔ پھر اندھیرے نے مجھے نگل لیا یا حمیداں کو میں نہیں جانتا پر میرا جی ڈوب گیا۔ "غم اپنا ہو یا کسی کا' اس میں اتنی اپنائیت کیوں ہوتی ہے۔" میں نے سوچا "خوشی میں ہم ایک دوسرے کے غیر کیوں ہو جاتے ہیں؟" مجھے اس سوچ کا جواب نہ ملا پر مجھے حمیداں پر ترس آیا۔ وہ گلی کی نکڑ کے اندھیرے میں چھپ کر کسے دیکھ رہی تھی؟ میں اس کا جواب جانتا تھا۔ دو تین دنوں کے بعد میں نے بھا سے اس کا ذکر کیا تو اُس کا چہرہ اُتر گیا۔

اس نے کہا "ماہنے! وہ پگلی لڑکی مجھے کسی مصیبت میں پھنسا دے گی۔"

"کیوں بھا؟"

بھا کو میرے سوال کی معصومیت پر ہنسی آئی۔

اُس نے کہا "ماہنے ! تم جانتے ہو اور پھر بھی مجھ سے پوچھ رہے ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بھا۔" میں نے ایک آہ بھری۔

"وہ پگلی لڑکی ہر دوسرے تیسرے دن گلی کی نکڑ پر اندھیرے کی آڑ پکڑ لیتی ہے۔ میں اَس کا سایہ دیکھتا ہوں۔ وہ لالٹین کی مدھم روشنی میں میرا چہرہ ضرور دیکھتی ہو گی۔ وہ مجھے دیکھنے کے لئے آتی ہے ماہنے! اُس سے کہہ دو' وہ نہ آیا کرے۔"

میں اس خبر سے کانپ گیا۔ میں نے بھا سے کوئی وعدہ نہ کیا پر میں حمیداں سے ملنے کے موقع کی تلاش میں لگا رہا۔ تب مجھے موقع مل گیا۔ میں اُس سے چکی پر ملا۔ میں دانے پسوانے کے لئے خود وہاں گیا تھا۔ اس دن میرا جی نہ چاہا کہ عائشہ یا زینت دانے لے کر چکی پر جائیں حالانکہ جب سے وہ جوان ہوئی تھیں' میری ماں سائے کی طرح ان کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ یوں میں اتنی کڑی نگرانی کے حق میں نہیں تھا۔ مجھے ان پر پورا پورا اعتبار تھا۔ دانے پس گئے تو میں نئے مستری سے گپ شپ لڑانے کو کچھ دیر کے لئے رک گیا۔ اس وقت اتفاق سے حمیداں وہاں آ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئی اور میں اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ مستری ایک پٹہ بٹھانے کے لئے چکی والے کمرے میں گیا تو مجھے ترکڑ کے پاس کھڑے کھڑے ایک بات کرنے کا موقع مل گیا۔

میں نے کہا "حمیداں بھا اسلم کہہ رہا تھا' تم اُسے دیکھنے کے لئے ہٹی پر نہ آیا کرو۔" حمیداں کے چہرے کا رنگ کچھ پھیکا سا پڑ گیا۔ سانولا رنگ زرد نہیں پڑتا' سنولاہٹ ذرا بھر کو مرجھائی مرجھائی سی لگی تو مجھے اپنی بات پر افسوس ہوا۔ مجھے پڑھ لکھ کر بھی بات کرنے کا ڈھنگ نہیں آیا تھا۔ میں حمیداں کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کی کوئی سبیل سوچ رہا تھا کہ مستری آ گیا۔ میں نے اپنا آٹا تلوایا۔ مستری کی مدد سے سر پر رکھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

اس شام میں نے بھا کو بتایا کہ میں نے اس کا سندیسہ حمیداں تک پہنچا دیا ہے۔ جب میں دوسرے دن بھا سے ملنے کے لئے ہٹی پر آیا تو وہ بڑا بے چین سا لگ رہا تھا۔ ابھی شام

کی محفل نہیں لگی تھی۔ بھا نے تنہائی کو غنیمت سمجھ کر کل رات کا واقعہ مجھے سنایا۔ کل رات گلی کی نکڑ کے سائے میں کچھ دیر کھڑی رہ کر حمیداں اس کے تھڑے پر آگئی تھی۔ اس نے کہا "ہٹّی والے ریشم کے لچھّے ہیں؟"

بھا اس آواز پر کانپ گیا۔ اس نے کہا "نہیں ہیں۔ گاؤں میں ریشم کون خریدتا ہے۔ یہاں تو سُوتی دھاگا بکتا ہے بی بی!"

"یاد ہے جب تم نے یہ ہٹّی کھولی تھی میں ریشم کے لچھّے خرید کر لے گئی تھی۔"

"بی بی اس کے بعد تم ہٹّی پر نہ آئیں اور میں نے ریشم کے لچھّے لانے چھوڑ دیئے۔"

"تم مجھے بی بی کیوں کہتے ہو۔ میرا نام تو حمیداں ہے ہٹّی والے!"

"میں ہٹّی والا ہوں۔ میں گاؤں کی ہر مٹیار کو بی بی کہتا ہوں" بھا اسلم نے کہا۔

"مجھے بی بی نہ کہنا' میرا تیرا رشتہ کچھ اور بنتا ہے۔"

"نہیں!" بھا نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "میرا تیرا کوئی رشتہ نہیں بنتا۔ میں تو گاؤں کے لئے اجنبی ہوں۔ دیکھ بی بی! تیرے دل میں جو خیال ہے' اُس کو دل سے نکال دے۔ میں نے ماہنے کی زبانی ایک سندیسہ بھیجا تھا' وہ تمہیں مل چکا ہے نا؟"

اُس کے بعد جو کچھ ہوا بھا اسلم اُس پر بہت حیران تھا۔ حمیداں پہلے اُس کی بات پر مسکرائی' پھر رو پڑی' وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ تب اُس نے بھا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "میں جاٹ کی بیٹی ہوں ہٹّی والے! میرا تھڑے پر آیا ہوا قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اب میں دن کی روشنی میں تیری ہٹّی پر آیا کروں گی۔"

قصّہ ختم کر کے بھا تھڑے پر بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے ہاتھ چہرے سے اٹھا لئے اور پوچھا "ماہنے! اب بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"اپنے دل سے پوچھو بھا!"

بھا کچھ بات کرنے ہی والا تھا کہ چوہدری رحمت خاں حقّہ لئے ہوئے آگیا۔ بھا نے اسے چارپائی پر بٹھلایا۔ آہستہ آہستہ محفل لگ گئی۔ باتیں شروع ہوئیں' تو بھا اسلم کی توجّہ بدل گئی۔ تب گاؤں کی عورتیں اکّا دکّا نمک مرچ' ہلدی' تیل لینے کے لئے دکان پر آنے

لگیں۔ ان میں لڑکیاں بالیاں بھی تھیں اور مٹیاریں بھی۔ بھا نے عورتوں میں سے کسی کو چاچی کہا' کسی کو ماسی۔ لڑکیوں بالیوں اور مٹیاروں کو اُس نے بی بی کہہ کر مخاطب کیا۔ سودا دیتے وقت اُس نے نگاہیں نیچی رکھیں۔ ایک دو مٹیاروں نے کچھ کھُسر پھُسر بھی کی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے بھی کئے۔ میں ان اشاروں کو سمجھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک دوسری سے کہہ رہی ہیں "یہ مہاجر لڑکا تو لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلا ہے کسی کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔" مجھے پتہ تھا کہ بھا اسلم کی اس ادا سے مٹیاریں خوش نہیں۔ مُن کے مَن میں کھوٹ ہو یا نہ ہو پر جوانی ایک دوسرے سے محبت یا تعریف کی ایک نظر کا دان تو ضرور مانگتی ہے۔ بھا اسلم تحمّل سے کام لے رہا تھا۔ تب اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں حمیداں آئی تو سب لوگ چونک گئے' حتیٰ کہ چوہدری رحمت خاں حقّے کی نے منہ میں لے کر برف کی طرح جم گیا۔

اس نے کہا "ہٹّی والے' کھوپا' بادام' سونگی ہے تمہاری ہٹّی پر؟"

"کیوں نہیں بی بی؟" بھا اسلم نے مسکرا کر کہا۔

مجھے یہ اُمیّد نہیں تھی کہ حمیداں کی بات کا جواب بھا مسکرا کر دے گا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اس موقعے کے لئے کل سے تیاری کر رہا ہے۔ اگر وہ جھینپتا یا شرماتا یا اُس کی زبان لڑکھڑا جاتی تو میں بھی گھبرا جاتا۔ میں خوش تھا کہ بھا نے اپنے حواس قائم رکھے۔

چوہدری رحمت خاں نے پوچھا "حمیداں بیٹی! آج کوئی مہمان آ رہے ہیں؟"

"ہاں! چاچا۔"

"سیدپور سے آ رہے ہیں نا حمیداں؟" ایک مٹیار نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا؟" حمیداں نے تنک کر کہا۔

چوہدری رحمت خاں نے مسکرا کر حقّے کا کش لیا تو ساری فضا بدل سی گئی۔ اُس میں وہ گھُٹن نہ رہی جو تھوڑا عرصہ پہلے تھی۔

حمیداں سودا لے کر چلی گئی تو چوہدری رحمت خاں نے کہا "سنا ہے سیدپور کا ذیلدار ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبری کے لئے کھڑا ہو رہا ہے۔"

"وہ اتنا خرچ کرنے کے لئے جگر کہاں سے لائے گا؟" بابا حیات نے پوچھا۔

"خرچ کیوں نہیں کرے گا۔ کوئی بھک منگا تو نہیں۔ بخت والا آدمی ہے۔"

"ہے تو سہی پر رحمت خاں! خرچ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"سید پور کے ذیلداروں کا خاندان کنجوسی کے لئے مشہور ہے۔ اس کا باپ خدا بخشے جب اپنے کھیتوں میں دھان کی پنیری لگواتا تو قریب سے گزرنے والے راہیوں کو پکڑ کر بیگار میں لگا لیتا' یہاں تک کہ دھان کی فصل میں کوئی راہی اس کے کھیتوں کے قریب نہ پھٹکتا۔" ایک اور جاٹ بولا۔

"پر مسافروں کی مہمان نوازی سوکھی روٹی اور لسوڑوں کے اچار سے بھی تو ہوتی۔" بابا حیات نے کہا اور اس کی بات پر ایک قہقہہ پڑا۔

"اس کے مرنے پر جب اس کے بیٹوں میں دولت بٹی تو چاندی کے روپے ترکڑی میں تول تول کر دیئے گئے۔" چوہدری رحمت خاں نے کہا "بابا کیا یہ بات سچ ہے؟"

"کون جانے پر لوگ کہتے یہی ہیں۔"

ابھی اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ سفید پوش دکان پر آ نکلا۔ اس نے ظاہر کیا کہ وہ اتفاق سے اس طرف گزرا ہے پر لوگوں کے ماتھے ٹھنک گئے۔

چوہدری رحمت خاں اور بابا حیات نے چارپائی کے سرہانے کی طرف جگہ بناتے ہوئے کہا "آؤ چوہدری! بیٹھو۔"

"نہیں! میں تو یہ دیکھنے آیا تھا کہ مہاجر لڑکے کی ہٹی کیسی چل رہی ہے؟"

"جی اللہ کے فضل سے گزارا ہو رہا ہے۔" بھا نے جواب دیا۔

"چوہدری! اس سال باڑی کیسی رہی؟"

"اللہ کی رحمت ہے۔" چوہدری رحمت خاں بولا۔

"آج سید پور کا ذیلدار میرے ہاں آ رہا ہے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"مغرب کی نماز پڑھ کر آ جانا میرے ہاں۔ ذرا گپ شپ رہے گی۔"

"گپ شپ یا کوئی اور خاص بات بھی ہے؟" چوہدری رحمت خاں نے پوچھا۔

"ہے بھی اور نہیں بھی۔ ذیلدار ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبری کے لئے کھڑا ہو رہا ہے۔"

"خاص بات تو ہوئی چوہدری۔ اور لوگ بھی آئیں گے؟" بابا حیات نے کہا۔

"کہو تو کچھ اور لوگوں کو بھی بلوا لوں۔"

"تیری مرضی ہے۔"

"تم جانتے ہو میں بھائیوں کے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔"

اس گفتگو کے دوران کچھ جوان لڑکے بھی ہٹی پر جمع ہو گئے تھے۔ چوہدری نے انہیں دیکھا تو اس کا رنگ بدل گیا۔ "تمہیں کوئی کام نہیں جو ہٹی پر میلہ لگا لیتے ہو۔"

"چوہدری! تم جانتے ہو فصل کٹنے کے بعد کچھ دنوں کی فراغت ہوتی ہے۔ اساڑھ کا پہل چھلا پڑا تو کسی کو ہٹی کا رُخ کرنے کا خیال بھی نہیں آئے گا۔" چوہدری رحمت خاں بولا۔

"میں نے مہاجر لڑکے کو ہٹی دینے سے پہلے خبردار نہیں کیا تھا کیا؟"

"چوہدری! ممبری کا چناؤ کب ہو رہا ہے؟" بابا حیات نے بات کا رُخ بدلنے کے لئے کہا۔

"میرا خیال ہے برسات گزرنے پر۔"

تب باتوں باتوں میں شام پڑ گئی تو چوہدری سب کو اپنے ہاں آنے کی تاکید کرتا ہوا گھر چلا گیا۔ اُس وقت بھا نے کہا "چوہدری رحمت خاں جی! میں نے جو بات کی تھی وہ سچ نکلی نا؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو پر تیری ہٹی پر گھبروؤں کے آنے پر چوہدری کو اتنا اعتراض نہیں جتنا ہمارے یہاں بیٹھنے پر ہے۔"

"کیوں؟"

"اس کی چودھراہٹ میں فرق آ رہا ہے۔" چوہدری رحمت خاں بولا۔

اُس رات چوہدری کی حویلی میں برادری کے لوگ جمع ہوئے۔ میں تو نہ گیا لیکن میرا باپ اس محفل میں موجود تھا۔ اُس نے بتایا کہ ذیلدار ہر چھوٹے بڑے سے بڑے تپاک سے پیش آتا رہا۔ خیر خیریت کی خبر پوچھتا رہا اور گزشتہ چار پانچ سالوں میں ہونے والی موتوں پر اظہارِ افسوس کرتا رہا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ مطلب پر پہنچا تو برادری کے لوگوں نے اُسے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اُس نے گاؤں والوں سے بہت سے وعدے کئے۔ ایک وعدہ یہ تھا کہ وہ ہمارے گاؤں میں پرائمری سکول کھلوائے گا۔

"چوہدری موج دینا! جب سکول کھلے گا تو میری طرف سے وعدہ ہے کہ عبدالرحمٰن کو

"اس بھولے بھالے مہاجر لڑکے کی' اور اس کی بھی جو اس کے لئے باؤلی ہو رہی تھی۔"

"ماسی! یوں لگتا ہے جیسے تو نے کشتیاں پار کرانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ پتا نہیں تو کیا چیز ہے کہ ہر ایک کے راستے میں چٹان بن کر کھڑی ہو جاتی ہو۔ کسی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہو کہ دیکھو ایک بے آسرا لڑکی کے کان تک اپنے مَن کا سندیسہ نہ پہنچانا اور کسی سے کہتی ہو کہ مہاجر لڑکے اس گاؤں میں ہٹی نہ ڈالنا۔" میں نے غصے میں آ کر کہا۔

"ماہنے!" ماسی نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں شیماں کو گاؤں سے نہ جانے دیتی اور حمیداں کا بیاہ بھی مہاجر لڑکے سے کروا دیتی پر کبھی ایسا بھی ہوا ہے۔"

"میں نہیں جانتا۔"

"اُس کی طرح کوئی گاؤں ہی سے منہ کالا کر جائے تو اور بات ہے۔"

"وہ کون ؟"

"تو جانتا ہے ماہنے! پھر مجھ سے پوچھتے ہو۔"

"ہاں وہی۔ اب یاد آیا۔ تو ابھی تک اسے نہیں بھول سکی ماسی!"

"میں اُس پر لاکھ بار لعنت بھیجتی ہوں۔ وہ میرا کیا لگتا ہے ماہنے ؟"

"کچھ بھی نہیں۔ پر تیرے دل میں ابھی تک وہی بیٹھا ہوا ہے۔ تو بھا کی شکل صورت میں بھی اسی کا عکس دیکھتی ہے نا؟"

"ماہنے! ایسی باتیں نہ کر۔ تجھے پتا ہے وہ مستری کہاں رہتا ہے؟"

"شہر میں۔۔۔ تو کیوں پوچھ رہی ہے اُس کا پتا؟"

"اب وقت آ گیا ہے۔"

"پہیلیوں میں باتیں کر رہی ہو۔"

"جا جا میرا سر نہ کھا۔ میں مہاجر لڑکے سے بات کروں گی۔" ماسی نے درشتی سے کہا اور میں ہنستا ہوا اُس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

اس شام بھا کی دکان پر جو محفل لگی' اس میں کل والے اکھ پر گفتگو ہوتی رہی۔ جب میں گھر سے کھانا کھا کر کنویں پر جا رہا تھا تو بھا نے مجھے دکان پر روک لیا۔ اس نے

اس میں منشی ضرور لگوا دوں گا۔" سفید پوش نے کہا۔

"جب ماہنے کو تم گل بہار کے مدرسے میں داخل کروانے کے لئے گئے تھے تو تمہارا وعدہ تھا تم اسے پٹواری لگواؤ گے۔" میرے باپ نے کہا۔

"مجھے یاد ہے۔ ذیلدار کو ممبر ہو لینے دو پٹوار بھی کوئی بڑی بات نہیں۔"

اس کے بعد ذیلدار نے برادری کے اس اجتماع میں یہ اعلان بھی کیا کہ وہ اور سفید پوش ایک زیادہ گہرے رشتے میں منسلک ہونے والے ہیں۔ یہ رشتہ ذیلدار اور سفید پوش کے درمیان نہیں بلکہ سیدپور اور چک مراد کے درمیان ہے۔ "آج سے سیدپور اور چک مراد ایک ہیں۔" ذیلدار نے کہا اور برادری کے سب سے بوڑھے فرد بابا حیات کے ساتھ گلے ملا اور سفید پوش کے گھر میں یہی رسم گاؤں کی عورتوں نے ادا کی۔ کچھ کپڑوں اور شیرینی کا تبادلہ ہوا۔ حاضرین میں بتاشے بانٹے گئے اور محفل برخاست ہو گئی۔

اپنے باپ سے یہ خبر نامہ سن کر میں خوش ہوا۔ خوشی کس بات پر؟ میں ابھی اس کا کھوج بھی نہ لگا سکا تھا کہ غم کا ایک ریلا آیا اور میں اس میں بہہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے رہس دیکھتے دیکھتے کھیل کا وہ موڑ آ گیا ہے جہاں دیکھنے والا انجام سے باخبر ہو جاتا ہے اور جوں جوں انجام قریب آتا ہے اس کا دل دھڑکتا ہے۔ اگلے دن میں نے بھا اسلم کو خوش و خُرم دیکھا تو مجھے اطمینان کی بجائے مایوسی ہوئی۔ نجانے انسان کس مٹی سے بنا ہے کہ اُسے ساری عمر اپنے آپ کی خبر نہیں ملتی پر جس زمانے کی یہ بات ہے' میں اٹھارہ سال کا تھا اور اٹھارہ سال کی عمر میں زندگی ایک تماشا لگتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ ہر تماشے کا خاتمہ اس کے ارمانوں اور ولولوں کے مطابق ہو۔

اُس دن ماسی ریشم سے بھی ملاقات ہوئی۔

اُس نے چھُوٹتے ہی کہا "ماہنے! میں آج بہت خوش ہوں۔"

"کیوں ماسی ؟"

"مجھے مہاجر لڑکے کا بڑا خیال تھا۔ اُس نے جب سے گاؤں میں ہٹّی ڈالی تھی' میرا دل دھڑک رہا تھا۔ کل رات جو فیصلہ ہوا اُس سے کشتی کنارے پر لگ گئی۔"

"کس کی کشتی ؟" میں نے پوچھا۔

مستری کے کارخانے اور گھر کا پتہ پوچھا۔ مجھے اُس کے کارخانے کا نام یاد تھا' نہ اُس کی گلی کا۔ میں نے الم غلم کچھ پتا نشان دیا تو بھانے کہا کہ وہ اب اُس کو تلاش کر لے گا۔ میں نے ماسی ریشم کے متعلق کہا "بھا وہ تو پگلی عورت ہے۔ تو اُس کی باتوں میں آ گیا۔"

"نہیں ماہنے! وہ پگلی نہیں۔ اُس کی سینے میں سونے کا دل ہے' کھرا اور پاک۔ چراغ لے کر ڈھونڈنے نکلو تو دُنیا جہان میں ایسا دل نہ ملے۔"

اُس سے اگلے دن بھا کی دکان بند رہی۔ وہ سائیکل پر سودا پتر لانے کے لئے شہر گیا تھا۔ وہ شام کو دیر تک نہ لوٹا تو سہ پہر کی محفل بھی نہ لگی۔ البتہ گاؤں میں یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ ماسی ریشم گھی اور گڑ لے کر صبح سویرے منہ اندھیرے گھر سے نکلی اور نجانے کہاں گئی تھی۔ یہ خبر لوگوں کے لئے اچنبھا تھی۔ صرف میں اور بھا اس بھید سے واقف تھے۔ میں گھر سے کھانا کھا کر نکلا تو گلیوں میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ بھا کی دکان کے پاس گزرا تو اس کی سائیکل کھڑکھڑائی۔

میں نے پوچھا "بھا! بہت دیر کر دی آج تو نے؟"

"ماسی کو مستری کے گھر پہنچانے میں دیر ہو گئی۔"

"مستری اُسے دیکھ کر خوش ہوا؟"

"ماہنے! بڑا مزہ آیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر پہلے حیران پریشان کھڑا رہا' پھر بے اختیار ہنس پڑا ماسی ریشم نے کہا کالے منہ والے مجھے گھر لے چل۔ اُس نے کارخانے سے چھٹی لی اور ماسی کے آگے آگے چل پڑا۔ میں وہیں سے لوٹ آیا ماہنے!"

"تم اس کے گھر کیوں نہ گئے بھا؟"

"میرا جانا کچھ ضروری تھا ماہنے؟"

"نہیں تو۔"

بھا نے سائیکل کھڑی کی' دکان کا تالا کھولا اور لالٹین جلائی۔ میں کنویں کی طرف چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ کنویں کو جانے والی پگڈنڈی کے موڑ بل کھائیں گے تو میری سوچ کے پیچ کھلتے چلے جائیں گے پر میری سوچ کنڈلی مارے سانپ کی طرح سوئی رہی اور میں چلتا رہا حتیٰ کہ کنواں آ گیا اور سارا دن چلنے والی لو کے گرم جھونکوں میں شفتل کے سیراب کھیتوں اور درختوں کے سرسراتے ہوئے پتوں کی خنکی رچی تو میں یکایک تھک گیا۔ اتنا تھک گیا کہ

کھاٹ پر لیٹتے ہی سو گیا۔ اس رات مجھے کوئی خواب بھی نہ آیا۔ اس نیند کے عالم میں اساڑھ کی پہلی بارش ہوئی اور سوکھے کھیتوں سے نرم گرم گھاس کی خوشبو اٹھی اور ماسی گاؤں کو لوٹ آئی۔ اس وقت تک گاؤں میں ماسی کے شہر جانے کا بھید کھل چکا تھا۔ ماسی جب تک شہر میں رہی لوگ پیٹھ پیچھے اس کو مذاق کرتے رہے۔

"ست پتری دھی کا جنا لے کر گئی تھی۔"

"چلو بچاری کا ساری عمر کا ارمان تو نکل گیا۔"

"نہ پتر نہ پوترے۔ نہ دھی نہ دھوترے! اس کالے منہ والی کو دھی بنا کر کیا ملا اس اوتر نکھتر کو۔"

"وہ تو مستری کے ساتھ منہ کالا کر کے شہر چلی گئی تھی۔ اس نگوڑی کو وہاں جا کر کیا ملا؟"

ماسی کے منہ پر کسی کو بات کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ بھا کی دکان پر لگنے والی محفلوں میں اس کا ذکر نہ آیا البتہ سفید پوش ان دنوں گاؤں سے روپوش رہا۔ کم از کم دن کی روشنی میں کسی نے اسے گاؤں میں نہ دیکھا۔ تب یہ معاملہ برسات کی آمد آمد میں ڈوب گیا جیسے پروا اسے اڑا لے گئی ہو یا موسلادھار بارش کا ایک ریلا اسے بہا لے گیا ہو۔ میں ان دنوں سویا سویا رہا اور افواہیں جاگتی رہیں۔ جب افواہیں سو گئیں تو میں جاگ اٹھا۔

تب میں نے بھا سے پوچھا "ماسی شہر سے کیا خبر لے کر آئی؟"

بھا نے حیران ہو کر مجھے دیکھا "اتنے دنوں بعد پوچھ رہے ہو ماہنے؟"

"ہاں بھا!"

"مستری کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔"

میں حیران سا ہو گیا تو بھا اسلم مسکرانے لگا۔

انہیں دنوں چوہدری رحمت خاں نے ہمیں اپنے تین کھیت بٹائی پر دے دیئے۔ اب میرے لئے بھی کام نکل آیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا "مصروف آدمی دنیا جہان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھول جاتا ہے۔ سچ ہے کام سے جہان ہے۔" اب مجھے ہٹی پر آنے کا موقع بھی کم ملتا۔ کبھی کبھار باپ مجھے کسی بہانے ضرور بھیجتا۔ گاؤں اور کنویں کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے پر جب بھی میں گاؤں آتا مجھے فضا میں ایک بے نام سا نیا پن نظر آتا۔ ان

دنوں ہٹی پر جمع ہونے والے لوگ مجھ سے اخبار پڑھوا کر سنتے۔ پھر ڈسٹرکٹ بورڈ کے الیکشن ہوئے۔ ہمارے گاؤں میں تھوڑی سی حرکت پیدا ہوئی۔ ہمارے گاؤں کے سارے ووٹ ذیلدار کو پڑے اور وہ کامیاب ہو گیا۔ انہیں دنوں قائدِ ملّت لیاقت علی خان کے قتل کی خبر آئی۔ بڑے بوڑھوں کے چہروں کو میں نے سوگوار سا دیکھا۔ یہ حادثہ بھی گزر گیا' ہوا کے ایک جھونکے کی طرح جس نے جوہڑ کی ٹھہری ٹھہری سطح پر ایک دو لہریں پیدا کیں اور بس۔ میں حیران ہوں کہ ہم بڑے بڑے حادثوں کو کس آسانی سے بھول جاتے ہیں۔ شاید اسی کا نام زندگی ہے۔ ممکن ہے شہروں میں یہ کیفیت نہ ہو۔ گاؤں والے تو چھن بھر کو چونک کر جاگتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔ انہیں جگانے والا بھی تو کوئی نہیں ہوتا۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں' اس زمانے میں ہمارے گاؤں میں ریڈیو نہیں تھا حتیٰ کہ سفید پوش کے پاس بھی نہیں تھا۔

میں نے بھا اسلم کے کہنے پر دو درخواستیں لکھیں۔ ایک میں مَیں نے کسی پرائمری سکول میں استاد مقرر ہونے کے لئے لکھا تھا اور دوسری میں پٹواری کی اسامی کے لئے۔ میں نے انہیں سرکنڈے کے قلم کے ساتھ نہایت خوشخط لکھا تھا اور عبارت پر بڑی محنت کی تھی بلکہ سیدپور جا کر اپنی تحریر اپنے استاد صاحب کو دکھائی تھی۔ انہوں نے عبارت بہت پسند کی تھی لیکن کہا تھا "ماہنے! دفتروں میں عبارتیں نہیں سفارشیں چلتی ہیں۔" میں اپنے باپ کو ساتھ لے کر چوہدری کے پاس گیا۔ اُس نے درخواستیں وصول کر لیں اور نرم نرم مسکراہٹ کی آڑ میں کہا "موج دینا! ابھی سے! ابھی تو ذیلدار کو کسی جلسے ولسے میں بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔"

"چوہدری! ہمیں کیا پتہ۔ اب یہ تیرا کام ہے یا ذیلدار کا۔"

"اگر ذیلدار کا بس چلا تو وہ چک مراد والوں سے کئے گئے ایک ایک وعدے کو پورا کرے گا۔"

میرا باپ مطمئن ہو گیا مگر مجھے چوہدری کی باتوں سے ریاکاری کی بُو آئی۔

تب اس نے اچانک میرے باپ سے پوچھا "موج دینا! مہاجر لڑکے کی ہٹی پر' چوہدری رحمت خاں اور اس کی پارٹی کی بیٹھک کچھ زیادہ ہی نہیں ہو گئی؟"

"مجھے تو اپنے کام کاج سے کبھی فرصت نہیں ملی چوہدری! یوں برج لال کھتری کی

دکان پر بھی لوگ آ بیٹھتے تھے۔"

"وہاں گاؤں کی لڑکیاں بھی تو آتی ہیں۔"

"اُن کی طرف کسی کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرات نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔

"تم چُپ رہو ماہنے!" میرے باپ نے کہا۔

"اس کی ضلع لائل پور میں زمین بھی تو ہے نا؟" چوہدری نے پوچھا۔

"ہے تو سہی۔"

"جاٹ کے بیٹے کو ہٹی سے کیا سروکار؟ اسے تو پنجابی سے ناطہ جوڑنا چاہیے؟"

"چوہدری کسی نے اس کی شکایت کی؟"

"نہیں تو۔" چوہدری نے کہا "ریشم بی بی کو شہر میں مستری کے ہاں کون لے گیا تھا؟"

"مجھے تو کچھ پتہ نہیں۔" میرے باپ نے حیران ہو کر کہا۔

"موج دینا! اجنبی لوگوں پر اتنا اعتبار اچھا نہیں ہوتا۔"

"نہیں!" میرا باپ چونک کر بولا "اسلم اب گاؤں کے لئے اجنبی نہیں چوہدری! وہ ہمارے دکھ سکھ' عزت بے عزتی کا ساجھی ہے۔"

"اس کی کیا ضمانت ہے؟" چوہدری نے پوچھا۔

اس وقت میرا جی چاہا کہ میں کہہ دوں۔ "چوہدری اس کی شرافت کی ضمانت حمیداں دے گی۔" پر خاموش رہا اور میں نے اچھا کیا۔ میرے باپ نے نرم آواز میں کہا "اس کی شرافت اس کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔" ہم چوہدری کی حویلی سے نکلے تو میرے باپ نے پوچھا "چوہدری نے ایسی باتیں کیوں کیں ماہنے؟ ماسی ریشم والی بات کیا ہے؟"

میں نے کہا "وہ بھا اسلم کے ساتھ شہر میں مستری کے ہاں گئی تھی۔"

"کیوں گئی تھی؟"

"گاؤں کی ایک بیٹی کا جُنا لے کر۔"

میرا باپ مسکرانے لگا۔ "پگلی عورت۔"

دکان پر حسب معمول کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ میرا باپ چوہدری رحمت خاں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے رحمت خاں کے کان میں سرگوشی کی تو اُس نے کہا "نہیں! نہیں' موج دینا!

فکر مند ہونے کی بات نہیں۔ چوہدری کچھ نہیں بگاڑ سکتا مہاجر لڑکے کا۔" سردیوں کی دھوپ شام کے سایوں میں ٹھٹھر کر ٹمٹما رہی تھی کہ ہم باپ بیٹا کنویں پر چلے گئے۔

اور یوں ہی گاؤں اور کنویں کے درمیان کبھی دھوپ حائل رہی اور کبھی رات کا سایہ۔ دھوپ اور سایوں کی اس دُنیا میں کھیتوں میں کل چلے۔ سیاڑوں میں دانہ پڑا۔ اکھوے نکلے شگوفے پھوٹے۔ کھیت لہلہائے۔ پوہ ماگھ کے مہاوٹ لگے۔ چیت کے بھاگتے دوڑتے بادل آئے۔ کسی کھیت کو سیراب کر گئے، کسی پر اولوں کی باڑ مار گئے۔ تب بیساکھ نے کھیتوں پر سنہری پانی پھیرا تاہم پودوں میں ابھی نمی موجود تھی کہ لُو چلنے لگی اور پودے کڑکتی دھوپ میں سُوکھ کر درانتی کا انتظار کرنے لگے۔

انہیں دنوں سلیمان گاؤں آیا۔ وہ اب دسویں جماعت میں ہو چکا تھا۔ وہ مجھے ملنے کے لئے کنویں پر آیا۔ اس ملاقات میں دوستی یاری کا پیار شامل نہیں تھا۔ وہ بوسکی کی قمیص اور لٹھے کی شلوار میں مجھے محرومی کا احساس دلانے آیا تھا۔ وہ بھا کی ہتک پر بھی جاتا رہا۔ اس نے گاؤں کی نیاروں سے آنکھ مٹکا بھی کیا۔ بھا کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی پر وہ خاموش رہا۔

ایک دن سلیمان نے مجھ سے کہا "جس دن ماسی کو لے کر تیرا بھا اسلم مستری کے ہاں گیا تھا، میں بھی گلی میں موجود تھا۔ لیکن میں چھپ گیا۔"

"چھپ کیوں گئے؟" میں نے پوچھا۔

"یونہی۔" وہ کھی کھی ہنسا۔

"چوہدری جی کو تمہیں نے بھا کے متعلق بتایا تھا۔"

"جی ہاں!"

میں خاموش رہا تو اُس نے کہا "ماہنے! میں نے مستری سے دوستی کر لی ہے۔ اگر اب تم شیماں کو دیکھو تو پہچان نہ سکو۔ گاؤں کی لڑکی شہر میں جا کر اتنا کیوں نکھر گئی؟"

"مجھے نہیں پتا! پر جن کے گھر میں اپنی بہنیں جوان ہوں وہ گاؤں کی دوسری بیٹیوں کو ان نگاہوں سے نہیں دیکھتے جن سے تم دیکھ رہے ہو۔"

سلیمان نے مجھے غصے کی نگاہوں سے دیکھا اور چلا گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۱۳

○

گندم کی کٹائی سے پہلے اور گاہی کے بعد کسان کا جی چاہتا ہے کہ وہ ذرا بھر کو موج میلہ کرے۔ بیساکھی کا میلہ اُس کی اسی خواہش کی بنا پر لگتا ہے۔ میں یہاں بیساکھی کے میلے کا نقشہ نہیں کھینچوں گا۔ موج میلے کی دوسری صورت بیاہ شادی کا ہنگامہ ہے۔ ہر سال اس بیساکھ کے مہینے میں گاؤں میں کوئی نہ کوئی شادی ہوتی ہے۔ لڑکے کی شادی ہوتی تو برات بجتی اور کسی دوسرے گاؤں میں جا کر ایک رات ہنسی خوشی میں بسر ہو جاتی۔ اگلی شام کو تھکی ماندی برات لڑکی کی ڈولی لے کر گاؤں آتی تو بڑی بوڑھیاں، نیاریں اور بچے بچیاں اس کا استقبال کرتیں۔ ایک دو روز کے بعد منڈی کو ڈنڈا لگ جاتا اور مہمان ہنسی خوشی رخصت ہو جاتے پَر جب گاؤں کی کسی بیٹی کی برات آتی تو خوشی کے ساتھ غم کی لہر بھی آتی۔ گاؤں کی بیٹی سہیلیوں سے، بچھڑتی ماں باپ، بہن بھائیوں سے جدا ہوتی تو گاؤں کے دَر و دیوار روتے۔ ڈولی کو کندھا دینے والے پگڑی کے پلّو سے آنسو پُونچھ کر گاؤں کی امانت دوسروں کے سپرد کر کے ایک عجیب سے غم میں کھو جاتے۔ گاؤں میں پلنے بڑھنے والی ہر لڑکی کا گاؤں کے ہر فرد کے ساتھ کوئی نہ کوئی رشتہ ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے بھائی، ممیر، چچیر نہ بھی ہوں، پھر بھی دل کا رشتہ تو ضرور قائم ہو جاتا ہے اور رشتہ ٹُوٹے تو اس کا چھناکا بھی ہوتا ہے۔

ہم اُس سال گاؤں میں ہونے والی ایک نہایت اہم شادی کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ شادی حمیداں کی تھی۔ ہم جانتے تھے، یہ شادی بڑی دُھوم دھام سے ہو گی اور لوگ اس کے بعد کئی سالوں تک اُس کا حوالہ دیا کریں گے۔

"یہ اُس سال کی بات ہے جب سفید پوش کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہوئی تھی۔"

"سید پور کا ذیلدار لڑکے کو بیاہنے بڑی شان سے آیا تھا پَر سفید پوش کا شملہ اونچا

رہا۔ اس نے اپنا گھر لٹا کر سیدپوریوں کا گھر بھر دیا۔"

بیساکھ کے مہینے کی کوئی تاریخ تھی کہ رات کو سیدپور سے برات آئی۔ دن بھر لو چلتی رہی تھی پر رات کے اندھیرے کے ملاپ سے لو میں ٹھنڈک بھر چکی تھی۔ چاند نکلا ہوا تھا اور سارا گاؤں چاندنی میں نہایا ہوا سا لگتا تھا۔ لوگ برات کے منتظر تھے۔ حویلی کے کھلے صحن میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ ان پر اُجلے اُجلے کھیس بچھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں دیگیں پک رہی تھیں۔ حویلی میں بڑی گہما گہمی تھی۔ ہر شخص دوڑتا بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گاؤں والوں کی ریت ہے کہ برات کسی کے گھر آئے، برادری کے لوگ گھر والوں کی مدد کے لئے خود بخود کوئی نہ کوئی کام سنبھال لیتے ہیں۔ سارے گاؤں والوں نے ایک وقت کا دودھ چوہدری کے ہاں پہنچا دیا تھا عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ برات کو دودھ میں کھانڈ ڈال کر اور تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ملا کر لسی پلائی جاتی ہے۔ سفید پوش نے دودھ میں ڈالنے کے لئے سوڈے کی گلابی رنگ کی بوتلیں منگوائی تھیں اور برف کے بڑے بڑے ڈلے بھی۔

دور سے باجوں کی آواز آئی۔ ایک گولہ چلا۔ لوگ سب کام کاج چھوڑ کر اس راستے پر جمع ہو گئے جو سیدپور سے آتا ہے۔ میں برات کی آمد کا منظر تفصیل سے بیان نہیں کروں گا۔ میں تو صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ شادی اور موت دو ہی تو ہنگامے ہیں، جسے گاؤں جانتا ہے۔ اس دن گاؤں گئی رات تک جاگتا رہا۔ برات کی آمد کا ہنگامہ، اس کی خدمت و تواضع، آتش بازی، گیسوں کی روشنی، پٹنے اور ڈھولے کے ساتھ گانے کی محفل۔ جب نیند سے آنکھیں مُندنے لگیں تو میں گھر آ کر سو گیا۔ صبح صبح میں کنوئیں پر جانے کے لئے آنکھیں ملتا ہوا بھا اسلم کی دکان کے پاس سے گزرا تو تھڑے پر لیٹے ہوئے بھانے پوچھا "تم ہو ماہنے؟"

"ہاں بھا۔"

اس وقت مجھے اچانک محسوس ہوا کہ رات کو جاگتے جاگتے گاؤں کی محفل میں بھا شریک نہیں تھا اور میں بھی چہل پہل میں کھو کر بھا کو بھول گیا تھا۔

میں نے پوچھا "بھا! چوہدری کی حویلی میں بڑی رونق تھی لیکن تم رات بھر دکان پر رہے۔"

"میں تو ہٹی والا ہوں ماہنے! ہٹی کو چھوڑ کر کیسے وہاں جاتا؟"

"نہیں تو۔" میں نے احتجاج کیا۔

"کون جانے ہٹی پر کوئی گاہک کب آ جائے۔ ہٹی کو سونا نہیں چھوڑنا چاہئے۔"

"رات کو کون گاہک آیا ہو گا بھلا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ایک گاہک آیا تھا ماہنے!" اس کے چہرے پر بڑی پُراسرار مسکراہٹ تھی۔

"وہ کون گاہک تھا؟" میں نے پوچھا۔

بھا کچھ دیر اپنے آپ میں کھویا رہا۔ تب مجھے اس نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جن میں رات کی اَدھوری کہانی اور صبح کے نکلتے اندھیرے کا ملاپ تھا۔ میں ان نگاہوں کا مطلب نہ پا سکا تو وہ مسکرانے لگا۔ اس مسکراہٹ میں چھپے ہوئے کچھ آنسو بھی تھے۔ پھر جلد ہی اس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے چاندنی رات کے اسرار سے پردہ اٹھایا۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں حیداں کی تصویر ابھری اور وہ مجھے بڑی خوبصورت نظر آئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ان آنسوؤں میں کئی چاند چمک رہے تھے۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ بس اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکتے رہے اور چاند ٹوٹتے رہے۔ مجھے حیداں پر بڑا ترس آیا۔ میں اس لمحے بھول گیا کہ بھا کا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ مجھے صرف اتنا یاد رہا کہ ہم دونوں جوان ہیں اور جوانی سے بڑا رشتہ اور کوئی نہیں ہوتا۔

میں نے پوچھا "تو تُو نے حیداں کو خالی ہاتھ لوٹا دیا؟"

وہ میرے لہجے کی بے تکلفی پر چونک گیا۔

"ہاں" اس نے جواب دیا۔ "میں اُسے کیا دے سکتا تھا ماہنے؟"

"وہ پیار جو ابھی ابھی تیری مسکراہٹ سے چھلکا تھا۔" میں نے کہا۔

"ماہنے! وہ پیار تو اب بھی میرے دل میں موجود ہے۔ تم یہ چاہتے تھے کہ میرا پیار اس کے جسم کو چھو کر جوانی کا منہ چھو لیتا۔ نہیں ماہنے! کسی رانجھے اور مہینوال نے ایسا نہیں کیا۔"

رانجھے اور مہینوال کے نام سن کر جانے مجھے آگ کیوں لگ گئی۔ مجھے ان کے قصے یاد تھے۔ مجھے رہس دھاریوں کے کھیل یاد آ گئے جو میں نے بچپن میں دیکھے تھے۔ مجھے یہ کھیل بہت پسند تھے۔ مجھے رانجھے اور مہینوال کبھی اچھے نہ لگے کیونکہ یہ میرے اندر بھی موجود تھے اور بھانے بھی اپنے آپ کو انہیں کے روپ میں دیکھنا پسند کیا تھا۔ مجھے ہیر اور

سوہنی کے کرداروں نے اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کیا تھا اور مجھے اپنے آپ سے شرم آئی تھی۔ رانجھے اور مینوال چناب کے دوسرے کنارے پر بیلے میں کتنے سکھ کی زندگی بسر کرتے تھے اور ہیر اپنی ایک ہتھیلی پر اپنی عزت کو اور دوسری پر چُوری کا چھنّا رکھ کر رانجھے کے پاس پہنچتی اور سوہنی مینوال سے ملنے کے لئے کچّے گھڑے پر چناب کی بپھری ہوئی موجوں کا مقابلہ کرتی۔

"بھا! رانجھے اور مینوال تو زنخے تھے۔" میں نے کہا۔

بھا دو چار لمحے سُن سا ہو کر کھڑا رہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اُس نے کہا "ماہنے! تم چاہتے تھے، میں مرزا جٹ بنتا اور صاحباں کو بکّی پر بٹھا کر اُڑا لے جاتا۔ بچپن میں ایسا کر سکتا تھا۔ ایسا ہوتا بھی رہتا ہے۔ میں اُسے لے کر لائل پور کے کسی گاؤں میں چھپ جاتا پر وہ رشتہ ٹوٹ جاتا جو میرے اور تیرے درمیان قائم ہے۔ تُو نے میرا دامن پکڑ کر مجھے روک لیا تھا اور چک مراد کی مٹی میں میری جڑ لگ گئی۔ میں اس رشتے پر سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہوں۔ سب کچھ۔"

بھا کی اِس بات پر بھی میرا غصّہ نہ بجھا تو میں نے کنویں کا رُخ کیا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور ہوا کے جھونکوں میں رات کی ٹھنڈک بھی باقی تھی۔ سنہری کھیتوں میں کہیں کہیں سبزہ تھا۔ کنویں کی روں روں کی آواز بھی آ رہی تھی جو سبز کھیتوں کی پیاس بجھانے کے لئے آدھی رات سے چل رہے تھے۔ گاؤں کی گلیوں سے نکل کر جب میں بل کھاتی پگڈنڈی پر قدم رکھتا تھا تو میرا دل پھول کی طرح کھل اُٹھتا تھا پر آج ایسا نہ ہوا۔ مجھے اپنے آپ پر جھنجلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ اُس وقت گاؤں کی طرف سے باجوں کی آواز آئی۔ دُور کی یہ آواز نہایت سہاونی تھی پر میرا مَن بجھا بجھا سا رہا۔ پگڈنڈی کے ایک موڑ پر پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے میں ہرے بھرے کھیتوں میں گھر گیا ہوں اور دو کھیتوں کے درمیان سبز گھاس کے ایک قطعے پر گوری چَر رہی ہے اور اس کی رسّی شیماں کے ہاتھ میں ہے۔ تب مشرق میں سورج کی پہلی جھلکار سے ایک تیز نوکیلی کرن پھوٹی تو میں چلتے پھرتے خواب سے چونک کر جاگا اور میرا مَن بھی جاگ اٹھا۔ تب نجانے کیوں میں نے بھا کو معاف کر دیا۔

ڈھور ڈنگروں کو چارا ڈال کر جب میں اور میرا باپ گاؤں کو لوٹے تو گاؤں بیساکھ کی دھوپ میں نہا رہا تھا۔ ہم سیدھے چوہدری کی حویلی میں گئے۔ برات کو دوپہر کا کھانا کھلانے کی

تیاریاں ہو رہی تھی۔ دیگیں کھڑک رہی تھیں اور دیسی گھی میں پکتے ہوئے مصالحوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کھیل تماشے جاری تھے۔ ڈوم ڈھاری، بھانڈ اور بازی گر اپنے اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ مولوی صاحب کے آنے پر نکاح کی رسم ادا ہوئی۔ مبارک سلامت کا شور مچا اور باجے والوں نے کچھ دھنیں بجائیں۔ برات کو کھانا کھلایا گیا۔ ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ دوپہر گزر گئی۔ چوہدری کے آنگن میں جہیز کا دکھلاوا ہوا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے جہیز سمیٹا گیا اور پیٹیوں اور صندوقوں میں بند کر دیا گیا۔ تب کہاروں نے رنگین پردوں والی ڈولی حویلی اور آنگن کے مشترکہ دروازے کے ساتھ لگا دی اور آنگن میں کھڑی عورتیں رونے لگیں۔ روتی ہوئی دلہن کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو باجے والوں نے جو دُھن بجائی وہ بڑی درد ناک تھی۔ میری آنکھ میں ایک آنسو مچلا تو میں نے غصے میں آ کر اُسے یوں پونچھ ڈالا جیسے اِس میں میرا بچپن چھلک جائے گا اور میں اپنے بچپن کو ڈولی میں بٹھا کر سیدپور کی گود میں ڈال دوں گا۔ مجھے یہ منظور نہیں تھا۔ لوگ کندھا دے کر ڈولی کو وہاں تک لے گئے جہاں سے سیدپور کو جانے والا رستہ ہمارے گاؤں سے جدا ہوتا تھا۔ یہاں ڈولی کے پاس کہاروں کے کندھوں پر آ گئے۔ ہم وہاں اتنا عرصہ کھڑے رہے کہ برات ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اچانک اس لمحے ایک تماشا ختم ہو گیا۔ زندگی ہے بھی ایک تماشا۔ یوں میں سوچتا ہوں کہ زندگی میں یہ تماشے نہ ہوتے تو وہ کتنی کٹھن اور بدمزہ ہوتی، اس بانجھ مٹی کی طرح جو جیٹھ ہاڑ کے سوکھے دنوں میں اُڑتی پھرتی ہے اور آسمان اور زمین کے درمیان لٹک سی جاتی ہے۔

اُس دن دکان پر محفل نہ لگی۔ سُونے اور سنسان تھڑے پر شام کا سایہ پھیل رہا تھا اور سائے کی کوکھ سے اُداسی جنم لے رہی تھی کہ میں وہاں آیا۔

میں نے بھا سے کہا "ہم حیداں کو رخصت کر آئے ہیں۔"

"ہم کون؟"

"سارے لوگ۔۔۔ میں بھی۔۔۔ تم بھی۔۔۔"

"میں تو وہاں موجود نہیں تھا ماہنے!"

"ہم نے خود حیداں کو ڈولی میں اپنے ہاتھوں سوار کیا۔"

"ماہنے! میرا اور تیرا کیا قصور۔ اُس کے ماں باپ، بہن بھائی بھی تو اِس دیس نکالے میں شریک تھے۔ یہ دُنیا کا دستور ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔"

بھا کی اس بات پر عائشہ اور زینت کا خیال نجانے کیوں میرے دل میں اُتر آیا۔ وہ دونوں بھی تو جوان ہو چکی تھیں اور میں جانتا تھا کہ حمیداں کی شادی کے سارے ہنگامے کے دوران میرے باپ کی آنکھوں کے سامنے ان کی جوانی ہاتھ باندھ کر کھڑی رہی ہو گی اور کہہ رہی ہو گی بابا! کچھ ہماری بھی فکر ہے۔ میں نے اس خیال کو بڑی مشکل سے ذہن سے نکالا اور کنوئیں کی طرف قدم بڑھا لئے۔

بیساکھ گزرا۔ گندم کی کٹائی اور گہائی ختم ہوئی۔ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی دو تین کھیتوں سے ہمیں اتنی گندم حاصل نہ ہوئی کہ سال کا خرچ چل جاتا۔ تب اساڑھ کے لمبے لمبے دن دھوپ میں جلتے رہے۔ کنوئیں رواں رواں چلتے رہے اور پانی کی چمکتی ہوئی لکیر تیز دھوپ میں راستہ بنا کر جلے سوکھے کھیتوں کے پیاسے ہونٹوں کو تر کرتی رہی اور آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا نظر نہ آیا اور ہم کسانوں کے دلوں پر مایوسی کی گرم راکھ برسنے لگی۔ جب اساڑھ کے آخری دنوں میں پہلی بارش ہوئی تو ہم نے مکّی اور جوار کی کاشت کی اور بارش کا انتظار کرنے لگے پر ساون کھُل کر نہ لگا۔ دھوپ، حبس اور ہواس سے اکثر کھیتوں کے بیج مٹّی کی کوکھ میں ہی جل کر رہ گئے۔ جس کھیت کو کنوئیں کا تازہ اور ٹھنڈا پانی لگ سکا تھا، وہاں انکوے پھوٹے۔ تب بے وقت کی ایک دو بارشیں ہوئیں لیکن ساونی کی فصل پر جوبن نہ آیا۔ خالی کھیتوں میں گھاس بھی اتنی نہ اُگی کہ مویشیوں کو چراگاہ میسر آ سکتی۔ چنانچہ مکّی اور جوار کی فصل کا زیادہ حصہ ان کے پیٹوں کا ایندھن بن گیا۔ کسان خود بھوکا رہ لیتا ہے پر اپنے ڈھور ڈنگروں کو بھوکوں نہیں مار سکتا۔

مثل مشہور ہے کہ ساونی سے کال پڑتا ہے اور ساونی سے سکال ہوتا ہے۔ اُس سال مجھے یاد ہے کہ سفید پوش نے لوگوں کو اُدھار غلّہ دیا اور اس شرط پر کہ ہاڑی کی فصل پر ڈیڑھ گنا غلّہ اسے ادا کیا جائے گا۔ بھا کی ہٹّی میں بہت کم غلّہ جمع ہوا تھا لیکن جن لوگوں کو اس نے غلّہ اُدھار دیا تھا، اُس نے اُن سے کوئی ایسی شرط نہ کی۔ سفید پوش کو غصہ آیا۔ اس نے ایک دن ہٹّی پر آ کر سب لوگوں کی موجودگی میں کہا "مہاجر لڑکے! کیا نام ہے تیرا؟ تو ہٹّی چلانے سے رہا۔"

"کیوں چوہدری جی؟"

"تم نے تو یوں سدا برت لگا رکھی ہے جیسے تیری کوٹھڑیاں غلّے سے بھری ہوں۔"

"چوہدری!" ایک جاٹ بولا "دل بھرا ہوا ہونا چاہئے۔ کچھ لوگوں کی کوٹھیاں غلّے سے بھری ہوتی ہیں اور ان کا دل خالی ہوتا ہے۔"

"تیرے جیسے لوگ ہی تو اچھے بھلے آدمیوں کا دیوالہ نکال دیتے ہیں۔" چوہدری نے طنز کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"نہیں چوہدری جی! میرے پاس ہے کیا جو میرا دیوالہ نکلے گا۔" بھا نے کہا۔

چوہدری نے دکان پر بیٹھے لوگوں پر ایک پھنکارتی ہوئی نظر ڈالی اور گھر کی راہ لی۔

بھا اسلم کا دیوالہ تو نہ نکلا البتہ گاؤں کے لوگ اِسے اب بہت پسند کرنے لگے۔

ایک دن بابا حیات اور چوہدری رحمت خان میرے باپ کے پاس کنوئیں پر آئے۔ ہم دونوں باپ بیٹا ٹوکے پر چارا کُتر رہے تھے۔ میں نے کام چھوڑ کر درختوں کی چھاؤں میں اُن کے لئے کھاٹ بچھائی اور حقّہ تازہ کیا۔ ہم چارا کُتر کر فارغ ہوئے تو میرا باپ اُن کے پاس جا بیٹھا۔ میں ناند میں چارا ڈالنے میں مصروف ہو گیا پر میرے کان اُن کی طرف لگے رہے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد چوہدری رحمت خان نے کہا "اب مہاجر لڑکے کی جڑ اِس گاؤں میں لگ چکی ہے۔"

"ہاں چوہدری!"

"شروع شروع میں کچھ اجنبی سا لگا پر اب تو یوں لگتا ہے جیسے اس کا جنم اِس گاؤں کی مٹّی سے ہوا ہو۔ اب تو اِسے اپنی برادری میں شریک کر لینا چاہئے۔" بابا حیات بولا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"شریک تو وہ پہلے ہی سے ہے۔ وہ ہمارے دُکھ سُکھ میں شامل ہوتا ہے۔ شادی بیاہ، جنم موت، ہر موسم میں وہ ہمارا ساتھ دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سفید پوش نے اُسے حمیداں کی شادی میں شرکت کی دعوت نہ دی۔" میرے باپ نے کہا۔

"میرا مطلب ہے اب اُسے پورا پورا شریک بنا لینا چاہئے۔" بابا حیات نے کہا۔

"بابا میں تیری بات سمجھ نہیں سکا۔"

"صوبے دے! اپنی بیٹی عائشہ جوان ہو چکی ہے۔" چوہدری رحمت خان نے کہا۔

"ناند میں چارا ڈالتے ڈالتے میرے ہاتھ رُک گئے۔ میں نے مُڑ کر انکھیوں سے دیکھا، میرا باپ حیران پریشان نظر آتا تھا۔ وہ گُم صُم ہو گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا

"چوہدری! لوگ کیا کہیں گے؟"

"کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ میری اپنی کوئی بیٹی ہوتی تو میں بڑی خوشی سے اس کا ہاتھ مہاجر لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتا۔" چوہدری رحمت خان نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو رحمت خان! تمہاری بات اور ہے۔ لوگ کہیں گے کہ میں نے اپنی غرض سے اسلم کو گاؤں میں رکھا۔ نہیں چوہدری! میں جاٹ ہوں مجھے اپنی بیٹی سے اپنی آنکھ زیادہ پیاری ہے۔"

"سوچ دینا!" بابا حیات نے میرے باپ کو ایسی آواز میں پکارا جیسے وہ اُسے جھنجوڑ کر بیدار کرنا چاہتا ہو۔ "تیری آن پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اسلم بھی جاٹ کا بیٹا ہے۔ لوگ اس رشتے سے خوش ہوں گے پر ہم تمہیں مجبور نہیں کر سکتے۔ سوچ سمجھ لو۔"

اس کے بعد جو باتیں ہوتی رہیں، مجھے ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔

میں بھا اسلم کے متعلق سوچنے لگا۔ سوچ کا یہ سلسلہ شروع ہوا تو گزشتہ پانچ چھ سال آنکھ کی ایک جھپک میں گزر گئے۔ زندگی کے اس چوکھٹے میں مجھے بھا کے ساتھ اپنے اس نئے رشتے کا تصور فٹ ہوتا ہوا نظر نہ آیا جیسے یہ تصویر سب سے الگ تھلگ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو میرے اور بھا کے راستے الگ تھلگ ہو جائیں گے۔ مجھے چوہدری رحمت خان اور بابا حیات کی اس تجویز پر غصہ آیا۔ میں نے اپنے آپ سے الگ ہو کر سوچنے کی کوشش کی تو میں نے عائشہ کو بھا کے پہلو میں لا کھڑا کیا۔ یوں لگا جیسے عائشہ بہت چھوٹی ہو اور بھا کا قد آسمان سے بھی اونچا نکل رہا ہو۔ تب میں نے حمیداں کو بھا اسلم کے دوش بدوش کھڑا کیا اور میں نے دیکھا کہ اُن کے قد برابر ہیں۔

چک مراد میں حمیداں ہی ایسی لڑکی تھی جو بھا کی برابری کر سکتی تھی۔ مجھے اس پر غصہ آیا۔ اس نے جھوٹی آن پر اپنی کتنی بڑی خوشی قربان کر دی تھی۔ بھا نے میرے گاؤں کے لئے اپنی مرزے جٹ والی جوانی کی بھینٹ دے دی تھی۔ نہیں—— نہیں—— عائشہ اور بھا کا کوئی جوڑ نہیں۔ میری آنکھوں میں جلتے چھلکتے آنسو اُبلے—— "کچھ لوگ دنیا میں رانجھے مینوال اور پنوں کے روپ ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ اب جو بھا گاؤں سے نکل کر کسی بالناتھ کا چیلا بن جائے تو مجھے کوئی افسوس نہ ہو گا۔ وہ کان پھڑوا، مُندرے ڈال سیدپور کی گلیوں میں کشکول ہاتھ میں لے کر دربدر کی بھیک مانگتا پھرے تو مجھے خوشی ہو گی۔"

کئی دنوں تک یہ تصور میرا پیچھا کرتا رہا۔ میں بھا سے ملتا تو مجھے اُس کا سراپا بدلا بدلا نظر آتا۔ میں اُس سے آنکھیں نہ ملا سکتا۔ نجانے کیوں اُس سے مجھے شرم آتی۔ کنویں پر ہونے والی بات نجانے گاؤں میں کیسے پہنچ گئی۔ میں نے گاؤں کے ہر فرد کی آنکھ میں بھا کے ساتھ اپنے نئے رشتے کی جھلک دیکھی تو میں شرم سے زمین میں گڑ جاتا رہا۔ ماسی ریشم نے مجھ سے یہ بات کرنی چاہی تو میں نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں ماسی۔" وہ اتنی حیران ہوئی کہ جیسے ابھی حیرت کے مارے اُس کا دم گھٹ جائے گا۔ تب یہ رشتہ خود بخود طے ہو گیا اور اس کے لئے کوئی رسم بھی ادا نہ ہوئی اور میں نے نہیں عبدالرحمٰن نے اسے قبول کر لیا۔ عبدالرحمٰن جو اس چھوٹے سے گاؤں کا ایک فرد تھا، اُس نے ایک اجنبی شخص کو جس کا نام محمد اسلم تھا، اپنے بہنوئی کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ آج بھی جب میری جوانی گزر چکی ہے اور اس کی آنکھ پر لگا ہوا رنگین شیشہ اتر چکا ہے، میں بھا کو اس رشتے کے چوکھٹے میں قبول نہیں کر پاتا اور انہیں دنوں جب مجھے پتہ لگا کہ ایک شخص مسمّی عبدالرحمٰن کا نکاح ایک لڑکی "زینت" سے ہو گا اور اُس نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، تو میں قہقہے لگا کر ہنسا۔ "یہ زندگی تو کسی بھانڈ کا بھونڈا سا مذاق ہے۔" میں نے سوچا۔

رشتے طے ہو گئے۔ ایک عرصے تک بھا مجھ سے اور میں اُس سے آنکھیں نہ ملا سکا۔ آہستہ آہستہ احساس کی تیز دھار کُند ہو گئی۔ لمحے گزرتے رہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وقت تو گزر جاتا ہے لیکن چند لمحے نہیں گزر پاتے تاہم میں نے اُن لمحوں کو زنگ لگتے دیکھا تو خوش ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ لمحے میرے اور بھا کے درمیان پھر معصوم دوستی کے بے تکلف ننھے ننھے پھندے بن جائیں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ہمارا نیا رشتہ لمحوں کے ان پرندوں کو قیدی نہ بنا سکا۔

اُنہیں دنوں حمیداں کئی بار گاؤں میں آئی۔ میں اُس سے ملنا چاہتا تھا لیکن میں نے ملنے کی کوشش نہ کی۔ یہ ملاقات خود بخود ہو گئی۔ گاؤں کی جس گلی میں یہ ملاقات ہوئی اس کی کوئی اہمیت نہیں تاہم اس رنجیدہ مسکراہٹ کو ضرور اہمیت حاصل ہے، جس نے میرا راستہ روک لیا تھا۔ دُکھ بھری مسکراہٹ جس میں کوئی شکایت نہ تھی جیسے اُس مسکراہٹ نے سمجھوتا کر لیا ہو۔ حمیداں سے جو باتیں ہوئیں اُن کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ اس جذبے کی اہمیت ضرور ہے جس نے سراپا دعا بن کر کہا تھا "تم خوش رہو حمیداں! تم نے میرے بھا سے

محبت کی اور تم خوش قسمت بھی ہو کہ اس کی محبت کی نرم نرم کرنوں نے تمہیں چُھوا۔ یہی میرا تیرا رشتہ ہے اور یہ ٹوٹ نہیں سکتا۔"

رشتے طے ہو گئے پُر میرا باپ بہت پریشان تھا۔ وہ کھیتوں کو دیکھتا تو مایوس ہو جاتا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں دو بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کیسے کروں گا۔ زمین اور آسمان دونوں نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ اُس وقت میں نے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر سوچا کہ میں باپ کی ہر مشکل میں اُس کا ہاتھ بٹاؤں گا۔ ہم نے تین چار کھیتوں میں گندم کی بوائی کی۔ پھر جاڑا آیا' دُھند چھائی' شمال کی طرف پہاڑوں پر برف جمی۔ صبح شام برف میں آگ لگی۔ کچھ بارشیں بھی ہوئیں۔ کُہرا بھی پڑا۔ موسم اس طرح بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک دو بارشوں کی کمی بیشی یا بے وقت کی بارشوں سے کسان کی محنت پر پانی پھر جاتا ہے۔ اُس سال ایسا ہی ہوا۔ کُہرے اور پالے نے نازک پودوں کو پیلا کر دیا۔ پھر ایک بارش ہوئی اور کچھ پودوں پر ہریالی لوٹ آئی۔ پودے بڑے ہوئے اور اُن میں بالیاں لگیں تو "کنگی" نے حملہ کیا۔ بہت سے خوشے جل کر سیاہ راکھ ہو گئے۔ میں نے سوچا "زندگی انسان کی ہو یا پودے کی' کتنی کٹھنائیوں میں سے گزر کر پروان چڑھتی ہے اور اس میں پھل لگتا ہے۔"

تب گندم کے کھیتوں پر سنہری رنگ آنے لگا۔ مجھے یاد ہے اُنہیں دنوں سلیمان گاؤں آیا۔ وہ اب دسویں کا امتحان دے چکا تھا۔ اُس کا رنگ نکھر آیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے کنویں پر آیا۔ اُس سے مل کر مجھے خوشی ہوئی۔ نجانے کیوں؟ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے مستری کا ذکر چھیڑ دیا۔ اُس نے کہا "ماہنے! مستری عجیب آدمی ہے۔ وہ پہلے پہل تو مجھ سے بچتا رہا۔ پھر ایک دن اچانک وہ بازار میں مجھے ملا تو گلہ کرنے لگا کہ میں اب بڑا آدمی ہو گیا ہوں کہ اُس جیسے غریب سے ملنا تک گوارا نہیں کرتا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر چلتا رہا' چلتا رہا حتیٰ کہ ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔" سلیمان نے رُک کر میری طرف دیکھا۔ میں اپنی ہی سوچ میں گم ہو گیا تھا کہ وہ مسکرا کر کہنے لگا "ماہنے! اُس دن شیماں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اُس نے مجھ سے گاؤں کا حال پوچھا۔ اُس نے کہا' میرا جی چاہتا ہے میں ایک بار گاؤں کو قریب سے نہیں تو دُور سے دیکھ لوں۔"

"تم نے کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو کچھ نہ کہا لیکن مستری بولا' شیماں! اب سفیدپوش صاحب اپنی زمین پر

ٹیوب ویل لگائیں گے تو ہم گاؤں چلیں گے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے ٹیوب ویل پر مستری لگا لیں گے۔ لیکن شیماں خاموش رہی' وہ کسی سوچ میں کھو گئی۔ ماہنے! اُس وقت شیماں مجھے بہت دکھی لگی۔"

"سُلّی! تم اُس کے گھر کیوں گئے؟ وہ اپنے حالات سے خوش تھی۔ تم نے اُسے دُکھ کیوں دیا؟"

"نہیں ماہنے۔ میں نے اُسے کوئی دُکھ نہیں دیا۔"

"تم نے اُسے گاؤں کی یاد دلائی؟"

"ماہنے! مستری مجھے خود کھینچ کر لے گیا تھا۔ میں اپنے آپ تو نہیں گیا تھا۔ اب میں اکثر اس کے ہاں جاتا ہوں۔ وہ دونوں خوش ہوتے ہیں۔ مستری مجھ سے کبھی کبھار روپیہ دو روپیہ قرض مانگ لیتا ہے پر واپس نہیں کرتا۔"

"کیوں نہیں کرتا؟" میں نے پوچھا۔

"ماہنے! جہاں تک میرا خیال ہے وہ نشہ کرتا ہے۔"

"نشہ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مجھے اُس کے سگریٹ سے عجیب سی بُو آتی ہے۔"

"سُلّی تم اُن کے ہاں نہ جایا کرو۔"

"کیوں نہ جایا کروں ماہنے؟" سُلّی نے ذرا غصے میں آ کر کہا۔

"مجھے تمہاری نیّت خراب لگتی ہے سُلّی!"

"کیا مطلب؟" اُس نے پوچھا۔

"اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔"

"مجھے تو گریبان میں کچھ نظر نہیں آتا۔" اُس نے آنکھ میچ کر کہا۔ "ایک بات پوچھوں ماہنے! شیماں میرے وہاں جانے پر مجھے کنکھیوں سے دیکھتی اور مسکراتی کیوں ہے؟"

"وہ تمہیں اپنے گاؤں کا آدمی سمجھ کر خوش ہوتی ہے۔ نجانے وہ اُس لمحے کس سوچ میں ڈوب جاتی ہو گی۔ تجھے دیکھ کر ذرا بھر کو اُس کا گاؤں سے رشتہ قائم ہو جاتا ہو گا۔ کیا پتہ اُسے گاؤں کی کون کون سی یاد مسکرانے پر مجبور کرتی ہو گی۔ بیچاری لڑکی! اُسے بنا کسی قصور کے دیس نکالا دے دیا گیا۔ سُلّی! اب وہ جس حال میں ہے اُسے جینے دو۔" میں نے جذباتی ہو

کر کہا۔

نُکّی! میری باتوں کے جواب میں کھلکھلا کر ہنسا۔

پھر اُس نے پوچھا "پتہ ہے ماہنے! مستری مجھے کیوں لے جاتا ہے اپنے گھر؟"

"میں کیا جانوں نُکّی!" مجھے اپنی چڑی ہوئی آواز پر خود غصہ آیا۔

"اور وہ مجھے کئی بار گھر میں اکیلا چھوڑ کر باہر کیوں نکل جاتا ہے؟"

"وہ تم پر اعتبار کرتا ہے۔"

"نہیں ماہنے! یہ بات نہیں۔"

"پھر اور کون سی بات ہے؟"

"خود سمجھو ماہنے---- میں صرف اتنا کہوں گا کہ اب تم شیماں کو دیکھ لو تو اُسے پہچان نہ سکو۔ بھرا بھرا جسم اور اُس پر شہرنوں کا لباس۔ اب تو اُس کے چہرے کا رنگ روپ ہی بدل گیا ہے۔ تھوڑی تھوڑی زردی اور گالوں کے گڑھے اور وہ مسکراہٹ جیسے----"

"نُکّی! جاؤ خدا کے لئے میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

"ماہنے! تم بڑے بدتمیز ہو۔ آخر پینڈو ہو نا! میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں اور تم اُسے جھٹک دیتے ہو۔" نُکّی نے کہا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔ میں نے سوچا' میں اُس کے آنے پر خوش کیوں ہوا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ مجھے شیماں کی کوئی بات سنائے گا اور شیماں کے ساتھ میرا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جڑ جائے گا اور اب میں اُداس تھا' بے انتا اُداس جیسے کسی نے میرے منہ میں مٹھی بھر راکھ ڈال دی ہے۔ نجانے! شک کا پہلا بیج میرے دل میں گرا جیسے نُکّی سچ کہہ رہا ہو اور میں اُسے جھوٹ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس دن مجھے نُکّی پر غصہ نہ آیا اور مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا' اُس ماہنے پر جو اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۱۴

○

خبر تو ہم کافی عرصے سے سن رہے تھے کہ ہمارے گاؤں میں پرائمری سکول کھل رہا ہے پر اس کی تصدیق نہ ہو سکی تھی۔ بھا اسلم شہر گیا تو اُسے پتہ لگا کہ واقعی ہمارے گاؤں کے لئے سکول کی منظوری ہو چکی ہے۔ اُس نے مجھ سے درخواست لکھوائی کہ مجھے سکول میں استاد لگا لیا جائے لیکن میری درخواست دفتر میں پہنچنے نہ پائی تھی کہ گاؤں کے تکیے میں سکول کھل گیا۔ اُس دن ذیلدار ہمارے گاؤں آیا۔ تکیے میں اکٹھ ہوا۔ سفیدپوش بڑا خوش تھا کہ اُس نے گاؤں والوں سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ میرے باپ نے میری درخواست ذیلدار کو دی تو اُس نے کہا "ایک منشی تو لگ گیا ہے۔ اگر دوسرے کی ضرورت ہوئی تو عبدالرحمٰن سے زیادہ کون مناسب رہے گا۔" پر بعدازاں جب دوسرا منشی بھی آ گیا تو میری اُمید ٹوٹ گئی۔ چوہدری رحمت خان کا خیال تھا کہ سفیدپوش نے میری درخواست دفتر میں پہنچنے ہی نہیں دی۔ سفیدپوش نے کہا "ماہنے! تیرے لئے ذیلدار سکولوں کے بڑے افسر سے ملا تھا پر اُس نے کہا کہ امیدوار جے وی پاس نہیں' لہٰذا اسے نوکری نہیں مل سکتی۔ تو ڈسکے میں جے وی میں داخلہ کیوں نہیں لے لیتا؟" چوہدری کے ہمدردانہ مشورے پر میرا باپ طنز بھرے انداز میں مسکرایا اور اُس نے کہا "ماہنے! جب بھی سفیدپوش کا بس چلا' وہ تجھے تحصیلدار لگوا دے گا۔ تو نے منشی لگ کر کیا کرنا ہے؟"

وہ سال اچھا بھی تھا اور بُرا بھی یا شاید وقت اچھا ہوتا ہے نہ بُرا۔ وہ اُس ندی کی طرح ہے جس میں کبھی طغیانی آتی ہے اور جو چیز اس کے سامنے آتی ہے تنکے کی طرح بہہ جاتی ہے اور کبھی اس کی نرم رو لہروں سے زمین سیراب ہوتی ہے تو ہر طرف پھول کھل اٹھتے ہیں۔ اس سال گندم کی فصل اُمید سے بہت کم ہوئی۔ صرف شہروں میں نہیں دیہات میں بھی کال پڑ گیا۔ شہریوں سے حکومت ڈرتی ہے' اس لئے شہروں میں امریکہ سے گندم

پہنچی اور کچھ گندم دُور دُور کے دیہات میں بھی نجانے کس طرح چلی گئی۔ بھا اسلم نمونے کے طور پر کچھ گندم شہر سے لایا تھا۔ جب یہ گندم پسوائی گئی تو سُرخ سُرخ آٹے کو دیکھ کر ہم لوگ حیران ہوئے تھے۔ اس کی روٹی سے عجیب سی بساند آتی تھی۔ اکڑی ہوئی روٹی کی شکل بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ ذائقہ بھی اچھا نہ تھا پُر یہ رزق تھا اور رزق کو رَد کرنا ناشکری ہوتی ہے۔

انہیں دنوں دیہات کی بہتری کے لئے ایک نیا محکمہ قائم ہوا۔ اس محکمے کا ورکر ہمارے گاؤں میں بھی آیا۔ وہ بڑا خوش گفتار نوجوان تھا۔ چوہدری اُسے لے کر سارے گاؤں میں پھرا۔ وہ بھا کی دکان پر بھی آئے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اُس دن چوہدری نے ورکر کے سامنے بھا کی بڑی تعریف کی اور میری طرف اشارہ کر کے کہا "یہ اپنا ملیتا ہے۔ آٹھویں جماعت پاس ہے۔" ورکر نے ہم سے ہاتھ ملایا پھر دکان کے تھڑے پر بیٹھ کر اُس نے چوہدری رحمت خان اور کئی دوسرے لوگوں کی موجودگی میں بڑی اچھی باتیں کیں۔ اُس نے دیہات سدھار کی اہمیت بیان کی۔ دیہات کی غربت اور پسماندگی کی وجوہات پر روشنی ڈالی اور اپنے پروگرام کی تفصیل بتائی۔ ہم لوگ بہت متاثر ہوئے۔ چوہدری نے اُسے شیماں کا مکان کھول کر دے دیا۔ لوگوں نے کہا چوہدری کی چالیں بہت باریک ہیں۔ اب وہ بیچارے نتھو کے مکان پر قابض ہو جائے گا۔ ورکر نے مکان کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ کچی دیواروں پر تصویریں چپکائیں' کرسیاں اور میز لگائے اور گاؤں میں دیہاتی محفل کا تیسرا اڈا کھل گیا لیکن بھا کی دکان کی رونق کم نہ ہوئی البتہ گاؤں کے کچھ جوان اب فرصت کا وقت ورکر کی بیٹھک میں گزارنے لگے۔

اس سال کا ایک اور اہم واقعہ یہ تھا کہ شہر کے ایک ٹھیکے دار نے اُس سڑک کے کنارے جو شہر سے گوندل اور مرالہ ہیڈ کو جاتی ہے' بھٹہ لگانا چاہا۔ چوہدری نے اس کی مخالفت کی۔ ہمارے دھڑے نے اُس کی حمایت کی اور اُسے کچھ زمین کرائے پر دلوا دی۔ اُس نے خوش ہو کر مجھے اپنے بھٹے کا منشی مقرر کر دیا۔ تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ میرے باپ نے خوشی خوشی اس کی اجازت دے دی کیونکہ اب مجھ سے چھوٹا میرا بھائی نو دس سال کی عمر کا ہو چکا تھا اور وہ سکول سے واپس آ کر اُس کا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ یوں میں بھی تو ہل پنجالی سے اپنا رشتہ کیسے توڑ سکتا تھا۔ میں نے سوچا "جب مجھے فرصت ملے گی' میں

کنویں پر کام کروں گا۔" بھٹہ لگا اور پتھیرے اینٹیں ڈھالنے لگے تو میں نے ٹھیکے دار سے پوچھا "شیخ جی! ہمارا گاؤں شہر سے دس بارہ میل دُور ہے۔ یہاں بھٹہ لگا کر آپ کو کیا فائدہ ہو گا؟"

"عبدالرحمن! شہر کے نزدیک بھی میرا ایک بھٹہ ہے۔ ایک بھٹہ وہاں اور بھی لگ سکتا تھا لیکن میں نے کچھ دُور کی سوچی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ڈسٹرکٹ بورڈ والے شہر سے سیدپور تک پکّی سڑک بنانے کی منظوری دے چکے ہیں۔ دیہات سُدھار کا محکمہ بھی کھل چکا ہے۔ دیہات میں گلیاں پکّی ہوں گی۔ لوگ پکّے مکان بنائیں گے۔ چند سالوں میں اس علاقے کی کایا پلٹ جائے گی۔ بھٹے پر ایک دو سال میں اینٹوں کی اتنی مانگ ہو گی کہ ہم اسے پورا نہیں کر سکیں گے۔"

اُس کی پیشگوئی بہت جلد درست ثابت ہوئی۔ شہر سے سیدپور جانے والی پکّی سڑک پر کام شروع ہو گیا اور ہم نے جو پہلی کھیپ تیار کی' وہ پوری کی پوری ڈسٹرکٹ بورڈ نے خرید لی اور ورکر نے گاؤں کی پہلی گلی کو پکّا کرنے کے لئے ہم سے اینٹیں مانگیں تو ہم نے دوسری بار کی کھیپ میں سے اینٹیں دینے کا وعدہ کیا۔

گلی کے انتخاب کے لئے چوہدری کی حویلی میں جلسہ ہوا۔ اس میں گاؤں کے اکثر لوگ شریک تھے۔ ورکر نے کوشش کی کہ اس جلسے میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہو کیونکہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کدورت نہیں ہوتا اور وہ نئے خیالات کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ ورکر نے کہا کہ میں ترقی کے کام کی ابتدا چک مرلو سے کر رہا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چک مرلو والے دوسرے گاؤں کے لئے کس قسم کی مثال قائم کرتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مثال اچھی ہو گی۔ میری کامیابی کا انحصار آپ پر ہے۔ چوہدری نے اس کی تائید کی پر بابا حیات نے پوچھا "جوان! گاؤں کی ایک گلی کے پکّا ہونے سے گاؤں والوں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

ورکر نے کہا "ایک گلی کے پکّا ہونے سے بظاہر کوئی بڑا فائدہ تو نہیں ہو گا لیکن ایک نیک کام کا آغاز تو ہو جائے گا۔"

"نیکی کا کام تو یہ ہے کہ مسجد کا فرش پکّا ہو۔ گاؤں کی عورتیں جس کنویں سے پانی بھرتی ہیں' اسے پکّا کیا جائے۔ گاؤں میں کئی بیوائیں ہیں' ان کے خرچ کی کوئی سبیل پیدا کی

جائے' غریب غُربا کی امداد ہو' تو کہا بھی جائے کہ نیکی کا کام ہو رہا ہے۔" بابا حیات نے جواب دیا۔

"ہم ان کاموں کی طرف بھی آئیں گے باباجی! اچھا ہوا آپ نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا۔"

"گلی کو پکا کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟" بابا حیات نے کہا۔

"آدھی رقم آپ جمع کریں گے' آدھی حکومت دے گی۔" ورکر بولا۔

"اتنی رقم ہم کس طرح اکٹھی کر سکیں گے؟" بابا حیات بولا۔

"گلی کے دونوں طرف جن لوگوں کے مکان ہیں وہ برابر چندہ دیں گے۔" ورکر نے جواب دیا۔

بابا حیات کوئی اور بات پوچھنے ہی والا تھا کہ چوہدری بول اٹھا "چوہدری حیات! حکومت کے کام میں روڑا نہیں اٹکانا چاہئے۔ حکومت چاہتی ہے کہ گلیاں پکّی ہوں۔ میں اور تُو کون ہوتے ہیں کہ اس کا حکم ٹالیں۔"

ورکر نے کہا "نہیں چوہدری جی! یہ کام رضاکارانہ طور پر ہو گا۔ حکومت اس کام میں سختی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ رقم جو حکومت کی تحویل میں ہے' ہمیں امداد کے طور پر ملی ہے۔"

"امداد کہاں سے ملی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"امریکہ نے دی ہے۔"

"امریکہ نے کیوں دی ہے۔ اُسے کیا فائدہ ہو گا ان کاموں سے۔" چوہدری رحمت نے پوچھا۔

ورکر نے مُسکرا مُسکرا کر سب کی طرف دیکھا۔ اُس نے ایک ایک چہرے کو ٹٹولا۔ کوئی چہرہ اُسے مُسکراتا ہوا نظر نہ آیا' تو اُس نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"پاکستان ایک غریب ملک ہے۔ امریکہ ایک امیر ملک ہے۔ ایک امیر ملک ایک غریب ملک کی امداد کرنا چاہتا ہے تو اس سے اُسے کیا فائدہ ہو سکتا ہے جیسے سفید پوش اس گاؤں کا امیر آدمی ہے وہ کسی غریب آدمی کی امداد کرنا چاہے تو آپ اس سے پوچھیں گے کہ اُسے اس کارِ خیر سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"جی ہاں ہم پوچھیں گے۔" بابا حیات بولا "ہو سکتا ہے اُس نے ہم سے "ووٹ"

لئے ہوں۔ سید پور کے ذیلدار نے جب ہم سے ووٹ مانگے تھے' تو ہمارے فائدے کے لئے اس نے مدرسہ کھولنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"چوہدری حیات! تو تو بال کی کھال اتارتا ہے۔ سیدھی بات ہے' حکومت ہمارے گاؤں کو فائدہ پہنچانا چاہتی ہے' تو پتہ نہیں کیوں اتنے ایچ پیچ ڈال رہا ہے۔ چوہدریو! فیصلہ کرو کہ ہمیں کس گلی سے کام شروع کرنا چاہئے۔"

گلی کے انتخاب پر بڑی لمبی بحث ہوئی۔ ہم نوجوانوں کا تقاضا تھا کہ پہلے وہ گلی پکّی ہونی چاہئے جو مشرق سے مغرب کو گاؤں کے بیچوں بیچ سے گزرتی ہے۔ اس گلی سے دوسرے گاؤں والوں کا آنا جانا ہوتا ہے۔ یہ گلی جوہڑ کے کنارے بھا اسلم کی دکان کے پاس آ کر ختم ہوتی ہے اور اس سے آگے وہ چھوٹی سڑک شروع ہوتی ہے جو ہمارے کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی گوندل سے سیالکوٹ جانے والی بڑی سڑک سے جا ملتی ہے۔ لیکن چوہدری نے ضد کی اور لوگوں نے مجبور ہو کر اس تنگ اور ٹیڑھی میڑھی گلی کو پکّا کرنا منظور کر لیا جو اُس کی حویلی سے شروع ہو کر بڑی گلی سے آ ملتی ہے۔ اسی گلی میں ماسی ریشم کا گھر بھی ہے۔ اس نے چندہ دینے سے انکار کر دیا۔ اُس نے کہا "گلی کچّی ہو یا پکّی مجھے اس سے کیا؟ میں نے کون سا پاؤں میں مندی لگا کر ٹھمک ٹھمک چلنا ہے۔ چودھرائن کے پاؤں پہلے ہی زمین پر نہیں ٹکتے' اب مُورنی کی چال چلا کرے گی تو مجھے کیا؟"

چوہدری نے کہا "اس اُلٹی عقل والی سے کون بحث کرے۔"

بہرحال یہ گلی پکّی ہوئی اور اس گلی کا سارا پانی بڑی گلی میں جمع ہونا شروع ہوا تو وہاں ایک چھوٹا سا جوہڑ بن گیا اور آنے جانے والے چوہدری کو کوستے رہے کہ اس نے اپنی گلی کو پکا کروا کے راہیوں کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔

ہر گاؤں کی اپنی اپنی سیاست ہوتی ہے۔ اس کو برادریوں کی داخلی سیاست کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کا دائرہ نہایت تنگ ہوتا ہے لیکن اس دائرے میں بھی زندگی کی ننھی ننھی لہریں اٹھتی ہی رہتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جھگڑے' رشتے ناطوں میں جوڑ توڑ' نکاح اور طلاق کے قصے' وراثت کی تقسیم میں مقدمہ بازی۔ اس سیاست کا تعلق گاؤں کی اندرونی کشمکش سے ہوتا ہے۔ اس کا تعلق بیرونی دنیا سے اس وقت قائم ہوتا ہے جب کسی انتخاب کا ہنگامہ شروع ہو۔ یہ ہنگامہ تو کبھی کبھار ہوتا ہے لیکن اس کے گزرنے کے بعد گاؤں میں سیاسی

کے لئے مخصوص ہے۔ وہ عائشہ کی بہن تھی۔ دونوں ایک عرصے سے بہنوں کی طرح رہ رہی تھیں۔ اب میں اسے بیوی کے رُوپ میں اپنانے کو کیسے تیار ہوتا۔

وہ رات آ گئی، چیت کے مہینے کی خُنک رات۔ اس رات کی کیفیت کے تذکرے میں نے اکثر اپنے دوستوں کی زبان سنے تھے۔ ان رنگین داستانوں نے میرے خون کو گرمایا بھی تھا پر اب جب وہی رات مجھ پر بیتنے لگی تو اس کا مزا میرے منہ میں راکھ بن کر گھل گیا۔ میرا جسم ٹھنڈا تھا، میری روح ٹھنڈی تھی۔ میں زینت کے جہیز میں آئے ہوئے پلنگ پر لیٹا رہا اور سمٹی سمٹائی ہوئی زینت مجھ سے نظریں چُرائے دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھی رہی۔ میں نے اُس کا گھونگٹ بھی نہ اُلٹا۔ اُس کا مزاج بھی نہ پوچھا۔ کون جانے اُس کے دل پر کیا گزرتی رہی۔ نجانے اُس نے اُس رات کے متعلق کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔ میں اُس کے مَن میں جھانکتا تو ان خوابوں کی حقیقت سے واقف ہو سکتا۔

"کل دن کے اجالے میں مَیں اُس سے نظریں کیسے ملاؤں گا؟" میں نے سوچا۔ زینت کے دل کا دُکھ میرے انگ انگ میں رچا، تو میرا جی بھر آیا۔

تب رات گزر گئی۔ میں منہ اندھیرے اٹھا اور بھٹّے پر چلا گیا۔ اس دن مجھے شہر جانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں نے سائیکل اٹھائی اور شہر چلا گیا۔ میں نے سارا دن شہر میں بسر کر دیا۔ میں اُس دن ان لوگوں کے پاس بھی رقم کی اگاہی کے لئے گیا جن سے رقم ملنے کی اُمّید نہ تھی۔ میں اُن دفتروں میں گیا جہاں ہمارے بل مدتوں سے اَڑے ہوئے تھے اور اُنہیں صرف بھٹے کا مالک وصول کر سکتا تھا۔ ایک دو بابوؤں سے میری تُو تُو میں میں بھی ہوئی اور اس سفر کے دوران میں اُس گلی کے پاس سے بھی گزرا جس کے ایک کونے میں شیماں کا گھر تھا۔ میرا مَن کتنا بڑا چور تھا! وہ کس قدر نٹ کھٹ تھا! وہ مجھے کتنے فریب دے رہا تھا۔ "میں اس کے فریب میں نہیں آؤں گا، نہیں آؤں گا۔" میں نے گلی کے پاس سے دوسری بار گزرتے ہوئے سوچا۔

جب میں شام کو بھٹّے پر آیا تو تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ میں نے ایک پنہیرے کے ہاتھ گھر پیغام بھیج دیا کہ میں آج رات گھر نہیں آؤں گا۔

اس سے اگلی رات بھی گھر نہ گیا تو اگلے دن منہ اندھیرے میرا باپ بھٹّے پر آ گیا۔ اُس نے چارپائی پر میرے پاس بیٹھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا "ماہنے! کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں بابا!"

"تم دو دن سے گھر نہیں آئے۔ کوئی بات ضرور ہے۔"

"مجھے نہیں پتہ بابا۔" میں نے منہ پھیر کر کہا۔

"گاؤں والوں کے کان میں اس کی بھنک پڑ گئی تو وہ طرح طرح کی باتیں کریں گے۔"

"بھٹّے پر کئی کام مدتوں سے رُکے ہوئے تھے بابا۔ یہ نہ ہوتے تو سیٹھ صاحب ناراض ہوتے۔"

"یہ تو ایک بہانہ ہے ماہنے! مجھ سے دل کی بات نہ چھپاؤ۔"

"بابا میں آج شام گھر ضرور آؤں گا۔ اب تم جاؤ۔"

اس شام باپ سے اپنا وعدہ پورا کرنے کو میں گاؤں کی طرف آ رہا تھا کہ رستے میں ماسی ریشو سے ملاقات ہو گئی۔

اس نے چُھوٹتے ہی پوچھا "ماہنے! تم کس کس کو دھوکا دو گے؟"

"کیسا دھوکا ماسی؟"

"دوسروں کو دھوکا دینا آسان ہے پر اپنے آپ کو دھوکا دینا مشکل ہے۔"

"میں کسی کو دھوکا نہیں دے رہا ماسی!" میں نے چِڑ کر کہا۔

"کیوں جھُوٹ بولتے ہو؟ اپنے مَن میں جھانک کر دیکھو۔"

"مَن تو اتھاہ سمندر ہے ماسی! مجھے تو اس میں کچھ نظر نہیں آتا اور کون ہے وہ جو اس کے پاتال تک پہنچ سکا ہو؟"

"کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ مجھے پتہ ہے تیرے مَن میں کوئی کھوٹ نہیں پر تیری اور زینت کی راہ میں کون اَٹک گیا ہے؟"

"کوئی بھی تو نہیں۔" میں نے کہا "اور ہاں ماسی! تم کیوں پوچھتی ہو؟ تمہیں کیسے پتہ چل گیا۔"

میری چونکی ہوئی آواز پر پہلے ماسی کچھ حیران ہوئی۔ پھر اس نے دُکھ بھری مسکراہٹ سے کہا "ماہنے! میں تجھے بچپن سے جانتی ہوں نا۔ بھلا مجھے پتہ نہ چلتا تو اور کس کو چلتا؟"

دھڑے بن جاتے ہیں۔ ذیلدار جب سے ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر بنا تھا، اُس وقت سے چوہدری بھی اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھنے لگا تھا۔ تحصیل کچہری میں اُس کا اثر رسوخ بڑھ گیا تھا۔ وہ گاؤں میں کسی آدمی کو اپنے برابر نہ سمجھتا۔ اس کا دھڑا مضبوط ہو گیا تھا۔

چوہدری رحمت خان کو اس صورتِ حال سے تشویش تھی۔

جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے، ہمارے گاؤں میں پرائمری سکول کھل چکا تھا۔ سکول ماسٹر چوہدری کی حویلی میں رہتا تھا۔ وہ پتہ نہیں کس مٹی کا آدمی تھا کہ لوگوں نے اُسے کئی بار چوہدری کا حقّہ بھرتے بھی دیکھا تھا اور اُسے اس میں عار محسوس نہ ہوتی تھی۔ چوہدری اُس کی خدمت کا بدلہ دینا چاہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ برج لال کا مکان رہائش کے لئے اُسے کھول کر دے دے گا۔ اس کی بھنک چوہدری رحمت خان کے کان میں پڑی تو وہ بابا حیات کے پاس آیا۔ اُس نے کہا۔ "بابا! چوہدری بہانے بہانے سے شاملات دیہہ پر قبضہ کرتا چلا جا رہا ہے اور ہم اس کی چالوں کو سمجھ نہیں پا رہے۔"

"کیوں کیا بات ہوئی؟"

"اُس نے بابا نتھو کا مکان ورکر کو دے دیا اور اب وہ برج لال کا مکان ماسٹر کو دے رہا ہے۔"

"برج لال کا مکان بھی شاملات دیہہ پر بنا ہے نا؟" بابا حیات نے پوچھا۔

"ہاں!"

"تو پھر کیا حرج ہے؟ ماسٹر بھی تو سرکاری آدمی ہے۔"

"بابا! تم نہیں جانتے، شاملات دیہہ پر ایک بار جو قبضہ کر لے، وہ جگہ اُسی کی ہو جاتی ہے۔ چوہدری بڑی گہری چال چل رہا ہے۔"

تب دونوں نے مل کر ایک اکٹھ کرنے کی ٹھانی۔ ان کی تجویز تھی کہ یہ اکٹھ دکان کے تھڑے پر ہو۔ میرے باپ نے اس کی مخالفت کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھا اسلم گاؤں کی دھڑے بندی میں شریک ہو۔ اس طرح اس کی ذات چوہدری کی کینہ پرور دشمنی کا نشانہ بن جائے گی۔ یہ اکٹھ بابا حیات کے کنوئیں میں ہوا۔ اس میں فیصلہ ہوا کہ برج لال کا متروکہ مکان بھی بھا اسلم کو دے دیا جائے کیونکہ وہی اس کا حق دار ہے۔

ابھی ہمارے دھڑے کا وفد چوہدری کے پاس گیا بھی نہیں تھا کہ اُس کو خبر مل گئی۔

ایک شام ہم دکان کے تھڑے پر بیٹھے تھے۔ میں نے ابھی ابھی اخبار پڑھ کر لوگوں کو سنایا تھا اور خبروں پر تبصرہ جاری تھا کہ چوہدری بھی وہاں آ دھمکا۔ اُس کے اچانک آ جانے سے مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ اُس نے السلام علیکم کہہ کر مجمع کو ایک نظر دیکھا۔ اس ایک نظر میں نفرت بھی تھی اور غصہ بھی۔ اُس کا بس چلتا تو سب کو غصے کی آگ میں بھسم کر ڈالتا۔ بھا اسلم جس مونڈھے پر بیٹھا تھا، وہ اُس نے خالی کر دیا اور کہا "چوہدری جی بیٹھیے۔"

چوہدری نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مہاجر لوکے! اب تو تمہاری دکان پر سیاست کا بازار بھی گرم ہوتا ہے۔"

بھا نے کہا "جی نہیں! میں کبھی کبھی شہر سے اخبار لے آتا ہوں۔ ملہتا خبریں پڑھ کر سناتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سیاست کی کوئی بات نہیں ہوتی۔"

چوہدری نے پتلے پتلے ہونٹوں میں بھنچی ہوئی مسکراہٹ کو زہر آلود بنا کر کہا "میری مانو تو اخبار وغیرہ نہ منگوایا کرو کہیں دھر نہ لئے جاؤ۔"

"کس جرم میں؟" بھا نے پوچھا۔

"سیاست بڑے لوگوں کا کام ہے۔ تم ایک چھوٹی سی ہٹی کے تھڑے پر بیٹھ کر اتنی اونچی باتیں کیوں سوچ رہے ہو؟"

"کون سی اونچی باتیں؟"

"تم گاؤں میں اپنا سیاسی دھڑا بنا کر لوگوں کو اپنے پیچھے کیوں لگانا چاہتے ہو؟"

"شرف دین!" چوہدری رحمت خان نے کہا "کچھ انصاف سے کام لو۔ کسی بھلے آدمی کی نیت پر شک کرنا اچھا نہیں۔"

"رحمت خان! اس نادان مہاجر لڑکے کو کیوں خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ یہ باہر کی بوٹی ہے۔ تم اُسے چک مراد کی دھرتی میں لگانا چاہتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ طوفان کا ایک جھونکا آئے اور یہ بوٹی جڑ سے اُکھڑ جائے۔"

"نہیں چوہدری! اب اس بوٹی کی جڑ اس دھرتی میں لگ چکی ہے۔ تمہیں پتہ ہے چوہدری موج دین نے اس سے اپنی لڑکی کا رشتہ کر دیا ہے۔ لڑکی موج دین کی ہو یا تمہاری، اس گاؤں کی لڑکی ہے۔ اب تو اسلم سارے گاؤں کا داماد ہے۔"

چوہدری رحمت خان کی یہ بات سن کر سفید پوش کچھ دیر سر جھکا کر سوچتا رہا۔ پھر اُس

نے کہا۔ "گاؤں والوں کو اپنی عزت ناموس کا کچھ خیال ہوتا تو لڑکی کا رشتہ ایک اجنبی ذات کے آدمی سے کرنے پر موج دین کا حقہ پانی بند کر دیتے پر اب زمانہ بدل گیا ہے۔"

"شرف دین!" بابا حیات بولا "ہم نے کھوٹا کھرا پرکھ کر یہ رشتہ طے کیا تھا۔ برادری والے تیرے پاس ایک اور کام کے لئے آ رہے تھے پر تو نے نئی کہانی چھیڑ دی۔"

"میرے ہاں آ رہے تھے تم؟ ہوں!" چوہدری نے کہا۔ "تم سارے فیصلے ہتی پر بیٹھ کر لیتے ہو اور مجھ سے ان پر انگوٹھا لگوانے کے لئے آ جاتے ہو۔ مجھے پتا ہے، تم نے کیا گورمتا پکایا ہے۔"

"تیرا جاسوسی کا محکمہ بڑا تیز ہے۔" رحمت خان نے کہا "اب جب تمہیں اس کا پتا لگ ہی گیا ہے، تو کیوں نہ یہیں اس کا دوٹوک فیصلہ ہو جائے۔"

"نہیں!" چوہدری نے غصے سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "برج لال کا مکان اس مہاجر لڑکے کو نہیں ملے گا رحمت خان، کبھی تو گاؤں کی بہتری کا بھی سوچا کرو۔ یہ مکان میں نے ماسٹر کو دینے کا وعدہ کیا ہے۔ پتہ نہیں مہاجر لڑکے نے تم پر کیا جادو کر دیا ہے کہ تمہارے بس میں ہو تو سارے کا سارا گاؤں اس کی جھولی میں ڈال دو۔"

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے چوہدری؟" رحمت خان نے پوچھا۔

"ہاں!"

چوہدری کے جانے کے بعد رحمت خان اٹھا۔ اُس نے برج لال کے مکان کی ڈیوڑھی کے زنگ آلود تالے کو جھٹکا دیا۔ تالا ٹوٹ گیا۔ اُس نے کواڑ کھولے تو ڈیوڑھی سے باسی ہوا کا ایک بھبکا آیا۔ گلی میں ایک عجیب سی بساند پھیل گئی۔ مرے ہوئے چوہوں، ٹڈیوں اور سیلن لگی بھربھری اینٹوں پر لگی پھپھوندی کی بساند۔ ڈیوڑھی سے آگے ڈربہ نما صحن تھا اور اُس سے آگے دو کمرے۔ ان پر بھی زنگ آلود تالے تھے جو ایک ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے۔ کواڑ کھلے تو اندر سے سات آٹھ سال کی ویرانی اور تاریکی کا ایک ریلا آیا اور میں یکایک اداس ہو گیا۔ نجانے کیوں مجھے ونود کمار یاد آ گیا اور برج لال کی تھل تھل پل پل للائن جو گلی میں سے گزرتی تو چھوئی مُوئی کی طرح سمٹ سمٹا کر جیسے ہم سے چھو گئی تو غُبارے کی طرح پھٹ جائے گی اور آج یہ مکان بھا اسلم کا تھا۔

اب میں اس مکان پر قبضے کی داستان کو لمبا نہیں کروں گا۔ اس سے پہلے کہ چوہدری

تحصیل تھانے جاکر حکم امتناعی لے کر آتا یا بھا کے وارنٹ، گاؤں بھر کی عورتوں نے مکان کو لپ پوت کر اس قابل بنا دیا کہ بھا اس میں رہ سکے۔ کمروں کا کچا فرش کئی کئی ہاتھ کھدا ہوا تھا اور کچی دیواروں کی اینٹیں جگہ جگہ سے کھسکی ہوئی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ چوہدری نے برج لال کے دفینے کی تلاش میں فرش کھدوایا ہو گا اور اینٹیں کھسکائی ہوں گی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ مکان کی صفائی کے دوران ہمیں تو صرف تانبے کا ایک پیسہ ملا اور ایک ٹوٹی ہوئی چوڑی جو پیتل کی تھی۔ اندر کوٹھڑی میں کوئی برتن تھا نہ چارپائی۔ مٹی کے ایک دو مٹکے تھے اور ایک بھڑولا جو اناج سے خالی تھا۔ اس سے مرے ہوئے چوہوں کی کچھ سوکھی لاشیں ملیں۔

تحصیل اور ضلع کی عدالتوں میں چوہدری نے بھا اسلم کے خلاف مقدمے دائر کئے لیکن سمن آنے سے پہلے بھا نے اپنے نام مکان کی باقاعدہ الاٹمنٹ کرا لی۔ ایک دو پولیس کے سپاہی آئے۔ لیکن گاؤں والوں کا اکا دیکھ کر بھا پر ہاتھ ڈالنے کی جرات نہ کر سکے۔ چائے پانی کے لئے کچھ لے لوا کر واپس چلے گئے۔ آہستہ آہستہ مقدمے خارج ہو گئے اور چوہدری نے اپنی ہار کو اپنے مَن کے اتھاہ سمندر میں غرق کر لیا۔ اُس نے صرف ایک موقعے پر کہا کہ مہاجر لڑکے کو میری دشمنی مہنگی پڑے گی۔ بھا نے اُس کا جواب مسکرا کر دیا تھا۔ "زندگی مہنگی سستی چیز کا نام نہیں۔ اس میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ سینہ چوڑا ہو تو لگنے والا ہر وار ہنس کر سہا جا سکتا ہے۔"

اُس سال چیت کے مہینے میں میری اور بھا اسلم کی شادیوں کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ بھا نے بھٹے سے اینٹیں منگوا کر مکان کی مرمت کی۔ دکان کا تھڑا پکا کروایا۔ زینت اور عائشہ کے لئے کپڑے خریدے اور زیور بنوایا۔ بیاہ سے ایک مہینہ پہلے وہ زینت کو لائل پور چھوڑ آیا۔ پہلے لائل پور سے بھا کی برات آئی اور ہم نے عائشہ کو ڈولی میں بٹھا دیا۔ اگلے دن میری برات لائل پور کے لئے روانہ ہوئی۔ چوہدری نے برات میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ میں اور میرا باپ خود اُس کے گھر گئے۔ میں نے کہا "اگر آپ برات میں شریک نہیں ہو سکتے تو آپ کی مرضی لیکن سلیمان کو تو بھیج دیجئے۔ وہ آخر میرا جماعتی ہے اور بچپن کا ساتھی بھی۔"

چوہدری نے کہا "نہیں ماہنے! دشمنی دشمنی ہے۔ میں تُلّی کی زندگی کو خطرے میں

کیوں ڈالوں؟"

چوہدری کے منہ سے یہ بات سُن کر مجھے بہت دُکھ ہوا۔

ہم زینت کی ڈولی لائل پور سے لے آئے۔ برات کی واپسی شام کو ہوئی۔ چیت کی اس صاف ستھری نکھری شام میں رچی ہوئی ٹھنڈک اور شفق کی نرم نرم سُرخی کی دھیمی دھیمی آگ مجھے بہت اُداس اُداس سی لگی۔ یوں تو کوئی سماں اُداس نہیں ہوتا، مَن کی اُداسی اس میں رچ جاتی ہے تو سمے کی صورت بدل جاتی ہے۔ وہی گاؤں تھا، وہی کھیت تھے، وہی روں روں چلتے کنویں تھے، وہی مکان تھے، وہی دیواریں پر ان کے اندر کا نقشہ بدل گیا تھا۔ ہم زینت کی ڈولی لے کر گاؤں میں ابھی داخل نہیں ہوئے تھے کہ مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ کپکپاتی ہوئی آواز نے نہ جانے دل کے کس تار کو چھیڑا کہ میری آنکھوں میں دُھند چھا گئی۔ میں نے کندھے پر پڑے ریشمی انگوچھے سے دُھندلی آنکھوں کو پونچھ لیا۔ بھائی دکان کا تھڑا خالی تھا اور جوہڑ کے گدلے پانی میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ جب ہم گاؤں کی گلی میں داخل ہوئے تو میرا بچپن لپک کر آیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے میرا لڑکپن بھی اور ایک لمے کے اندر اندر گزرا ہوا زمانہ سیلاب کی طرح اس زور سے اُمڈ آیا کہ سمندر سے بھی گہرے دل کا کوئی کونہ خالی نہ رہا۔ وہ لبالب بھر گیا تو مجھے ڈر لگا کہ وہ کناروں سے چھلک نہ جائے۔

تب میں نے اس شام کے ہجوم میں پناہ ڈھونڈ لی۔ سارا گاؤں ہمارے گھر میں جمع تھا آدھی رات تک ہمارا صحن لوگوں سے بھرا رہا۔ میرا باپ خوش تھا، میری ماں خوش تھی۔ میری بہن عائشہ خوش تھی۔ میں نے ان خوشیوں میں ڈوب جانا چاہا، لیکن ایسا نہ ہوا حتیٰ کہ رات بھیگ گئی۔ اس رات دوسرے گاؤں سے آنے والے بہت سے مہمان ہمارے گھر میں جمع تھے، اس لئے چھوٹے سے مکان میں زینت اور میرے لئے الگ جگہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ میں نے بھا اسلم کے گھر میں سونے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ وہ گھر اب عائشہ کا ہے اور عائشہ میری بہن ہے۔ میری ماں کو میرے انکار سے دُکھ ہوا۔ میں نے ضد کی تو وہ چُپ ہو رہی۔ اس رات تھکاوٹ کے باوجود میری آنکھ نہ لگی، پر اُدھ کھلی آنکھ کے سامنے خوابوں کا ایک میلہ سا لگا رہا اور خوابوں کے اس بھرے میلے میں ایک خواب کو دوسرے سے جدا کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ اگلی صبح اندھیرے اُٹھ کر بیٹھے پر چلا گیا۔ دن چڑھے عبدالغفار میرا ناشتہ لے کر پہنچا تو اُس نے کہا "بھا! تُو نے یہ کیا کیا؟ ماں کہتی تھیں

شام سے پہلے پہلے گھر آ جانا۔"

"اچھا!" میں نے کہا۔

وہ دن چھلیوں میں ڈوب گیا اور شام کے سائے لمبے ہونے لگے تو میرے مَن کی اُداسی چار کھونٹ سے لپک کر آئی۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا "ماہنے! تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

میرے اس سوال پر میرے اندر سے ایک اور شخص بولا "تو خود سوچ۔ اپنی سوچ کا بوجھ دوسروں پر کیوں ڈالتا ہے؟"

"میں نہیں سوچ سکتا۔ میں نہیں سوچ سکتا۔" میں نے گاؤں جانے والی پگڈنڈی پر پہلا قدم رکھتے ہوئے کہا۔

اُس وقت ایک آواز میرے کان میں آئی "ماہنے!"

میں نے چونک کر پوچھا "کون؟"

"میں ہوں شیماں۔"

"شیماں تم کیوں آئیں اس پگڈنڈی پر؟ یہ راستہ تو گاؤں کی طرف جاتا ہے اور ہم نے تجھے اسی راستے سے گاؤں سے نکال دیا تھا۔ جاؤ! جاؤ! اس گاؤں کے سب لوگ ماہنے کی طرح کمینے ہیں۔ وہ تمہیں اس پگڈنڈی پر قدم نہیں رکھنے دیں گے۔"

وہ چلی گئی تو میرا جی بھر آیا۔ میں نے چاہا کہ بھا اسلم میری آنکھوں سے آنسو پونچھ کر کہے "ماہنے! بچپن اور لڑکپن سے لے کر جوانی تک بہت لمبا فاصلہ ہے۔ یہ فاصلہ طے ہو چکا ہے۔ ایک چھلانگ اور لگاؤ اور جوانی کی حد کو بھی پار کر جاؤ اور مرد بن کر زندگی کا جُوا اپنے کندھوں پر ڈال لو۔"

پر اب بھا اسلم میرا دوست نہیں تھا۔ وہ میرا بہنوئی تھا۔ وہ میرا سالا تھا۔ اب رشتوں کی صورت بدل گئی تھی۔ میں نے اُسے بہنوئی کی حیثیت سے مدتوں سے قبول کر لیا تھا۔ اب اُسے سالے کی حیثیت سے قبول کرتے ہوئے مجھے وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ کسی کو سالا کہنا گالی ہے۔ اور میں بھا اسلم کو گالی کیسے دے سکتا تھا۔ حقیقت کچھ بھی ہو، جب تک اسے دل قبول نہ کرے، وہ حقیقت نہیں بنتی۔ آج کی شام مجھ پر بہت بھاری تھی۔ منگنی سے لے کر اب تک میں نے زینت کو اپنے دل میں وہ جگہ نہ بنانے دی تھی جو ایک منگیتر

اس لمحے اچانک مجھے ماسی پر بے پناہ غصہ آیا۔ لرزتا کانپتا غصہ۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اُن کے بول میرے ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی ٹوٹ گئے۔

ماسی نے کہا "ماہنے! میری بات کا غصہ نہ کرو۔"

"نہیں ماسی!"

"پُر تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ کون ہے جو تیری اور زینت کی راہ میں روڑا بن کر اٹک گیا ہے؟"

"نجانے کون؟"

میں نے گاؤں کی طرف قدم بڑھا لئے۔ ماسی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ شام کے وقت انسان کا سایہ اندھیرے میں گُم ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اچھا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار انسان اپنے سائے کے ساتھ سے بھی تنگ آ جاتا ہے۔ ماسی سائے کی طرح میرے ساتھ لگ گئی تو میں بے چین سا ہو گیا۔ وہ تو میرے بچپن سے سایہ بن کر میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ وہ شیماں کے آنگن میں میرے ساتھ ساتھ لگی رہی۔ وہ اُس گلی میں بھی میرے ساتھ رہی جہاں میری آواز اپنے ہی ہونٹوں میں دب کر رہ گئی تھی۔ میرے اور شیماں کے درمیان ملاپ کا کوئی بھی لمحہ آیا تو ماسی کے سائے نے گرہن بن کر اُسے ہڑپ کر لیا۔ پھر نجانے کیوں مجھے اپنے خیالات کی گونج سنائی دینے لگی تو میں نے سوچ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے ڈر تھا ماسی اس آواز کو بھی سُن لے گی۔

میں نے کہا "ماسی! تم جانتی ہو بھا کے ساتھ میرا کیا تعلق تھا؟"

"وہ مہاجر لڑکا؟"

"ہاں! ہاں! وہی۔ وہ میرا دوست تھا۔ اب اس کی بہن سے میرا بیاہ ہو گیا ہے۔ اب دوستی کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے نا؟"

"مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔"

"جھوٹ! جھوٹ! یہ جھوٹ نہیں ہے۔"

"جو سچ ہے۔ وہ تمہارے ہونٹوں پر نہیں آیا۔"

"کون سا سچ؟"

"وہ جو سائے کی طرح تمہارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔"

"ماسی آج سے پہلے تو تم نے دلوں کا حال پوچھنے کا دعوےٰ نہیں کیا تھا۔"

"پر تمہارے دل کا حال تو میں جانتی ہوں نا۔"

"ہاں! ہاں!" میں نے کہا اور ہم دونوں سایوں کی طرح گلی میں داخل ہوئے اور پھر جب ماسی کی گلی کا موڑ آیا وہ چپکے سے مجھ سے الگ ہو گئی۔

اُس رات میں نے زینت کو پہلی بار اُس عورت کے روپ میں دیکھا جس کے بدن سے میرا بدن مل سکتا تھا، خواہ دلوں کے درمیان کالے کوسوں کا فاصلہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگلے دن بھا اسلم آیا اور عائشہ اور زینت دونوں کو لائل پور لے گیا۔ دو چار دنوں بعد میں لائل پور گیا اور وہاں سے زینت کو واپس لے آیا اور اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ بھا کی دکان بند رہی۔ تھڑے کی محفل سُونی رہی۔ ایک مہینے کے بعد بھا نے لائل پور سے آ کر دکان کھولی تو مجھے یوں لگا جیسے زندگی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جُڑ گیا ہو۔ ہم نے بھا اور عائشہ کو برج لال کے مکان میں الگ کر دیا اور گاؤں کی مختصر آبادی میں ایک اور گھر کا اضافہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۱۵

○

جب زندگی ایک ڈگر پر چل رہی ہو، تو اس کی کہانی نہیں بنتی۔ ایک دن، ایک رات، ایک رات، ایک دن، اس سے کوئی پل چنگاری کی طرح ٹوٹ کر الگ ہوتا ہے تو اُس کی چمک سے کہانی کا کوئی رُخ نکھرتا ہے۔ پر یہ پَل جگنو کی جلتی بجھتی روشنی ہے کہ ہاتھ میں آ کر مَسلی جاتی ہے۔

اُس سال سلیمان نے بارھویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ چودھری کو اس بات پر بڑا فخر تھا۔ اب وہ مجھ سے کم ہی ملتا جُلتا تھا۔ وہ جب شہر سے آتا تو بھٹے کے قریب تانگے سے اُتر کر گاؤں میں آیا کرتا تھا اور میں وہاں اکثر موجود ہوتا لیکن وہ کبھی مجھ سے ملنے کو نہ رُکا۔ ایک دو بار دُور سے سلام دعا ہوئی۔ اب ہمارا لڑکپن گزر چکا تھا۔ مجھے تو اس سے کوئی بیر نہیں تھا لڑکپن کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ اب میں شادی شدہ تھا۔

انہیں دنوں ورکر نے گاؤں میں ایک چھوٹی سی لائبریری قائم کی۔ اسے سرکار کی طرف سے ایک ٹرانسسٹر ملا تھا۔ اس نے ایک دن گاؤں کے جوانوں کو اپنے ہاں بلایا۔ اس نے چائے سے ہماری تواضع کی۔ ایک چھوٹی سی تقریر بھی کی جس کا مقصد یہ تھا کہ گاؤں کے پڑھے لکھے لڑکوں کو اُس کی لائبریری میں آ کر بیٹھنا چاہئے۔ کچھ مفید کتابیں پڑھ کر ان کے علم میں اضافہ ہو گا۔ ایک تو سلیمان پڑھا لکھا تھا اور دوسرا منشی عبدالرحمٰن جس نے عرصے سے کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا یا ہم سے چھوٹی پود کے لڑکے جو سکول سے آ کر گولیاں کھیلنے کو پڑھنے پر ترجیح دیتے تھے۔ سلیمان کو ورکر کی لائبریری میں کوئی کام کی کتاب نظر نہ آئی۔ اس نے کہا "عبدالرحمٰن! کبھی شہر آؤ تو میں تمہیں اپنے کالج کی لائبریری دکھاؤں۔ اتنی ڈھیر ساری کتابیں دیکھ کر تمہاری سِٹّی گُم نہ ہو جائے تو کہنا۔" مدتوں بعد سلیمان نے مجھ سے اس بے تکلفی سے بات کی، تو واقعی میری سِٹّی گُم ہو گئی۔ میں اس کی طرف حیران ہو کر تکنے لگا تو

اس نے کہا "یار ماہنے پڑھنے کا مزہ تو اب آیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم آٹھویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکے۔"

"نِکّی یہ اپنی اپنی قسمت ہے جس چیز تک ہاتھ نہ پہنچ سکے اس پر افسوس کرنا بھی تو ٹھیک نہیں۔"

"دیکھو ماہنے! مجھے سلیمان کہا کرو۔"

"شاید تمہیں یاد نہ رہا ہو، میرا نام بھی عبدالرحمٰن ہے۔" میں نے کہا۔

ورکر میری بات سن کر مسکرایا۔

مجھے جب بھی موقع ملتا، میں ورکر کی لائبریری میں آ بیٹھتا۔ کچھ رسالے دیکھتا، کوئی کتاب چکھتا۔ سہ پہر کو دکان پر بھی جاتا اور لوگوں کو اخبار پڑھ کر سناتا۔ تب ایک دن مجھے اچانک محسوس ہوا کہ ورکر کی لائبریری میں جو کچھ تھا، وہ میں نے پڑھ لیا ہے۔ جدید کاشتکاری پر کچھ کتابیں، دیہات سدھار کے پروگرام پر چند رسالے، دو چار جاسوسی ناول، امریکی ناولوں اور افسانوں کے کچھ ترجمے۔ پانچ سات ایسی کتابیں جو امریکہ سے متعلق تھیں۔ چٹ پٹی غذا کے ایک دو لقمے کھا کر میری بھوک جب چمک اٹھی تو ورکر کے پاس اور کچھ بھی نہیں رہا۔ میں مایوس ضرور ہوا لیکن اس بات پر خوش بھی تھا کہ ابھی تک میرے دل میں پڑھنے کی کسک تو باقی ہے۔

میں نے ایک عرصے سے حیداں کا ذکر نہیں کیا۔ وہ اپنے گھر میں رس بس رہی تھی۔ بھا اسلم اور میری شادیوں پر وہ گاؤں نہ آ سکی تھی۔ وہ ذیلدار کی بہو تھی اور ذیلدار ہماری برادری کا نہیں تھا کہ ہم اسے نیوتا بھیجتے۔ تاہم جب وہ میکے آئی تو ہمارے گھر میری ماں کو مبارک باد دینے بھی آئی۔ اس نے کہا۔ "میں تو گاؤں کی بیٹی ہوں، میرا کسی سے بیر نہیں۔"

وہ عائشہ سے ملنے کے لئے بھا اسلم کے گھر بھی گئی۔ میرے ساتھ بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ "ماہنے ویرا! تو اب خوش ہے نا؟"

"کس بات پر؟"

"تیرا بھا ہمیشہ کے لئے اسی گاؤں کا ہو کر رہ گیا ہے۔"

"ہاں مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے۔"

حمیداں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے اُس کے سانولے چہرے پر ایک عجیب سی روشنی نظر آئی جیسے شام ہوتے ہی کوئی تارا ٹوٹ گیا ہو۔ اُس وقت وہ مجھے بڑی خوبصورت لگی۔ میں اُسے بھا کے ساتھ کسی اور ہی رشتے میں بندھا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اور اب وہ میرا بہنوئی تھا۔ یہ خیال کچھ عجیب سا تھا۔ میں نے اسے جھٹک کر اپنے آپ سے الگ کرنا چاہا لیکن یہ میرے ساتھ چمٹا رہا۔

میں نے پوچھا "حمیداں! تم بھی تو خوش ہو نا کہ تم بڑے گھر کی بہو ہو؟"

"ہاں! ہاں! کیوں نہیں؟" اُس نے آنکھیں چرا کر کہا۔

میں نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ تم خوشی کی اس منزل پر پہنچنے کے لئے کن کن راہوں سے گزری ہو اور جس کو ہم منزل سمجھتے ہیں کیا وہ واقعی ہماری منزل بھی ہوتی ہے اور پھر مجھے یوں لگا کہ اس منزل پر حمیداں کی کہانی ختم ہو گئی ہے۔ اب اسے میرے گاؤں سے صرف اتنا تعلّق باقی رہ گیا ہے کہ وہ اس کی بیٹی ہے اور اتنا سا تعلق کہانی کا حصہ نہیں بن سکتا۔

اس سال وہ سیلاب بھی آیا جسے عذاب کہنا چاہئے۔ گاؤں سے نالے تک جَل تھل ہو گیا۔ اتنا پانی ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نالے کا پانی گلیوں میں بہنے لگا۔ کھیت بھی پانی میں ڈوب گئے۔ مکان گرے۔ کچھ کو گلیوں کا پانی بہا لے گیا۔ کچھ بارش کے زور سے گر پڑے۔ ڈھورڈنگروں کے لئے چارا نہ رہا۔ کنویں پانی سے بھر گئے۔ بھتّے کے اوپر سے پانی پھر گیا۔ بارش کے بعد دھوپ نکلی اور پانی بھاپ بنا تو ہم پسینے میں نہا گئے اور کئی کچّی دیواریں دھڑام سے گر پڑیں۔ ساوَنی کی فصل تباہ ہو گئی۔ پانی اُترا تو کھیتوں میں گلی سڑی فصل سے بدبُو اُٹھنے لگی۔ اس تباہی نے ہماری کمر توڑ کر رکھ دی۔ ہمارے مکان کا صرف ایک کمرہ بچا رہا اور کچھ اناج جو ہاڑی تک نہ چل سکتا تھا۔ پر ہم دیہاتی بڑی سخت ہڈّی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم نے گری ہوئی دیواروں کو پھر سے کھڑا کرنا شروع کر دیا اور چھتوں کی مرمت کی۔ گاؤں میں جدھر دیکھو لوگ مکانوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں مصروف نظر آتے تھے۔

انہیں دنوں گاؤں میں پہلا ٹیوب ویل لگا۔ چوہدری کا یہ ٹیوب ویل ہمارے لئے عجوبہ تھا۔ جب یہ پہلی بار چلا تو چوہدری کے کنویں پر میلہ لگا۔ ہمارے دھڑے کا کوئی آدمی اس میں شریک نہ ہوا۔ پھر بھی نئی چیز دیکھنے کی کس کو خواہش نہیں ہوتی، میں ایک دن اس طرف سے گزرا تو ٹیوب ویل پھک پھک چل رہا تھا۔ پانی کی اتنی موٹی دھار بہہ رہی تھی کہ دس کنووں سے بھی اتنا پانی نہ نکل سکتا تھا اور کھیت منٹوں میں سیراب ہو جاتا تھا۔

چوہدری نے گاؤں والی چکی کا انجن بیچ دیا تھا اور پاٹ ٹیوب ویل پر لے آیا تھا۔ اب لوگوں کو آٹا پسوانے کے لئے ایک میل چل کر اس کے ٹیوب ویل پر آنا پڑتا۔ جب ٹیوب ویل بند ہوتا تو اسی انجن سے چکّی چلتی۔ چونکہ چکّی کے چلنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، اس لئے گاؤں والوں کو تکلیف محسوس ہوتی۔ گاؤں کی مٹیاریں سر پر اناج کی گٹھڑیاں رکھ کر اتنی دور آتیں، تو ان کا آنا جانا بھی لوگوں کو اچھا معلوم نہ ہوتا۔ ظاہر میں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں لیکن ان کا اثر دُور تک پہنچتا تھا۔ لوگوں نے چوہدری کے اس فعل کو پسند نہ کیا۔

میرا خیال تھا کہ چوہدری ٹیوب ویل چلانے کے لئے شہر سے پرانے مستری کو بلائے گا لیکن اس نے یہ کام چکّی والے مستری کے سپرد کر دیا۔ سنا ہے سلیمان نے شہر سے مستری کو بلانے پر اصرار کیا تھا لیکن چوہدری نے اُس کی بات نہیں مانی تھی اس پر سلیمان اپنے باپ سے کچھ عرصہ ناراض بھی رہا تھا۔

چوہدری نے ٹیوب ویل کے اِردگرد کی زمینیں پٹے پر لے لی تھیں۔ جن کسانوں نے اسے زمینیں پٹے پر نہ دیں، وہ اس سے اس شرط پر پانی لینے لگے کہ فصل کی ایک تہائی اُسے دیا کریں گے۔ ہمارا ایک کھیت اُس کے ٹیوب ویل کے نزدیک تھا۔ یہ اُس کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ چونکہ چوہدری سے ہماری بول چال بند تھی، اس لئے وہ میرے باپ کے پاس آنے سے ہچکچاتا تھا۔ ہم اس کھیت کو پٹے پر دینے کو تیار نہیں تھے۔ کسان کی زندگی ہَل جُوئے سے ہے۔ ہمارے یہی دو اڑھائی کھیت تھے ان میں سے ایک پٹے پر چلا گیا تو میرے باپ کے پاس کاشت کے لئے کیا رہ جاتا۔ اس کھیت میں فصل بھی اچھی ہوتی تھی۔ ہم اس کے لئے قریب ترین کنویں سے پانی لیتے تھے۔ چوہدری نے ہمارے ان شریکوں کو جن کا یہ کنواں تھا، پتہ نہیں کیا سبز باغ دکھایا کہ اُنھوں نے ہمیں کنواں چلا کر پانی لینے سے روک دیا۔ میں اُن کے پاس گیا تو اُنھوں نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ ہم نے چوہدری رحمت خان کو بیچ میں ڈالا لیکن وہ ٹس سے مَس نہ ہوئے۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے یہ کھیت ایک فصل کے لئے بے کار رہا۔ میرا باپ اُن دنوں بڑا دکھی سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا "بابا! میرے ہوتے ہوئے تمہیں کس بات کی فکر ہے۔ اب میں اتنا کما لیتا ہوں کہ ایک

کھیت کے بے کار پڑے رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"نہیں ماںجے! یہ بات نہیں۔ خالی کھیت بنجر ہو جاتا ہے اور جو کھیت بنجر نہ بھی ہو تو خالی کھیت دیکھ کر کسان کا سینہ بنجر ہو جاتا ہے۔"

"پھر اسے بٹائی پر چوہدری کو دے دو۔"

"نہیں ماںجے! یہ ایک جاٹ کی ہار ہو گی۔"

"بابا! یہ تو گاؤں کی ریت ہے تاکہ جس کنویں سے کھیت نزدیک ہو وہاں سے اسے پانی ضرور ملنا چاہئے۔"

"آج تک تو یہی ریت ہے۔"

"ہمارے شریکوں نے چوہدری کے اکسانے پر اس ریت کو توڑا ہے۔ ہم گاؤں کے بھلے مانسوں کا اکٹھ نہ کروائیں؟"

"نہیں! کل منہ اندھیرے ہم باپ بیٹا ایک دو بجّن ساتھیوں کے ساتھ جوڑی لے کر کنویں پر چلیں گے۔ اگر کسی نے روکا تو دو دو ہاتھ بھی ہو جائیں گے۔ دُنیا میں شرافت کو بزدلی کہا جاتا ہے ماںجے!"

میں اپنے باپ کی اس تجویز پر حیران رہ گیا۔ وہ لڑائی جھگڑے سے بچنے والا آدمی تھا۔ آج وہ مرنے مارنے پر تل گیا تھا۔ چوہدری کی دھاندلی پر میرا بھی خون کھول رہا تھا لیکن میں نے کہا "نہیں بابا! اس طرح جھگڑا اور بڑھ جائے گا۔"

"ماںجے! پڑھ لکھ کر تیرا لہو ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ تُو پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتا ہے نا؟ میں بھی خون خرابہ نہیں چاہتا لیکن اب شریک ہم پر ہنس رہے ہیں۔ ایک کھیت کی فصل سے ہاتھ دھونا کوئی بڑی بات نہیں پر جگ ہنسائی کو ہنس ہنس کر سہنا بھی تو مشکل ہے۔"

"ایک دن اور ٹھہر جاؤ بابا! میں بھا اسلم سے بات کر لوں۔"

"اُس کو اس جھگڑے میں شامل نہیں کرنا چاہئے ماںجے۔"

"ٹھیک ہے بابا! پر کنویں سے پانی لینے کے لئے جھگڑا فساد تو ہو گا۔ پولیس آئی تو چوہدری بھا کو خواہ مخواہ بھی اس جھگڑے میں پھنسا لے گا۔ اُسے سب سے زیادہ دشمنی تو اسی سے ہے۔ بابا! یہ چوہدری کی چال ہے۔ ہم اس کی چال میں نہیں آئیں گے۔"

میرا باپ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ آخر اُس نے کہا "ماںجے! تم ٹھیک

کہتے ہو۔"

"بابا! اگر تم کچھ عرصہ صبر کرو تو چوہدری خود تمہارے پاس آئے گا۔"

میں خُفیہ خُفیہ چوہدری رحمت خان سے ملا۔ اُس کے دس بارہ کھیت تقریباً ایک ہی جگہ پر تھے۔ اردگرد جن لوگوں کی زمینیں تھیں، وہ اکثر ہمارے دھڑے کے تھے۔ میں نے اُس سے کہا کہ کیوں نہ تم بھی ٹیوب ویل لگاؤ۔ بڑا حصہ تمہارا ہو گا۔ کچھ روپیہ بھا اسلم لگائے گا۔ اُسے میری یہ بات پسند آئی۔ ہم ڈسکے گئے اور انجن اور پائپ کی قیمت وغیرہ کا اندازہ لگایا۔ ابھی ہم نے کسی کارخانے والے سے بات نہیں کی تھی کہ اس کی بھنک چوہدری کے کان میں پڑ گئی۔ اس نے ایک آدمی کے ہاتھ میرے باپ کے پاس پیغام بھیجا کہ تالے والے دو کھیت عارضی طور پر لے لو اور اس کے بدلے میں ٹیوب ویل والا کھیت مجھے دے دو۔ میرے باپ نے یہ بات نہ مانی تو چوہدری نے ظاہر میں ہار مان لی۔ ہمارے شریک خود آ کر میرے باپ کو منا لے گئے اور دو فصلوں کے بعد کھیت کو پانی ملا، تو میرے باپ کے دل سے سارا غبار دُھل گیا۔

پر میرے دل میں ایک کانٹا سا کھٹکنے لگا۔

اُن دنوں ڈیزل انجن کا ٹیوب ویل لگانے پر پندرہ ہزار خرچ آتا تھا اور ابھی ہم گاؤں والے ہزاروں کے پھیر میں نہیں پڑے تھے۔ بھا اسلم کے پاس بھی نقد مال کم تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ لائل پور میں اپنی زمین چچا کو ٹھیکے پر دے کر دو تین ہزار روپیہ پیشگی لا سکتا ہے۔

لیکن ہماری یہ تجویز ابھی منڈھے نہیں چڑھی تھی کہ ایک دن منہ اندھیرے بھا کی دکان پر ایک تھانیدار اور پولیس کے دو سپاہی آن کھڑے ہوئے۔ پولیس کا آنا گاؤں والوں کے لئے کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ یہ خبر سارے گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا دکان پر پہنچا تو وہاں بہت سارے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بھا اسلم بھی انہیں میں کھڑا تھا۔

تھانیدار بولا "چوہدری محمد اسلم کون ہے؟"

"میں ہوں۔" بھا اسلم نے تھانیدار کے سامنے آ کر کہا۔

"ایک خُفیہ ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ تم سمگلنگ کا کاروبار کرتے ہو۔"

تھانیدار کے اس جملے سے گویا سارے گاؤں پر بجلی گر پڑی۔

"بولو۔۔۔ بولتے کیوں نہیں تم؟"

"ہمارے گاؤں میں سمگلنگ کا لفظ آج پہلی بار سنا گیا ہے تھانیدار صاحب!" میں نے کہا۔

"تم کون ہو؟"

"میرا نام عبدالرحمن ہے۔"

"لیکن میں تو بات اسلم سے کر رہا تھا۔ تم بیچ میں کیوں بولے؟ شاید تمہیں پتہ نہیں، میں قصائی تھانیدار مشہور ہوں۔ اب ملزم کی بجائے کسی اور نے زبان کھولی، تو میں اس کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔"

"ذرا ٹھہریئے تھانیدار جی! ملزم کون ہے؟" مجمع میں سے ایک آواز آئی۔ سب لوگوں کی گردنیں اُس طرف گھوم گئیں۔ یہ چوہدری شرف دین تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بہت گھبرایا ہوا ہو۔

اُس نے تھانیدار کے قریب آ کر کہا "خان صاحب! پہلے تو قاعدہ قانون کچھ اور تھا کہ گاؤں میں پولیس آتی تو نمبردار کو ضرور خبر کرتی۔"

"جب پولیس چھاپا مارنے آتی ہے تو اس قاعدہ قانون کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر چیز صیغہ ء راز میں رکھی جاتی ہے۔ لیکن تم کون ہو؟"

"میں اس گاؤں کا نمبردار شرف دین ہوں۔ اب تو خیر سفید پوشیاں اور ذیلداریاں ختم ہو چکی ہیں پر میں کبھی سفید پوش بھی تھا۔"

"چوہدری شرف دین! تم محمد اسلم کو جانتے ہو؟"

"جانتا ہوں۔ کیوں نہیں جانتا؟ یہ مہاجر لڑکا ہمارے گاؤں میں دکان کرتا ہے۔ بڑا شریف ہے۔ ہم نے شریف سمجھ کر اپنے ہی گاؤں کی ایک بیٹی بھی اس سے بیاہ دی ہے۔"

"چوہدری! پھر اس شریف آدمی کی کرتوت بھی دیکھو۔" تھانیدار کھلکھلا کر ہنسا اور اس نے ایک سپاہی سے کہا "اللہ داد! توڑو۔ دکان کا تالا۔"

سپاہی نے تالے پر ہاتھ ڈالا تو وہ اس طرح کھل گیا جیسے کسی نے اسے جادو کے زور سے کھول دیا ہو۔ نہ کھٹ کی آواز آئی، نہ اسے توڑنا مروڑنا پڑا۔ میں نے بھا کی طرف

دیکھا۔ ہماری نظریں ملیں تو بھا نے کہا "تالا تو بڑا مضبوط تھا۔ کیا پتا رات کو اچھی طرح سے بند نہ ہوا ہو۔"

"نہیں بھا! یہ بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"بعد میں بتاؤں گا بھا!"

میرے من میں شک کا اکھوا پھوٹا تو میں نے چوہدری کی طرف دیکھا۔ چوہدری اپنے خیال میں گم تھا لیکن ایک آڑتی ہوئی مسکراہٹ کو اس نے دانتوں میں بھینچ لیا تھا پر اپنے چہرے پر وہ اس چور مسکراہٹ کی چمک چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ ایک گھناؤنی چمک جیسے ایک مدت کے بعد اس کے دل کی کوئی شیطانی خواہش پوری ہو رہی ہو۔ "انتقام میں کتنی شیطانی لذت ہے۔" میں نے سوچا۔ تب غصے اور نفرت کی ایک لہر اٹھی اور یکایک میرا سینہ کرودھ کے زہر سے بھر گیا۔ میرے منہ کا مزہ کڑوا ہو گیا۔

تھانیدار نے کہا "چوہدری! اپنے دو تین معتبر آدمیوں سے کہو، وہ میرے ساتھ دکان میں داخل ہوں۔ میں مال برآمد کروں گا تو وہ عینی گواہ ہوں گے۔ اللہ داد ٹارچ جلاؤ۔"

جب گواہ کا لفظ لوگوں نے سنا تو وہ ایک ایک کر کے وہاں سے کھسکنے لگے۔ تھانیدار نے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا "خبردار! جو کوئی یہاں سے گیا۔ میں سب کے سامنے مال برآمد کروں گا۔"

اس وقت چوہدری نے بظاہر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "موج دین کہاں ہے؟"

"وہ کنوئیں پر ہو گا۔" کسی نے جواب دیا۔

"اُس کا یہاں موجود ہونا ضروری تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا تو۔۔۔"

"تو تیرے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی۔ اونچے طرّے والے!" ایک نسوانی آواز آئی۔ سب نے مڑ کر دیکھا۔ میں نے مڑے بغیر اسے آواز سے پہچان لیا تھا۔ تھانیدار نے کہا "بڑھیا! تو یہاں کیوں آئی؟"

"میں وہ بات کہنے آئی ہوں جو کسی اور کی زبان پر نہ آتی تھانیدارا۔"

"جا چلی جا ریشماں! تیرا مردوں میں کیا کام؟" چوہدری نے کہا۔

"تھانیدارا! اس کی باتوں میں نہ آنا۔ تو قانون کا رکھوالا بن کر آیا ہے نا۔ انصاف

سے کام لیتا۔"

"چپ رہ بڑھیا۔" تھانیدار نے گرج کر کہا۔

"ایسا لگتا ہے تیرا انصاف پہلے ہی بک چکا ہے۔" ماسی ریشم نے تھانیدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"بڑھیا! میرا ہاتھ عورت پر نہیں اٹھا کرتا لیکن یاد رکھ قانون مرد عورت میں کوئی رعایت نہیں برتتا۔"

"تو پھر لگا لے مجھے ہتھکڑی۔"

کچھ لوگوں نے بڑھ کر ریشم کو پکڑ لیا اور زبردستی ایک طرف کو لے گئے۔ اس نے کہا۔ "بے غیرتو! بے شرمو! چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے ایک بے گناہ کو ہتھکڑی لگے گی اور تم چپ چاپ تماشہ دیکھتے رہو گے۔ اونچے طرے والے! اس گاؤں میں کبھی کسی چور اچکے نے جنم نہیں لیا تھا۔ آج تو نے گاؤں کی عزت مٹی میں ملا دی ہے۔ یاد رکھ! تو اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جل کر راکھ نہ ہوا تو میرا نام بھی ریشم نہیں۔"

ماسی ریشم کی آواز دور گلی میں گم ہو گئی تو تھانیدار نے دکان سے مال برآمد کر لیا۔ ایک تھیلا الائچیوں کا، کچھ سپاریاں اور ایک دو تھان ریشمی کپڑے کے۔ تھانیدار نے کہا "ملزم کو ہتھکڑی لگا لو۔"

اس وقت میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا "تھانیدار جی! ہتھکڑی اس کلائی میں لگنی چاہیے۔ یہ سامان میں نے دکان میں رکھا تھا۔ بھا اسلم کو اس کا پتہ نہیں تھا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔"

تھانیدار نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ تم مجھے کیا دھوکا دو گے۔ "نمبردار جی! ضابطے کی کارروائی موقع پر ہو گی۔ ایک دو چارپائیاں یہاں بچھوا دو۔"

ضابطے کی کارروائی ہوئی۔ چوہدری اور اس کے ایک دو آدمیوں نے گواہ بن کر انگوٹھے لگائے اور چوہدری نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "آہ قانون کتنا ظالم ہے! میں اپنے ہاتھوں گاؤں کے ایک داماد کو مجرم بنانے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ لوگو تم گواہ رہنا۔ میں نے جھوٹی گواہی نہیں دی جو آنکھوں کے سامنے آیا ہو، اسے کون جھٹلا سکتا ہے۔ پر آج میں بہت دکھی ہوں۔"

عین اس پل چوہدری رحمت خان بھی وہاں آ گیا۔ اس نے کہا "چوہدری! تم نے جو

ناٹک کھیلنا تھا، کھیل لیا۔"

"چپ رہو چوہدری!" تھانیدار نے کہا۔

"خان صاحب! میں آپ سے بات نہیں کر رہا۔ مجھے اس فریبی سے ایک دو باتیں کہہ لینے دیجئے۔ اس نے وہ کام کیا ہے جو اس کے باپ دادا نے نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے منہ پر نہیں سارے گاؤں کے منہ پر کالک مل دی ہے۔"

"چوہدری رحمت خان! تم اس گاؤں کے سرکردہ آدمی ہو۔ تمہیں ملزم کی پشت پناہی نہیں کرنی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی موقع کے گواہ بنو۔"

"نہیں خان صاحب! میں موقعے پر موجود نہیں تھا۔ اگر کہیں تو میں ملزم کی صفائی میں کچھ کہوں۔"

"نہیں! یہ سب کچھ عدالت میں ہو گا۔"

"میں اس کی ضمانت دینے کو تیار ہوں۔"

"ضمانت بھی تو عدالت میں ہو گی۔ چوہدری! میرا بنایا ہوا مقدمہ لوہے کی لاٹھ ہوتا ہے۔ ملزم کو عدالت سے سزا مل کر رہے گی۔ اگر تم گواہ بن جاتے تو تمہیں بھی سرکار میں نیک نامی حاصل ہوتی۔"

"ساری نیک نامی اسی کے کھاتے میں ڈال دیجئے خان صاحب! جو آپ کو یہاں لے کر آیا۔ آپ اسے کیوں نہیں پکڑتے؟ اصل ملزم تو یہ ہے۔ اسے پوچھئے کہ رات کے اندھیرے میں اس کے ٹیوب ویل پر کس کس قسم کے لوگ آتے ہیں۔ مشتبہ، چور اچکے، منہ پر ٹھاٹھے باندھے ہوئے اور شہر میں اس کے کارندے کس کس دکاندار کے ہاں جاتے ہیں پر میں یونہی اپنا گلا پھاڑ رہا ہوں، پولیس کی نظروں سے کون سی بات چھپی ہوتی ہے؟"

"اگر یہ بات سچ ہے تو تم اخفائے جرم کے مرتکب ہو رہے ہو، چوہدری رحمت خان!" تھانیدار نے کہا۔

"پھر مجھے بھی ہتھکڑی لگا لو۔ ایک بے گناہ کے ساتھ ایک اور بھی شامل ہو جائے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔" رحمت خان نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔

"تم قانون کو للکار کر اپنی موت آپ مرنا چاہتے ہو؟" تھانیدار نے غصے میں آ کر کہا۔

"خان صاحب! یہ تو خواہ مخواہ لیڈر بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہتر ہے کہ اس کی باتوں میں نہ آیا جائے۔ آپ حاضر مقدمے میں ضابطے کی کاروائی مکمل کریں۔" چوہدری شرف دین نے ایک عرصے کے بعد چپ توڑی۔ "رحمت خان! تم اس طرح گاؤں کے لیڈر نہیں بن سکتے۔"

"لیڈر ویڈر کون بننا چاہتا ہے شرف دین! ہماری آپس کی دشمنیوں کا فیصلہ گاؤں میں ہو جاتا تو ہماری بدنامی نہ ہوتی۔ تم نے پولیس بلا کر گاؤں کی عزت کو بھرے بازار میں رسوا کرنے کی رسم ڈال دی ہے۔ اب پتا نہیں، اس کا کیا نتیجہ ہو؟"

"پلس کو میں نے بلوایا ہے رحمت خان؟" چوہدری شرف دین نے غصے میں آ کر پوچھا۔

"ہاں ! ہاں ! خان صاحب۔ رات کس کے ڈیرے پر رہے؟ اور دکان میں چوری کا مال کس نے رکھوایا؟"

"مجھے کیا معلوم؟ مجھے تو صبح صبح اس کا پتہ چلا۔"

"رحمت خان! میں ملزم کے ساتھ تمہیں بھی دھر لوں گا۔" تھانیدار نے کہا۔

"مرد لوگ اس سے نہیں ڈرتے خان صاحب! یہ بھی مرد ہے تو اس سے کہو بھری محفل میں سچ کہہ دے۔"

تھانیدار نے بحث ختم کرنے کے لئے جلد جلد کاغذ مکمل کیے اور اُن لوگوں کے نام لکھے جو مال کی برآمدگی کے وقت وہاں موجود تھے۔ پھر اُس نے بھا کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگائی۔ میرا خیال تھا میں اس موقعے پر رو پڑوں گا لیکن بھا اسلم کے چہرے کی پرسکون مسکراہٹ دیکھ کر میں نے آنسو روک لئے۔ اس نے لوگوں کی طرف ایک نظر دیکھ کر کہا "مجھے بڑا دکھ ہوا ہے کہ میری وجہ سے چک مراد کی بدنامی ہوئی۔"

"نہیں—— نہیں——" کئی لوگوں نے بیک آواز کہا۔

"آپ لوگوں کو میری بے گناہی کا یقین ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو گا۔"

"مہاجر لڑکے! بے گناہی کا فیصلہ عدالت میں ہو گا۔" چوہدری نے کہا اور سارے مجمعے پر ایک جلتی چبھتی نظر ڈالی۔

اس وقت تک پولیس کو شہر واپس پہنچانے کے لئے تانگہ آ چکا تھا۔ تھانیدار اور چوہدری اگلی سیٹ پر بیٹھے۔ پچھلی سیٹ پر دو سپاہیوں کے درمیان بھا اسلم کو بٹھایا گیا اور تانگہ دھول اڑاتا ہوا پکی سڑک کی طرف روانہ ہو گیا تو گاؤں کی عورتیں رونے لگیں۔ ماسی ریشم چوہدری کے اگلے پچھلوں کو توم رہی تھی اور عائشہ اور زینت کے آنسو بھی پونچھ رہی تھی۔ جب تانگہ نظروں سے اوجھل ہوا تو میرے دل پر دن کا اجالا بے چاند کی رات کا اندھیرا بن کر چھا گیا۔ چوہدری رحمت خان نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "مانے! غم نہ کرو۔ غم کرنے سے کیا بنے گا؟ چلو شہر چلیں۔ اسلم کی ضمانت کے لئے کوشش کریں۔"

جب تک بھا اسلم ضمانت پر رہا ہو کر گھر نہ آیا، ہم گاؤں والوں کا ایک قدم گاؤں میں اور دوسرا شہر میں رہا۔ اُن دنوں کے ایک ایک لمحے کو میں دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا۔ یہ زمانہ ایک گھنے جنگل کی مانند تھا جس میں مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ قانون کی بھول بھلیوں میں سے راستہ نکالنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ ایک کاغذ نہ جانے کن کن منزلوں سے گزرا اور ہر منزل پر اُسے نہ جانے کتنے روپوں کے پہیے لگانے پڑے۔ چوہدری رحمت خان نے اسی دن شام کو تھانیدار کی مٹھی گرم کر دی تھی جس کے نتیجے میں بھا اسلم کو حوالات میں کسی سختی یا تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا، اُسے کھانا بھی گھر کا ملتا رہا اور تھانیدار نے چالان بھی جلد تیار کر لیا۔ مقدمہ عدالت میں ابھی لگا بھی نہیں تھا کہ بھا کی ضمانت ہو گئی۔ جب گاؤں واپس آیا تو لوگ اُس کے استقبال کو دکان پر جمع تھے۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں والوں کی نگاہ میں اُس کی عزت پہلے سے بھی بڑھ گئی ہے۔

اس کے بعد مقدمہ چلا۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ہمارے وکیل نے کھلے تالے کے نکتے پر خوب بحث کی۔ اس بحث کے بعد مجھے یقین ہو چلا تھا کہ بھا اسلم باعزت طور پر بری ہو جائے گا۔ چوہدری کے آدمی جرح میں نہ ٹھہر سکے تھے۔ صفائی کے گواہوں کے بیان میں سرکاری وکیل کوئی رخنہ نہ ڈال سکا تھا۔ میں نے سوچا "سچ کی عمارت کو جھوٹ کے ہاتھ ہلا تو سکتے ہیں لیکن ڈھا نہیں سکتے۔"

لیکن جب مجسٹریٹ نے فیصلہ سنایا تو سچ کی عمارت دھڑام سے گر پڑی اور جھوٹ جیت گیا۔ میں سُن ہو کر رہ گیا جیسے طوفان کے ایک جھونکے نے میرے یقین کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا ہو۔ کوئی چیز بنیاد سے اُکھڑ جائے تو پھر اسے کون سنبھالا دے سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا

کوئی غم نہیں تھا کہ بھا اسلم کو ایک ہزار روپیہ جرمانہ اور تین ماہ کی قید کی سزا ہو گئی ہے
غم تو اس بات کا تھا کہ میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی۔ اب یہ جڑ نہیں سکتی اور اس وقت
دُنیا کی حقیقت میری نگاہوں کے سامنے یوں بدل گئی جیسے اس میں کوئی سورج نہ ہو، کوئی
چاند نہ ہو، بس گھُپ اندھیرا ہو۔ میں نے سوچا "جھُوٹ کتنی بڑی حقیقت ہے۔ سچ ایک
چھلاوہ ہے۔ میں ساری عمر فریب میں کیوں مبتلا رہا؟" اور میرا دل کرودھ اور کپٹ سے یوں
بھر گیا جیسے یہ کوُڑے کا ڈھیر ہو۔ ہم نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی لیکن ہماری اپیل بھی
خارج ہو گئی۔ ہم نے عائشہ اور زینت کے زیور بیچے اور بھا کا جرمانہ ادا کیا لیکن تین ماہ کی
قید کا ہم کوئی ازالہ نہ کر سکے۔ یہ تین مہینے میرے لئے تین سالوں کے برابر تھے۔

بھا اسلم جب جیل سے چھُوٹ کر آیا تو مجھے کیا وہ سب گاؤں والوں کو بدلا ہوا سا لگا۔
تبدیلی اس کے چہرے مہُرے پر نہیں آئی تھی، اس کا اثر اس کی آنکھوں میں تھا۔ اب میں
اس کیفیت کو کیسے بیان کروں۔ بھا اسلم جب چک مراد میں آیا تھا تو میں نے یہی کیفیت اس
کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ جلتی بجھُتی چمک جیسے اسے گرہن لگ گیا ہو۔ چک مراد نے
انہیں اعتماد بخشا تھا اور میں نے بھا کی آنکھوں میں دَھلی دھلی چاندنی کا نکھار آہستہ آہستہ
لوٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ کہتے ہیں آنکھوں میں روح کا عکس نظر آتا ہے۔ بھا کے معاملے میں
یہ قول کتنا سچ تھا! صاف سُتھری روح جس میں کوئی چھل کپٹ نہ تھا، مجھے ہمیشہ بھا کی
آنکھوں میں نظر آئی۔ آج ان آنکھوں کا اعتماد چکنا چوُر ہو چکا تھا۔ میں نے ان میں دُکھ بھی
دیکھا اور وہ بس بھرا کرودھ بھی جو زخمی سانپ کی آنکھ میں ہوتا ہے۔

گاؤں میں واپس آنے کے دو تین دن بعد بھا اسلم نے دکان کھولی تو تھڑے پر لوگوں
کی محفل لگ گئی۔ بھا ہر آدمی سے مسکرا مسکرا کر بولا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ مسکراہٹ
جَھوٹی ہے اور بھا کو اس مسکراہٹ کے لئے کتنی اذیت میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ میں ورکر
سے اخبار مانگ لایا تھا۔ میں نے اخبار پڑھ کر سنانا شروع کر دیا تھا تاکہ لوگوں کی توجہ اس
طرف رہے اور بھا کو کوئی ایسی بات نہ سننی پڑے جس سے اس کا دُکھ تازہ ہو۔ پر جوں جوں
لوگ جمع ہوتے گئے، گفتگو کا دھاگا میرے ہاتھ سے چھُوٹ چھُوٹ جاتا رہا۔ پھر میں نے سوچا
کہ میں کب تک اس کا سِرا تھامے رہوں گا۔ لوگوں کو باتیں کیوں نہ کرنے دوں تاکہ ان
کے دل کا غبار دُھل جائے۔ تب بھانت بھانت کی باتیں ہوئیں۔ لوگوں کی ہمدردیاں بھا کے

ساتھ تھیں۔ چوہدری کو بُرا بھلا کہا گیا۔

بابا حیات نے کہا "اسلم! تم ہماری نظروں میں اتنے ہی بے گناہ ہو، جتنے تم پہلے
تھے۔"

"بابا! تم ٹھیک کہتے ہو۔ پر میں تو اپنے آپ کو گنہگار سمجھتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" بابا حیات نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ بے گناہی جسے ثابت نہ کیا جا سکے، اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے بابا؟"

ماسی ریشم نے کہا "مہاجر لڑکے! میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ یہاں ہٹی نہ ڈالو۔"

"کہا تھا ماسی! پر تمہیں جس بات کا ڈر تھا وہ تو نہیں ہوئی۔"

"یہ تیری نیک ماں کے دودھ کا اثر ہے پر اب میں سوچتی ہوں، وہ بات ہو جاتی تو
اچھا تھا۔ میں سمجھتی کہ تمہارے اس گناہ کی سزا آج تمہیں مل گئی ہے اور اس سے میرے
دل کو تسلی ہو جاتی۔"

چوہدری رحمت خان نے کہا "ریشم کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟"

"نہیں تو۔" ماسی ریشم نے کہا "کچھ بھی نہیں۔"

ماسی ریشم کی رمز کو میں سمجھ چکا تھا پر میں خاموش رہا۔

بھا اسلم نے اپنے من کا دکھ کام کاج میں سمو دیا۔ مقدمے کے بعد ہمارے پاس نہ
زیور رہا تھا نہ نقد پیسہ۔ دکان میں جو نون تیل مرچ تھا، وہ دو چار دنوں میں بک گیا۔ بھا نے
چوہدری رحمت خان سے کچھ رقم ادھار لی اور دکان میں سامان بھرا۔ دکان پھر چل نکلی۔ اب
بھا نے دکان میں خیاری کا سامان اور کچھ کپڑا بھی رکھ لیا۔ شام کو اُس کے تھڑے پر پھر محفل
جمنے لگی، اخبار بھی آنے لگا۔ اس محفل میں کبھی کبھار ورکر نے بھی شریک ہونا شروع کر
دیا۔

انہیں دنوں ورکر نے اپنی لائبریری میں چند ناولوں کا اضافہ کیا تو میں ان پر پل پڑا۔
میں نے وہ کتابیں ہفتے عشرے میں پڑھ ڈالیں تو ورکر نے کہا "چوہدری عبدالرحمن! تمہارا
پیٹ بہت بڑا ہے اور مجھ میں اتنی توفیق نہیں کہ اس کو بھرنے کا سامان مہیا کر سکوں۔"

"جس کو بچپن میں ترسایا گیا ہو، اس کی آنکھ بھرتی ہے نہ پیٹ۔"

ورکر نے ہمارے دھڑے کی امداد سے وہ گلی پکی کر لی جو ہمارے گاؤں کی درمیان

میں سے گزرتی تھی اور دوسرے گاؤں والے لوگ اسی راستے سے پکی سڑک پر جاتے تھے۔
میں نے بھٹے سے رعائتی قیمت پر اینٹیں مہیا کیں۔ ہمارے اس کام کی بہت تعریف ہوئی لیکن
چوہدری کو ہمارا یہ کارنامہ ناگوار گزرا۔ اُس نے ورکر کو تبدیل کرانا چاہا لیکن ہم گاؤں کے
لوگوں کا ایک وفد لے کر اس کے بڑے افسر کے پاس پہنچے اور اس کا تبادلہ رکوا لیا۔
یہ چوہدری کی پہلی شکست تھی۔

انہیں دنوں ورکر کے دفتر میں ایک مدت بعد سلیمان سے ملاقات ہوئی۔ اسے آتے
دیکھ کر نجانے میں کیوں کتاب کے پیچھے چُھپ گیا۔

اس نے پوچھا "ماہنے! کتاب بہت دلچسپ ہے؟"

مجھے سلیمان کی یہ بے تکلفی ناگوار گزری۔ اپنے دل میں اس کیفیت پر مجھے تھوڑا سا
اچنبھا ضرور ہوا۔ بچپن سے لے کر لڑکپن کے آغاز تک ہم اکثر اکٹھے رہے تھے۔ یہ سچ ہے
کہ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے دوست نہیں بنے تھے لیکن وہ میری زندگی کی کتاب
کا ایک ورق تو ضرور تھا اور آج میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس ورق کو پھاڑ کر کتاب سے الگ کر
دوں۔

"میں جانتا ہوں' تم لوگ ہم سے ناراض ہو لیکن یا گاؤں کے نمبردار ہیں۔ قانون
کے مطابق وہ مجبور تھے کہ پولیس کا ساتھ دیتے۔"

میں نے کتاب زور سے بند کی تو ورکر نے کہا "چوہدری سلیمان! میں سب کے لئے
ساجھا ہوں۔ بہتر ہے کہ میرے دفتر میں اس موضوع پر بات نہ کی جائے۔"

"بہت اچھا! اگر ماہنا مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا تو میں اٹھ کر چلا جاتا ہوں۔"
سلیمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں! نہیں! چوہدری سلیمان! بیٹھئے اور ہاں! یہ تو بتایئے' یہ ماہنا کون ہے؟"
ورکر نے گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

"ماہنا! ۔۔۔ تھا ایک شخص ۔۔۔ میرا بچپن کا دوست ۔۔۔ اب وہ چوہدری عبدالرحمٰن
کے نام سے مشہور ہے۔" سلیمان نے اپنے لہجے میں مکھن جیسی چکناہٹ پیدا کرتے ہوئے
کہا۔ میں اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ کے پیچھے
کچھ چھپا ہوا نظر آیا جیسے کسی تیز دھار والے خنجر کی چمک۔

میں نے سوچا "اب مجھے خنجر کی اس دھار پر مسکرا مسکرا کر چلنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "ماہنا اُس وقت ماہنا تھا جب سلی ابھی چوہدری سلیمان نہیں بنا تھا۔"

"وہ کیا زمانہ تھا! ہم اکٹھے گل بہار کے پرائمری سکول کی پہلی جماعت میں داخل
ہوئے اور سیدپور سے ہم نے آٹھویں جماعت پاس کی۔ آج آپ جس مکان میں بیٹھے ہیں'
کبھی ہم اس کے آنگن میں کھیلتے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا ماہنے؟"

"یاد ہے لیکن اب راکھ کو کریدنے سے کیا ملے گا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ۔۔۔ لیکن اچھی یادیں دل کو خوشی نہیں بخشتیں؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے لئے ابھی منہ بھی نہیں کھولا تھا کہ اس
نے شیماں کا ذکر کر دیا۔ شیماں کے ساتھ بابا نتھو کا قصہ بیان ہوا۔ ریتھڑوں سے لے کر بلور
کی گولیوں تک بات پہنچی تھی کہ شیماں جوان ہو گئی اور کہانی کے اس موڑ پر سلیمان نے
کہا "شیماں پندرہ سولہ برس کی عمر میں گدرایا ہوا پھل تھی۔ ہم دونوں منہ کھولے انتظار
کر رہے تھے کہ دیکھئے یہ پھل کس کی جھولی میں گرتا ہے کہ ایک تیسرا آدمی پیچھے سے آیا
اور گاؤں نے پکا ہوا پھل اس کی جھولی میں ڈال دیا۔"

"وہ کون تھا؟" ورکر نے پوچھا۔

"ہماری چکّی پر کام کرنے والا مستری۔" سلیمان نے جواب دیا۔

"تو دونوں رانجھے منہ دیکھتے رہ گئے۔ کھیڑا ہیر کو ڈولی میں بٹھا کر لے گیا۔" ورکر نے
ہنس کر کہا۔

"میں تو رانجھا نہیں بننا چاہتا تھا پر ماہنے نے قدم قدم پر میرا راستہ روک لیا۔"

"پھر تو آپ دونوں ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ اب بتایئے! آپ میں سے سچا
عاشق کون تھا؟"

"میں تو اس قسم کا دعوے نہیں کر سکتا۔ ماہنے سے پوچھئے؟"

ورکر نے میری طرف متوجہ ہو کر کچھ مذاق کرنا چاہا تو میں نے کہا "سلی سچ کہتا ہے۔
سچا عاشق میں ہی تھا' پر اب میرا خیال ہے' یہ قصہ ختم ہو چکا ہے۔"

"نہیں ماہنے!" سلی نے کہا۔

"اب وہ دو بچوں کی ماں ہے سلیؔ۔ وہ آخر اس گاؤں کی بیٹی ہے۔ بہتر ہے کہ اس

کے متعلق اور کوئی بات نہ کی جائے۔"

"یار ماہئے! تیری اس بات نے ہمیشہ مجھے دکھ دیا۔ بات کرنے میں کیا حرج ہے؟"

تب سلیمان نے شہر میں اپنی اور مستری کی ملاقاتوں کی کہانی چھیڑ دی۔ پہلے پہلے مستری اس کا اپنے گھر میں آنا جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ہتھیار ڈال دیے اور سلیمان نے بتایا کہ اب وہ مستری کے ہاں اکثر آتا جاتا ہے اور شیماں اسے دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ اس نے کہا "ماہئے! مستری چرس پیتا ہے، جواء کھیلتا ہے اور دل لگا کر کام نہیں کرتا تو ایک کارخانے سے اسے جواب مل جاتا ہے اور وہ دوسرے کارخانے میں چلا جاتا ہے جب اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے، وہ میرے پاس آتا ہے۔ میں اس کی کچھ مدد کر دیتا ہوں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے چوہدری سلیمان۔" ورکر نے کہا۔

"پر اس سے یہ بھی پوچھئے کہ یہ اس کی کیا قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا پتہ ماہئے! میں نے اس کی قیمت وصول بھی کر لی ہو۔" سلیمان نے کہا۔

"تم جھوٹ کہتے ہو۔"

"نہیں!" سلیمان نے بڑے یقین سے کہا۔

"اس قصے کو چھوڑیئے۔" ورکر نے گھبرا کر کہا۔ "یہ بات اب حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ لڑ پڑیں گے۔"

"نہیں! کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میں آج اس مولوی کی جنت کو توڑ پھوڑ کر اسے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جہنم بھی موجود ہے اور کچھ لوگوں کو وہاں بھی جلنا چاہئے۔" سلیمان نے کہا۔

اسے خیال تھا کہ میں اس کی بات کا جواب آگ کے انگاروں سے دوں گا پر میں برف کی طرح سرد پڑ گیا۔

میں نے کہا "ورکر صاحب! اس کو پیٹ خالی کر لینے دیجئے۔ کہو چوہدری سلیمان!"

"تو سنو مولوی عبدالرحمٰن! اب شیماں وہ نہیں رہی جس کی تصویر تم اپنے سینے سے لگائے پھرتے ہو۔ وہ بالکل بدل گئی ہے۔ وہ اب شہرن ہے۔ کھلے گریبان کی قمیص پہنتی ہے

ذرا جھانک کر تو دیکھو وہ چیز بھی نظر آ جاتی ہے جس کو دیکھ کر تمہارے جیسے فرشتوں کی رال بھی ٹپک پڑے۔ بڑے من موہنے انداز میں مسکراتی ہے۔ مستری مجھے گھر لے جاتا ہے تو اس کے پاس چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ اب بتاؤ! میں مولوی تو نہیں کہ اس جہنم کی آگ سے بچا رہتا۔"

وہ رک گیا تو میں نے کہا "بس یا کچھ اور؟"

"نہیں! ہاں سنو۔ اس جہنم میں میں اکیلا نہیں۔ ایک دن میں مستری کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو گلی والے دروازے کو اندر سے بند پایا۔ مستری نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ساتھ کے گھروں کی عورتیں دروازوں میں آ کھڑی ہوئیں۔ ایک دو بڑی بوڑھیاں گلی میں نکل آئیں جیسے وہ کسی تماشے کی منتظر ہوں۔ دیر بعد دروازہ کھلا۔ دروازے میں ایک آدمی کھڑا تھا جسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ مستری نے کھیسیں نکال کر کہا۔ "جناب! آپ کہاں؟" اس نے جواب دیا "تمہاری تلاش میں یار! اچھے آدمی ہو۔ تمہاری وجہ سے کارخانہ بند رہتا ہے۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔" مستری نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ جلد کارخانے میں پہنچ جائے گا لیکن یہ نہ پوچھا کہ اندر سے دروازہ کیوں بند تھا۔ تب میں نے شیماں کو دیکھا۔ اس نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے سوچا، ایک کے بعد دوسرا۔ یہ مسکراہٹ کس قدر معصوم ہے! پر اس کے پیچھے کتنا بڑا دھوکا چھپا ہوا ہے جیسے یہ صرف میرے لئے ہو۔ میں اس دن مستری کے ساتھ ہی واپس چلا آیا۔ مجھے گلی محلے والوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ ایک بڑی بی نے ہمارا رستہ روک کر کہا "مستری! تو نے گھر میں چکلا کھول رکھا ہے کیا؟ جانتے نہیں ہو۔ یہ شریفوں کا محلہ ہے۔" مستری نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "نہیں تو۔۔۔ نہیں تو۔۔۔" اور ماہئے! اب مستری اپنے کارخانہ دار کی کوٹھی کے کوارٹر میں اٹھ آیا ہے۔ شیماں اب اس کے گھر میں کام کاج کرتی ہے۔"

اس وقت میں نے سوچا "سلی سچ کہہ رہا ہے۔"

میں نے کہا "چوہدری سلیمان! تم نے یہ قصہ مجھے کیوں سنایا؟"

"میں نے سوچا تھا کہ گلوں کی اس بیٹی کی کہانی سن کر تمہیں خوشی ہو گی۔"

"اس میں خوشی کی کون سی بات ہے چوہدری سلیمان؟ حالات نے ایک سیدھی سادی لڑکی کو خراب کر دیا ہے۔ ہمیں تو اس کہانی پر آنسو بہانے چاہئیں۔" ورکر نے کہا۔

"لیکن میں تم لوگوں کے ساتھ آنسو بہانے کو تیار نہیں ہوں۔ مجھے تو اس کے چال چلن پر پہلے ہی شبہ تھا۔ ہم نے اُسے اور مستری کو جس حالت میں گاؤں سے نکالا تھا' وہ مجھے نہیں بھول سکتی۔ اُس نے میرا حق دوسرے کو دے دیا تھا۔"

"کس کو؟ میں نے پوچھا۔

"مستری کو۔"

"تمہیں اس کا یقین ہے ؟"

سلیمان نے میری طرف حیران ہو کر دیکھا۔ پھر اس نے ہنس کر کہا "یقیناً منشی عبدالرحمٰن! وہ تم نہیں تھے۔"

"ہاں! وہ میں نہیں تھا۔ وہ مستری بھی نہیں تھا۔ پھر وہ کون تھا؟ یہ گتھک کون کھولے گا؟"

سلیمان نے ورکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا "آپ ماہنے کی بات سمجھے؟"

ورکر نے بیزار ہو کر کہا "چوہدری سلیمان! اس گاؤں میں میری جو پوزیشن ہے' وہ ایک باہر کے آدمی کی ہے۔ مجھے آپ کی گھریلو باتوں میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟ میں اس راز کو نہیں جاننا چاہتا۔ آیئے! آپ خبریں سنیں۔"

اُس نے ٹرانسسٹر آن کر دیا۔ اُس دن کسی وزارت کے بدلنے کی خبر آئی۔ وزارتیں آئے دن بدلتی تھیں۔ یہ تبدیلی کراچی میں آتی یا لاہور میں' اس کی گونج ہمارے گاؤں تک نہیں پہنچتی تھی۔ ہمیں تو اپنے علاقے کے ممبر سے بھی ملنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ البتہ ہمیں ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر سے کبھی کبھار سابقہ پڑتا تھا۔ وہ چوہدری شرف دین کا سمدھی تھا' سیدپور کا سابق ذیلدار۔ اُس نے ہمارے گاؤں میں پرائمری سکول کھلوایا تھا۔ جماعتیں تکیے میں بڑ کے درخت کے نیچے لگتی تھیں۔ ابھی تک سکول کے لئے ایک کمرہ بھی تعمیر نہیں ہوا تھا اور ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ شہر سے سیدپور تک جانے والی سڑک پر دو رویہ شیشم کے پرانے درخت کاٹے جا رہے ہیں اور کئی میل کا ٹھیکا ذیلدار کو ملا ہے اور اس میں سفیدپوش کا حصہ بھی ہے۔ لوگ کہہ رہے تھے "سڑکوں پر درخت اس لئے لگائے جاتے تھے کہ مسافروں کو ان کے سائے میں سستانے کا موقع مل سکے۔"

میں ورکر کے پاس سے اٹھ کر آیا تو میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ شیماں کے

آنگن کے پاس سے گزرتے ہوئے کسی یاد نے میرا دامن نہ پکڑا۔ نہ میرے سینے میں آگ دہکی' نہ ہونٹوں سے کوئی ہُوک نکلی۔ جب میں ٹیڑھی بینکی گلیوں میں سے گزر رہا تھا تو ایک آواز میرے کان میں آئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ یہ آواز میرے اندر سے جاگی تھی۔ یوں لگا جیسے صدیوں پہلے یہی آواز میرے ہونٹوں پر آ کر ٹوٹ گئی تھی۔ ایک بے نام سی آواز' بے لفظ آواز۔

"ہر آواز لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔" میں نے سوچا۔

"پر یہ آواز میرے ہونٹوں پر آ جاتی تو کیا ہوتا؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں نے نہیں جانتا۔"

"دل دریا سمندروں ڈُونگے' کون دلاں دیاں جانے ہو۔"

"ہاں دلوں کے پاتال تک کون پہنچ سکتا ہے؟ تم سچ کہتے ہو۔"

"آج تم نے اپنے کانوں سے جو کچھ سنا' اسے کس سمندر میں ڈبو دیا تو نے؟"

"اپنے ہی دل دریا میں۔"

"چلو اچھا ہوا۔" میرے سائے نے مجھ سے جدا ہوتے ہوئے کہا۔

اُس وقت میں اپنے کنویں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کے دونوں طرف ساون کی بارش سے ہری بھری ہونے والی فصلیں کھڑی تھیں اور ہوا بند تھی اور کوئی پودا نہیں سرسرا رہا تھا۔ شام کے وقت اتنی خاموشی! کاش کوئی جھونکا آئے! کوئی پودا سرسرائے! نہیں تو میں اس اتھاہ خاموشی میں ڈوب جاؤں گا۔ یہ خاموشی مجھے نگل لے گی۔ تب کماد کے ایک کھیت سے ایک ننھی سی چڑیا پھُر سے اڑی اور ذرا بھر کو چہچہائی تو اوس کا ایک قطرہ میرے دل دریا میں ٹپک گیا۔

انہیں دنوں گاؤں میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ مستری پٹے کی لپیٹ میں آ گیا ہے اور اس کا دایاں بازو کٹ گیا ہے اور اُس کی ٹانگیں جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی ہیں۔ یہ خبر سلیمان شہر سے لایا تھا۔ اس خبر پر گاؤں میں ہمدردی کی ایک ننھی سی لہر اٹھی۔ "نخو خرا بے کی پوتی کا اب کیا بنے گا؟" اور یہ لہر گاؤں کی فضا میں کوئی طوفان نہ اٹھا سکی۔ ایک دو آدمیوں نے اظہار افسوس کیا۔ دکان کے تھڑے پر اس پر جو تبصرہ ہوا' وہ ایک دو فقروں سے آگے نہ بڑھا۔

"سنا ہے مستری نشہ کرتا تھا۔ نشے میں انجن چلایا ہو گا۔ چینک آئی تو پٹے کی لپیٹ میں آگیا۔"

"ایسے لوگوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔"

"اب وہ کوئی کام کاج نہیں کر سکے گا تو اس کے بال بچوں کا کیا بنے گا؟"

"اللہ رازق ہے' جس نے پیدا کیا ہے' وہ کھانے کو بھی دے گا۔"

قحط پڑیں' فصلیں سوکھ جائیں' برکھا نہ لگے' کوئی فاقوں مرتا ہو' ہم گاؤں والوں کے پاس ہر مصیبت ٹالنے کا ایک ہی نسخہ تھا "اللہ رازق ہے۔" مجھے اس فقرے سے بے دردی کی بو آئی لیکن میں خاموش رہا۔ میں نے اپنے دل میں جھانکا تو مجھے وہاں ہمدردی کا ایک ذرہ بھی نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا "یہ دل بھی عجیب چیز ہے' کبھی موم سے زیادہ نرم ہو جاتا ہے اور کبھی سیسے کا ٹکڑا بن جاتا ہے کہ اس پر کوئی ضرب لگے' تو آواز بھی نہیں آتی۔" گاؤں میں سے کوئی بھی مستری کی خبر کو شہر نہ گیا۔ تب ایک دن جب میں بھٹے پر کام کی نگرانی کر رہا تھا تو میں نے گاؤں کی طرف سے ماسی ریشم کو آتے دیکھا تھا۔ اُس کے سر پر ایک گٹھڑی تھی۔ میں فوراً" سمجھ گیا کہ ماسی کہاں جا رہی ہے۔ میں اُسے دیکھ کر اینٹوں کی ایک دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔ ماسی ریشم پکی سڑک پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد سیدپور کی طرف سے ایک یکہ آیا اور وہ اس میں سوار ہو گئی۔ میں نے اس کے جانے کے بعد صافے سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور اپنے کام کاج میں لگ گیا۔

ماسی ریشم کے گاؤں لوٹنے پر بھی میں اُس سے ملنے سے بچتا رہا۔ نجانے کیوں میرا جی کہہ رہا تھا کہ میں اُس سے آنکھیں نہ ملا سکوں گا۔ پھر گلی کے ایک موڑ پر اُس سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ اُس نے پوچھا "ماجے! تو اسی گاؤں میں کہیں چھپا رہا؟"

"نہیں تو ماسی! میں کیوں چھپتا؟"

"جب بھی تو جھوٹ بولتا ہے' میں اسے تیرے منہ پر دے مارتی ہوں پر آج میں ایسا نہیں کروں گی۔"

"آج میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

"اچھا! نہیں . . . . کہتی ہوں' بولا ہے' میں شہر گئی تھی۔ تجھے پتہ ہے؟"

"ہاں!"

"بیچاری لڑکی بہت مصیبت میں ہے۔ مستری ہسپتال میں ہے۔ اُس کا ایک بازو ــــ"

"مجھے پتہ ہے ماسی!" میں اپنے لہجے کی کند آواز پر خود بھی حیران ہوا۔

"تجھے پتہ ہے؟ تجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔"

"میں کچھ بھی نہیں جاننا چاہتا ماسی!" میں نے قدم بڑھا لئے اور یہ بھی مڑ کر نہ دیکھا کہ ماسی کی کیا حالت ہے۔ میں نے سوچا "گزرتے ہوئے وقت کے کچھ پل بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ وہ مر مر کر جیتے ہیں۔ آج میں نے ان کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اب ان کی راکھ سے کوئی چنگا نیا جنم نہیں لے گا۔"

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۱۶

○

میرا خیال تھا کہ اب اپنے گاؤں کی کہانی میں کسی اور فرد کا اضافہ نہیں کروں گا لیکن میرا خیال غلط نکلا کیونکہ زندگی ایک بہتا دریا ہے۔ لہروں کا ایک سلسلہ ہے کہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ ایک لہر اٹھتی ہے اور سطح پر ذرا سی مچل کر پھر بہتے دریا کی روانی میں گم ہو جاتی ہے۔ یہی حال کہانی کا ہے، کیونکہ کہانی زندگی ہے۔ ایک پیچ کھلتا ہے تو کوئی دوسری گنجلک پڑ جاتی ہے۔ اس طرح گرہ پر گرہ لگتی چلی جاتی ہے۔

ایک گرہ کا نام سیداں ہے۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے جوان ہوئی۔ جوانی کسی پر آئے آخر جوانی ہوتی ہے پر اس کی جوانی زندگی کی سطح پر مچلنے والی ایک لہر تھی۔ شوخ اور چلبلی۔ وہ چھریرے قد کی لڑکی تھی اور اس کے بدن میں بڑی پھرتی تھی۔ جب چلتی تو یوں لگتا جیسے کوئی نٹنی دو بانسوں کے ساتھ تنی ہوئی رسی پر ناچ کر رہی ہو۔

گاؤں کے نوجوان لڑکوں نے اس کا نام بجلی رکھ دیا تھا اور وہ منتظر تھے کہ دیکھئے یہ بجلی کس پر گرتی ہے۔ میں نے اسے کئی بار اپنے پاس سے "شُر" سے نکل جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ سامنے نظر آتی اور دوسرے لمحے لہرا کر پاس سے گزر جاتی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی بلکہ اس کے پتلے پتلے لبوترے سے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے دنوں سے کچھ نہ کھایا ہو۔ اتنا بھوکا چہرہ کہ اسے دیکھ کر دل میں نہیں انتڑیوں میں آگ لگ جاتی۔ ہو سکتا ہے، یہ میری آنکھ کا قصور ہو کیونکہ میں اس کی جوانی سے کئی سالوں کے فاصلے پر کھڑا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

اور دوسری گرہ کا نام شیناں ہے۔ وہ ایک گول مٹول سی لڑکی تھی۔ موٹے موٹے دیدے، پھولے پھولے گال۔ بات بات پر کھل پڑتی۔ یوں لگتا جیسے کاگ اڑ گیا ہو اور سوڈے کی بوتل پھر پھر ہنس پڑی ہو۔ اس کا قہقہہ مجھے تو کبھی اچھا نہ لگا۔ مجھے اس میں اُس کا بچپن

نظر آتا کہ جوان ہو کر بھی وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ گویا اس کے دودھ کے دانت ابھی نہ ٹوٹے ہوں۔ میں سوچتا "اس کے پھولے پھولے بالوں کے نیچے جو سر ہے، اس میں بھیجا نہیں۔" لوگ کہتے "یہ اللہ میاں کی گائے جانے کیا کھاتی ہے کہ ایک رات کے بعد دیکھو تو صبح اس کے بدن پر چربی کی ایک نئی تہہ نظر آتی ہے۔"

گاؤں کے نوجوان اسے شیناں ڈھولک کہتے۔

ان دونوں میں سے کسی ایک سے جب اچانک آمنا سامنا ہوتا تو میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹک جاتا۔ سیداں مجھ پر ایک نظر ڈال چھلاوہ بن جاتی اور شیناں ایک ایسا بے سُرا قہقہہ لگاتی جیسے کسی ڈھیلی ڈھالی ڈھولک پر وجب سے تھاپ لگی ہو۔ تب میرے دل میں ایک انجانا خوف کوڑیالے سانپ کی طرح لہراتا۔ "ایسی لڑکیاں گاؤں کے لئے بدنامی کا باعث بن سکتی ہیں۔ یہ اپنا برا بھلا نہیں سوچ سکتیں۔"

"عبدالرحمٰن! تم ٹھیک سوچتے ہو۔ مصیبت تو یہ ہے کہ یہ اپنے ہی کنبے برادری کی بیٹیاں ہیں۔ ان سے پہلے شیماں نے جو گل کھلایا تھا، اس میں ہماری اتنی بدنامی نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ کہیں کمیرے کی بیٹی تھی۔" چوہدری رحمت خان نے کہا۔

"وہ بھی تو اسی گاؤں کی بیٹی تھی۔" میں نے کہا۔

"تھی! کیوں نہیں تھی؟ پر ذات برادری کا فرق تو ہوتا ہے۔"

"عزت جاٹ کی ہو یا کسی لوہار بڑھئی کی، وہ گاؤں کی عزت نہیں چوہدری۔"

میری آواز میں غصے کی چمک تھی۔

بھا اسلم نے کہا "ماجھے! بے شک پڑھا لکھا آدمی بہت دُور کی سوچتا ہے پر تُو نے ساری دنیا کا دکھ اپنے سینے میں سمو لیا ہے۔ تمہارے جیسے لوگ اپنی ہی آگ میں بھسم ہو جاتے ہیں۔ جو ہو گا تم اس کے آگے بند تو نہیں باندھ سکتے؟"

میں نے بھا اسلم کی طرف دکھ بھری نگاہوں سے دیکھا تو وہ مسکرانے لگا۔ میں نے سوچا "رشتوں کے بدل جانے کے بعد بھی سارے گاؤں میں وہی میرا محرم راز ہے۔"

کہانی کے اس موڑ پر میں بھٹے کے پاس کھڑا پتھیروں کے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ پکی سڑک سے ایک تانگہ گاؤں جانے والی چھوٹی سڑک پر مڑا تو وہ میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ پکی سڑک پر سے تانگے اور یکے گزرتے رہتے تھے لیکن ہمارے گاؤں کی طرف کبھی

کبھار کوئی تانگہ جاتا تھا۔ یہ تانگہ شہری سا نظر آ رہا تھا' بڑا ہلکا پھلکا بانکا سا۔ گاؤں کے تانگے بے ہنگم اور بے ڈول ہوتے ہیں۔ اس کی پچھلی سیٹ پر ایک بُرقعہ پوش عورت دو بچوں کو لئے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں ایک بڑے ٹرنک پر ٹکے ہوئے تھے۔ اگلی سیٹ پر ایک مرد تھا اور دو تین بڑے بڑے گٹھڑ ہودے میں ٹھُنسے ہوئے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ابھی تک بُرقعے کا رواج نہیں ہوا تھا حتیٰ کہ چوہدری کے گھر کی عورتیں بھی بُرقعہ نہیں پہنتی تھیں۔ بُرقعہ پوش عورت نے چہرے سے نقاب اٹھا رکھا تھا۔ کالے برقعے میں دَور سے جو چہرہ نظر آتا ہے وہ بہت گورا معلوم ہوتا ہے۔ تاہم میں برقعے والی کے نقش نقوش کو صاف صاف نہ دیکھ سکا اس لئے اسے پہچان بھی نہ سکا۔

تانگہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو میں اپنے کام کاج میں لگ گیا۔ پر مجھے جب ذرا سی بھی فرصت ملتی تو میں سوچتا "یہ لوگ کون ہیں؟" میرے دل میں دُکدگی سی لگی رہی۔ دوپہر کو گھر سے میرا کھانا آیا۔ میں عبدالغفار سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تانگے کا ماجرا کیا ہے پر پتہ نہیں کیا وجہ ہے' میں بار بار پوچھنا چاہتا لیکن پوچھ نہ پاتا۔

آخر عبدالغفار نے کہا "بھا ایک خبر سنی تم نے؟"

"نہیں تو۔" میں نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تھوڑا عرصہ پہلے ایک تانگہ یہاں سے نہیں گزرا تھا؟"

"گزرا تو تھا۔"

"تجھے نہیں پتہ اس میں کون تھا؟"

"نہیں۔"

"اچھا! گاؤں کے لوگ تو بڑے حیران ہیں۔ چوہدری کی چکی پر کبھی جو مستری کام کرتا تھا نا۔۔۔"

یکایک لقمہ میرے گلے میں پھنس گیا۔ عبدالغفار نے لسی کا پیالہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے ایک گھونٹ بھرا تو لقمہ گلے سے اتر گیا۔ پھر میرا جی نہ چاہا کہ دوسرا لقمہ توڑ کر منہ میں رکھوں۔ میں نے کھانے سے ہاتھ روک لیا تو عبدالغفار نے پوچھا "بس اتنا ہی کھاؤ گے بھا؟"

"ہاں! مجھے بھوک نہیں ہے۔"

عبدالغفار حیران ہو کر کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ میں نے اُسے باتوں میں لگا لیا۔ وہ ان دنوں ساتویں جماعت میں ترقی پا چکا تھا۔ وہ بھی میری طرح کتاب کا رسیا تھا۔ میں نے اُس سے پڑھائی کی بات شروع کی تو وہ کتاب کے ذکر اذکار میں کھو گیا اور ہم دونوں بھائی گاؤں میں آئے ہوئے مہمانوں کو بھول گئے۔ عبدالغفار نے جھونپڑی سے ایک چارپائی نکالی اور کچی سڑک کے کنارے شیشم کے اک درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔ میں جھونپڑی کے اندر بیٹھا رہا۔ نیند نہ آئی تو میں باہر نکل گیا۔ دور دور تک گندم کے کھیت تھے جن پر سنہری رنگ آ رہا تھا۔ درختوں پر سبز پتوں کی بہار ابھی باقی تھی۔ ابھی شیشم کے درختوں سے بور جھڑ رہا تھا اور کچی سڑک کی طرف سے ہوا کا کوئی جھونکا آتا تو وہ اپنے ساتھ مدھم میٹھی خوشبو کا ایک سانس بھی لاتا۔ پھاگن چیت کی دھوپ میں دوپہر کو ذرا سی چمک آتی ہے جیسے اس کے ماتھے پر پسینے کی ایک بوند لرز گئی ہو لیکن سورج جونہی ڈھلتا ہے' آسمان سے ایک نرم نرم نیلاہٹ زمین پر اتر آتی ہے اور دُور شمال کی طرف نیلم کی دیواروں پر برف کی سفیدی ابھرتی ہے تو ہوا ٹھنڈے سانس بھرنے لگتی ہے۔ آج مدتوں بعد میں پھاگن چیت کی اس کیفیت سے سرشار ہوا تو مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔

گاؤں کی کھلی فضا میں کسان کو موسم کی تبدیلی اُس وقت محسوس ہوتی ہے' جب اُس نے کوئی نئی فصل بوئی ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہر فصل پر زندگی نیا جنم لیتی ہے یا یہ کہ وہ خود موسم کا ایک حصہ ہوتا ہے اور جو چیز وجود کا حصہ ہو' اسے اُس سے الگ کر کے کیسے دیکھا جا سکتا ہے۔ آج سہ پہر کی نرم نرم دھوپ میں بدلتے رنگوں کی ایک مدھم سی دھنک میری آنکھوں کے سامنے لہرائی تو میں نے سوچا "ایسا کیوں ہوا۔ اب تو بہار کا رنگ دھیما پڑ چکا ہے اور خوشبو کے سانس ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی مانند آخری لو دے کر بجھنے والے ہیں۔" میری آنکھوں کے سامنے جنگلی گنے کے سنہری دھبے لہرائے اور خود رو السی کے پھول جو ناک میں ڈالنے والی نِبک تیلیوں کی مانند ہوتے ہیں پر ان کا رنگ نہ نقرئی ہوتا ہے' نہ سنہری۔ گہرا نیلا رنگ' ننھے ننھے نقطے۔ انہیں میں نے ہر صبح پگڈنڈی کے دونوں طرف اوس کی نمی میں دھل کر تر و تازہ دیکھا تھا اور جہاں کہیں گھاس کا ننھا سا قطعہ نظر آیا' وہاں کبھی کبھار سفید اور گلابی پھولوں کی ایک چادر سی بچھی ہوئی بھی دیکھی تھی۔

آج رنگ اور خوشبو کے یہ چھینٹے تصویر سے الگ ہوئے تو میں حیران رہ گیا' حالانکہ

عبدالغفار کی زبانی گاؤں میں آئے ہوئے مہمانوں کی خبر سن کر میں بے کل سا بھی ہو گیا تھا۔ آدمی کی طبیعت بھی عجیب نٹ کھٹ ہے۔ مجھے شیماں کے دوبارہ گاؤں میں آنے سے وحشت بھی تھی اور عجیب سی خوشی بھی لیکن میں اُس شام تھڑے کی محفل میں شریک نہ ہوا، نہ ورکر کی لائبریری میں کوئی رسالہ کتاب دیکھنے کو گیا۔ میں بھا اسلم سے بھی نہیں ملنا چاہتا تھا جیسے میں اپنے دل کے جذبوں میں کسی کو ساجھی نہ بنانا چاہتا ہوں لیکن بھا کی دکان میں لالٹین جل رہی تھی اور رات کے اندھیرے میں اُس کی مدھم سی روشنی کا ہالہ میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ میں ایک پل کو رکا۔ دوسرا پل اُڑنے کے لئے پر تول رہا تھا کہ بھا نے میرا نام پکار کر مجھے اس کا پابند بنا دیا۔

"آج بھتے سے آنے میں دیر کر دی؟"

"ہاں بھا! اینٹوں کی پکائی شروع ہونے والی ہے۔ کام زیادہ ہے۔"

"آج کی تازہ خبر سنی؟"

"ہاں بھا!"

"دکان کے سامنے جب تانگہ رکا تو سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ سہ پہر کی محفل میں طرح طرح کی باتیں ہوئیں۔ مانے! مستری تو بالکل ناکارہ ہو گیا ہے۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلتا ہے اور یوں بھی اس کے حواس ٹھکانے نہیں۔"

"بھا! وہ نشہ کرتا ہے۔ وہ گاؤں میں کس کے ہاں ٹھہرے ہیں؟"

"ماسی ریشم کے ہاں۔ لوگوں کا خیال ہے، ماسی ہی نے اُنہیں گاؤں میں بلایا ہے۔"

"بھا! میں اب گھر جاتا ہوں۔ آج میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

بھا نے مجھے نہ روکا۔ گلی میں اندھیرا تھا اور تنہائی بھی۔ مجھے گاؤں کا اور کوئی آدمی رستے میں نہ ملا۔ گھر پہنچا تو ماں اور زینت نے بھی شیماں کے اچانک آنے پر حیرت کا اظہار کیا۔ ماں نے کہا "یہ ریشو بھی عجیب عورت ہے۔ نجانے انہیں شہر سے گاؤں میں کیوں لے آئی، تم دیکھنا مانے! کوئی نیا فتنہ اُٹھے گا اور ریشو کا چٹا چونڈا بھری پنچائت میں مونڈھا نہ گیا تو مجھے کہنا۔"

"نہیں ماں! کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

لوگوں کا خیال تھا کہ مستری اور شیماں کچھ دن گاؤں میں رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔ جب دس پندرہ دن کے بعد بھی وہ واپس شہر نہ گئے تو گاؤں میں ڈر اور غصے کی ایک لہر اٹھی۔ جب چوہدری نے یہ دیکھا تو وہ ماسی ریشم کے گھر گیا۔ وہ ابھی کچھ بولا نہ تھا کہ ماسی پھٹ پڑی "او نیچے طرے والے! تو انہیں پھر دیس نکالا دینے آ گیا ہے؟"

"ریشم بی بی اے! کبھی تو عقل کی بات کیا کرو۔ میں کون ہوتا ہوں کسی کو دیس نکالا دینے والا؟ پر یہ تو سوچ مستری بے چارہ بے کار ہو چکا ہے اور گاؤں میں اُسے کون سا کام مل سکتا ہے۔ اس کے بال بچوں کا پیٹ کون بھرے گا؟"

"تو اس کی فکر نہ کر۔ میں تیرے پاس مانگنے نہیں آؤں گی۔"

ماسی ریشم سے جس نے بھی بات کی، اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ بابا حیات اور چوہدری رحمت خان کو بھی ٹکا سا جواب ملا۔

بھا اسلم سے اس نے کہا "مہاجر لڑکے! میں تیری بڑی عزت کرتی ہوں۔ تو کچھ نہ کہنا۔"

میں نے بھی منہ بند رکھا۔ تب ایک دن ماسی بھٹے پر میرے پاس پہنچی۔ اُس نے کہا "موج دین کے بیٹے! سارا گاؤں میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ جس کے منہ میں جو کچھ آیا ہے، اُس نے کہا ہے پر تو نہیں بولا۔ مجھے تجھ سے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ماسی! مجھ سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سنا ہے پنچائت بیٹھنے والی ہے۔ کہو تو اُس میں بھی نہ بولوں۔"

"ٹھیک ہے کچھ نہ کہنا۔"

تب نہ جانے مجھے کیوں غصہ آ گیا۔ ایک بھبھوکا سا جیسے سارے گاؤں میں آگ لگ ہو۔ میں نے کہا "میں پنچائت میں تو نہیں بولوں گا لیکن آج اپنے جی کا غبار نہ نکال سکا ماسی! تو میں اپنے غصے کی آگ میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔"

"جو تمہارے جی میں آئے کہہ لے، موج دین کے بیٹے!"

"تو سنو ماسی! تم نے بہت برا کیا۔ تم نے اپنے لئے ہی نہیں، ان کے لئے بھی کانٹے بوئے ہیں جنہیں تم نے اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔ گاؤں والے انہیں کبھی قبول نہیں کریں گے۔ جس جڑی بوٹی کو ہم کھیت سے تلائی کر کے نکال دیتے ہیں، کبھی تم نے سنا ہے کہ اسے پھر کھیت میں لگا دیا جاتا ہو؟"

"نہیں!" ماسی بولی۔

"تم نے ایسا ہی کیا ہے۔ اب کھیت میں کنڈیاری اگے گی اور ماسی! تم بہت جلد دیکھ لو گی کہ لہلہاتا کھیت سوکھ گیا ہے۔ جاؤ! میں پھر بھی پنچائت میں منہ بند رکھوں گی۔"

ماسی کچھ دیر بٹ بٹ میرا منہ تکتی رہی' پھر اس کا اوپر کا ہونٹ پھڑکا اور اس پر اُگے ہوئے سفید بال تھرتھرائے۔ اُس نے کہا "ماہنے! بیچاری لڑکی شہر میں رہتی تو کیا پتہ بُری راہ پر چل نکلتی۔ مستری لولا لنجا ہو کر بالکل ناکارہ ہو گیا ہے۔ وہ نشہ بھی کرتا ہے۔ بھوک اور بے کاری سے بڑھ کر بڑا شیطان کون ہو سکتا ہے؟"

"ماسی وہ تو بری راہ پر چل نکلی ہے۔ تجھے بڑی دیر بعد اس کا خیال آیا۔"

"نہیں! یہ سچ نہیں۔"

"یہ سچ ہے۔"

"تجھے کس نے بتایا۔"

"سلیمان نے۔"

"سانپ کا بیٹا سنپولیا ہوتا ہے۔ تو نے اُس کی بات پر یقین کر لیا؟"

"ہاں! زندگی میں پہلی بار مجھے اُس کی کوئی بات سچی معلوم ہوئی۔"

"نہیں! اس نے لڑکی کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹ بولا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی' وہ اس کے گھر آتا ہے اور اس پر ڈورے ڈالتا ہے۔"

"مستری اُسے خود گھر لے جاتا رہا ماسی؟--- وہ کارخانے کا مالک بھی---"

"وہ تو بڑا اچھا آدمی ہے ماہنے! مستری جب پٹے میں آ کر زخمی ہوا' تو اس نے سارا خرچ اٹھایا۔ اس نے بچوں کو بھوکوں نہ مرنے دیا۔ وہ اب تک مستری کو مدد امداد دے رہا ہے۔"

میں ماسی کے بھولپن پر مسکرانے لگا تو وہ سمجھی جیسے میں نے اُس کی بات کو سچ مان لیا ہو۔ وہ جواب میں مسکرائی تو میں نے کہا "اس اچھے آدمی سے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا کہ وہ اپنی نیکی کی کون سی قیمت وصول کر رہا ہے؟"

ماسی کچھ عرصہ میرا منہ دیکھتی رہی۔ وہ میری بات کو سمجھ نہ سکی تھی۔ تب جب اسے میری بات کی سمجھ آئی تو اس نے جھرجھری سی لی اور کہا "اس سانپ کے بچے نے

تیرے دل میں زہر بھر دیا ہے--- نہیں ماہنے!--- یہ عیب نہیں--- تو ہر بات پر شک کرنے لگا ہے۔"

"کاش یہ شک ہی ہوتا!" میں نے ماسی سے نظریں چرا کر کہا۔

ماسی کچھ دیر گم سُم رہی۔ تب اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "جو یہ سچ ہے' تو بھی اچھا ہوا' میں اسے گاؤں میں لے آئی۔ جو ایک بار کنویں میں گر جائے' اسے وہاں سے نکالا نہیں کرتے ماہنے؟"

ماسی کی اس دلیل کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

ماسی نے پنچائت کو بھی کھری کھری سنائیں۔ پنچائت نے اس کا حقہ پانی بند کر دیا تو ماسی نے کہا "حقہ تو میں پیتی نہیں اور پانی اللہ کی نعمت ہے۔ دیکھوں تو کون ہے مجھے روکتا ہے اس کے لانے سے۔"

ماسی کنویں سے دندنا کر پانی بھرتی رہی۔ اُسے کسی نے نہ روکا۔ ایک دو مہینوں کے بعد لوگ اس قصّے کو بھول گئے۔ لہروں کا جو دائرہ بنا تھا وہ پانی میں گم ہو گیا۔ اب سطح پر اور سطح سے نیچے کوئی لہر نہیں اٹھ رہی تھی۔ مستری اب لوگوں سے ملنے جلنے لگا تھا۔ وہ بے کار تھا' اس لئے وقت گزاری کے واسطے بیساکھی کے سہارے کبھی کسی کنویں پر چلا جاتا اور کبھی کسی پر۔ اس کے پرانے دوستوں نے اُسے منہ نہ لگایا' اس نے نئے دوست بنا لئے۔ بھا اسلم کے تھڑے پر بھی اُس نے بیٹھنے کی کوشش کی لیکن لوگوں کی سرد مہری نے اُسے اس محفل کا فرد نہ بننے دیا۔ وہ ایک بار بھٹے پر بھی میرے پاس آیا لیکن میں اپنے کام میں لگا رہا۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۱۷

○

جب اُس سال گندم کی فصل کٹ رہی تھی، تو ماسی صبح سے شام تک سلا چکتی رہی! اُس کی کمر دُہری ہو گئی۔ اُس کا بدن جھلس گیا۔ مجھے تو اُس پر ترس آتا رہا پر میں نے اُس سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہ کہا۔ میں جانتا تھا کہ ماسی اس کا بُرا مانے گی۔ وہ مر جائے گی پر اپنی آن انکھ پر آنچ نہیں آنے دے گی۔

"سِلا چگ کر کوئی بھی سال بھر کا خرچ اپنے گھر نہیں ڈال سکتا اور اب تو ماسی کو اپنا ہی نہیں، مستری، شیماں اور اس کے دو بچوں کا منہ بھی بھرنا پڑے گا۔"

میں نے اپنے گھر میں یہ بات کی تو زینت نے مجھے بتایا "شاید آپ کو پتہ نہیں، شیماں مشین چلانا جانتی ہے۔"

"کون سی مشین ؟"

زینت نے مسکرا کر کہا "سلائی کی مشین جو وہ شہر سے اپنے ساتھ لائی ہے۔"

زینت نے مزید مجھے بتایا کہ وہ شہری طرز پر شلوار قمیص سیتی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ اب گاؤں کی لڑکیاں گاؤں کے درزی سے کپڑے نہیں سلوایا کریں گی۔

"لیکن ہمارا درزی تو سیپ پر کپڑے سیتا ہے اور شیماں نقد پیسے لیا کرے گی۔"

"اب گاؤں والوں کے پاس نقد پیسے بھی تو ہوتے ہیں۔" زینت نے کہا اور پھر میری طرف بڑی رسان سے دیکھ کر کہا۔ "اب کی بار آپ شہر جائیں گے، تو میرے لئے بھی کوئی اچھا سا کپڑا لائیں گے نا ؟"

"کیوں ؟"

"میں بھی اس سے ایک جوڑا سلواؤں گی۔"

"نہیں!" میں نے کچھ تلخ سے لہجے میں کہا تو وہ مایوس ہو گئی۔ پھر نجانے یکایک میرا

جی کیوں بھر آیا۔ ایک ہی لمحے کے بعد میں نے مسکرا کر کہا "ضرور! ضرور لاؤں گا زینت۔ تمہارے بیاہ کے جوڑے سے بھی اچھا کپڑا۔"

آہستہ آہستہ مجھے یوں لگا جیسے گاؤں شیماں کو قبول کر رہا ہو۔ گاؤں کی لڑکیوں کا ماسی کے گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ سلائی کی مشین تھی۔ ہمارا بوڑھا دھوبی ہی ہمارا درزی تھا۔ وہ اور اس کی بیوی ڈھیلے ڈھالے کپڑے سیتے اور جوان لڑکیوں اور بڑی بوڑھیوں کے کپڑوں میں کوئی فرق نظر نہ آتا۔ شیماں کے سلے ہوئے کپڑے پہنے الکا دکا لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے جوانی اور بڑھاپے کا فرق نظر آیا تو میں ٹھٹک سا گیا۔

لوگوں نے کہا "اب گاؤں میں بھی شہر کا فیشن آ گیا ہے۔"

"مستری نے جوان لڑکوں کو تاش کھیلنی سکھا دی ہے۔"

"تاش تو لڑکے پہلے پہلے بھی کھیلتے تھے، سنا ہے کہ مستری پیسے لگا کر کھیلتا ہے۔"

"وہ چرس بھی بیچتا ہے۔ میں نے خود اسے سگریٹ میں چرس بھرتے دیکھا ہے۔"

"اسے چرس کہاں سے ملتی ہے ؟"

"ایک شہریا کبھی کبھار موٹر سائیکل پر آتا ہے اور اسے چرس دے جاتا ہے۔"

"میں نے تو اسے گاؤں میں آتے جاتے نہیں دیکھا۔"

"پکی سڑک پر مستری سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔"

ماسی نے بتایا "وہ وہی تو ہے، اس کارخانے کا مالک جس میں مستری کام کرتا تھا ماہنے! وہ مہینے کے مہینے آتا ہے۔ مستری کو کچھ نقد امداد دے جاتا ہے۔ میں نے مستری سے کہہ رکھا ہے میں اسے گاؤں میں نہیں گھسنے دوں گی۔"

شیماں کو گاؤں میں آئے ہوئے تین مہینے ہو چکے تھے اور میں نے اُسے دیکھا تک بھی نہیں تھا۔ میں اُسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"نہیں! تو اُسے دیکھنا چاہتا ہے۔" ایک ننھی سی آواز میری کان میں آئی۔

"یہ جھوٹ ہے۔" میں نے سوچا۔

کچھ آوازیں من کے اندھے کنویں سے آتی ہیں۔ ہم ان سے چھپتے بھاگتے ہیں پر وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ یہی آواز رات کو خواب بن کر آتی تو میں صبح جاگ کر اُسے بھول جانے کی کوشش کرتا۔ میں خوابوں میں شیماں کو دیکھتا، کبھی بچپن کے موڑ پر، کبھی بچپن اور

جوانی کے سنگم پر اور کبھی جوانی کے شوردریا کے اس بھنور میں جس کی گھمن گھیریاں میں ڈوبتے اُبھرتے رات بیت جاتی ہے۔ میں خواب میں اس سے ہم کلام ہوتا اور میں نے کئی بار اُس کے بدن کو چھو لیا۔ میرا خیال تھا کہ اب میں بچپن اور جوانی کی سرحد سے بہت دور آگے نکل گیا ہوں۔ میں ایک ذمّے دار شوہر ہوں اور بہت جلد ایک بچّے کا باپ بھی بننے والا ہوں۔ مجھے ایسے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ مجھے کئی بار ماتھے سے شرم کا پسینہ پونچھنا پڑا۔ پھر ایک خواب مجھے دن دہاڑے اس گلی میں لے گیا جہاں ماسی ریشم کا گھر تھا۔ بھٹے پر جانے کے راستے میں یہ گلی نہیں پڑتی تھی۔ نجانے کس طاقت نے مجھے رستہ بھولنے پر مجبور کیا۔ سارا گاؤں جاگ رہا تھا اور گلی بھی جاگی جاگی سی تھی پر میں اس میں سے سوتے ہوئے گزر گیا۔ بھٹے پر پہنچ کر میں نے سوچا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ نہیں! میں تو خوابوں کی ایک گلی میں سے گزر کر آیا ہوں۔ تب میں دن کو بھی ایسے ہی خواب دیکھنے لگا تو مجھے اپنے اندھے کنویں سے ڈر لگا۔ اس دن میں رات گئے گھر لوٹا۔

چونکہ برسات سے پہلے پہلے اینٹوں کی پکائی لازمی ہوتی ہے، اس لئے میں نے کام کی زیادتی میں پناہ لی۔ اساڑھ کی پہلی بارش سے پہلے پہلے اینٹیں پک گئیں اور بھٹے پر کام رک گیا۔ اکا دکا گاہک آتے اور اینٹیں لے جاتے۔ جب برسات شروع ہوئی تو بھٹے پر کام بالکل بند ہو گیا۔ اب خالی وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ مجھے اس فراغت سے بہت ڈر لگا۔ میں نے ورکر کی لائبریری میں بیٹھ کر پڑھی ہوئی کتابوں کو پھر سے پڑھ ڈالا۔ دکان کے تھڑے پر گھنٹوں بیٹھا رہتا اور اخبار کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک کئی بار پڑھ ڈالتا اور پھر بھی وقت بچا رہتا۔ تب بادل اُمڈ کر آئے تو میں نے اُن میں ڈوب جانا چاہا لیکن نہ ڈوب سکا۔

سلیمان اُن دنوں وکالت کے پہلے سال میں تھا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آیا تو ورکر کے ہاں اُس سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے چھوٹتے ہی سیاست پر بحث شروع کر دی۔ وہ ہم پر دیر تک اپنی علمیت کا رُعب گانٹھتا رہا۔ اُس نے کہا "ملک ایک سیاسی بحران میں سے گزر رہا ہے۔ دیکھئے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

"ہمیں تو گاؤں میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"ماہنے! گاؤں والے تو کنویں کے مینڈک ہیں۔ لاہور میں رہ کر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔"

"ہمیں بھی تو اخبار اور ریڈیو سے کچھ نہ کچھ معلوم ہوتا ہی رہتا ہے چوہدری سلیمان!" ورکر بولا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اخبار اور ریڈیو پر اندر کی خبریں تو نہیں آتیں۔" سلیمان نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو سلیمان! ہم نے تو اپنے علاقے کے ممبر کی شکل صورت تک نہیں دیکھی۔" میں نے اس کی تصدیق کی۔

"اسے گاؤں میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ اتنے بڑے آدمی کو اتنی فرصت کہاں ملتی ہے۔ میں تو اُس سے ملتا رہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب اگر وزارت بدلی تو اُسے بھی وزیر بنا دیا جائے گا۔"

"اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ خود شہر میں رہتا ہے لیکن اس نے اپنے گاؤں کو تو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ سکول اور ہسپتال کھلوائے ہیں۔ اُس کے گاؤں کی ساری گلیاں پکی ہو چکی ہیں۔"

"اس کے علاقے میں اور بھی تو بہت سے گاؤں ہیں۔"

پھر سلیمان نے یکایک گفتگو کا دھارا موڑ دیا۔ اس نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا "اپنے گاؤں میں بھی تو ایک بحران آیا ہوا ہے نا؟"

"کون سا بحران؟"

"کیوں بھولے بنتے ہو؟"

"تمہارا اشارہ مستری کی طرف ہے۔"

"تم شیماں کا نام کیوں نہیں لیتے؟"

میں خاموش رہا۔ سلیمان نے ورکر کی طرف دیکھ کر کہا "آپ نے شیماں کو دیکھا ہے؟"

"نہیں تو ـــ مجھے گاؤں کی بہو بیٹیوں کو دیکھنے کا شوق بھی نہیں ہے۔" ورکر نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"آپ جوان ہیں۔ جوانی میں بوڑھوں جیسی باتیں کرنے والے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔"

ہوں گے۔"

"چوہدری سلیمان! میرا مشورہ ہے کہ میری بیٹھک میں اس موضوع پر بات نہ کی جائے تو بہتر ہے۔"

"چوہدری عبدالرحمن! تم نے کچھ نہیں کہا۔ تم نے تو اُسے دیکھا ہو گا۔"

"دیکھا نہیں لیکن دیکھنا چاہتا ہوں پر تمہاری آنکھوں سے نہیں۔"

سلیمان نے قہقہہ لگا کر کہا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ ماسی رنشو نے اُسے اپنی چار دیواری میں یوں بند رکھا ہے جیسے پنجرے کا دروازہ کھلا اور رنگین چڑیا پنجرے سے اُڑ گئی۔"

میں نے ورکر کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے گفتگو کا رُخ موڑنا چاہا۔ سلیمان کسی ڈھب پر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے مستری کے کارخانے کے مالک کا ذکر کیا جو سکوٹر پر آتا ہے اور پکی سڑک پر مستری کو کچھ دے دلا کر چلا جاتا ہے۔

"عبدالرحمن! سنا ہے شیماں کے ہاں اب گاؤں کی لڑکیاں بھی آتی جاتی ہیں۔"

"آتی ہوں گی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔"

"سیداں بجلی اور شیداں ڈھولک جیسی لڑکیاں بھی شیماں کے رنگ میں رنگی گئیں تو گاؤں لاہور بن جائے گا۔"

لاہور کا ذکر آیا تو ورکر نے پوچھا "چوہدری سلیمان! تم لاہور میں رہتے ہو۔ سیکڑوں' ہزاروں لڑکیوں کو روزانہ دیکھتے ہو گے انارکلی میں' مال روڈ پر۔ لاہور سے آنے والوں کی نگاہوں میں گاؤں کی لڑکیاں کیا خاک جچتی ہوں گی۔"

"ورکر صاحب! یہ صرف کہنے کی بات ہے۔ لڑکی لاہور کی ہو یا چک مراد کی' آخر لڑکی ہی ہے۔ پھر ہر جگہ کی اپنی اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ اسی بجلی کو دیکھئے۔ جب لہرا کر پاس سے گزرتی ہے تو تن بدن میں کرنٹ سی لگ جاتی ہے اور شیداں ڈھولک کے پھولے پھولے گالوں پر ایک پیار بھرا طمانچہ لگانے کو جی چاہتا ہے۔ پر شیماں کی بات کچھ اور ہے۔ وہ تو آگ ہے آگ۔"

ورکر نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکرا کر کہا "چوہدری سلیمان! لاہور کے ایک محلے کا نام ہیرا منڈی ہے۔ کبھی کبھار وہاں بھی ہو آیا کرو' تو گاؤں میں آ کر تمہیں ان باتوں کا دھیان بھی نہ آئے۔"

"تم نے مجھے کوئی لچا لفنگا سمجھ رکھا ہے۔" اس نے غصہ بھری آواز میں کہا۔

"صرف ہیرا منڈی جانے والے لوگ لچے لفنگے ہوتے ہیں چوہدری سلیمان؟" میں نے پوچھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو عبدالرحمن؟" سلیمان نے پوچھا۔

"سنا ہے وہاں جانے والے لوگ کم از کم اپنے گاؤں محلے کی لڑکیوں پر بری نظر نہیں ڈالتے۔"

"بس بس چوہدری صاحبان! آپ اس گفتگو کو بند کیجئے۔" ورکر نے ذرا تلخی سے کہا۔ سلیمان مجھ پر ایک جلتی چبھتی نگاہ ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کے بعد ورکر نے کہا "چوہدری عبدالرحمن! یہ آدمی پڑھ لکھ کر بھی اتنے ہلکے خیالات کا آدمی کیوں ہے؟"

"کچھ خون خمیر کا اثر ہوتا ہے۔"

"بڑا چوہدری تو ایسا نظر نہیں آتا۔"

"کون جانے ورکر صاحب!"

سلیمان سے ہر ملاقات کے بعد میرے من کے اندھے کنویں سے کچھ لہریں اٹھتیں۔ ایک طوفان آتا اور میں کئی کئی دن ڈانواں ڈول رہتا۔

"کہیں وہ سچ تو نہیں کہہ رہا؟" میں سوچتا "نہیں——— ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"تم ریا کار ہو۔" اندھے کنویں سے آواز آئی۔ "تم شیماں کو جی بھر کر دیکھنا چاہتے ہو لیکن تم ایسا نہیں کر پاتے کیونکہ تم اپنے آپ کو ننگا نہیں دیکھنا چاہتے۔ تم سے سلیمان بہتر ہے۔ وہ جو کچھ ہے' ویسا ہی نظر آتا ہے۔" تب مجھے اپنی بزدلی پر غصہ آیا۔ اتنا غصہ کہ میرے من میں آگ لگ گئی۔ من میں آگ لگے تو سر بھی جلتا ہے اور اس کی لپٹیں دور دور تک پہنچتی ہیں۔ سب سے پہلے زینت نے اس کی گرمی کو محسوس کیا۔ اُس نے پوچھا "آج کل آپ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں؟"

"نہیں تو۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

زینت کو شاید میری مسکراہٹ اوپری سی لگی کہ وہ اُداس سی ہو گئی۔ بھلا علم تو میرے من میں بھی جھانک سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے' اس نے میرے اندھے کنویں کا راز پا لیا ہو۔ پر وہ خاموش رہی ورنہ میں شاید اس سے بھی جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا۔

"مجھے اپنے دوزخ میں خود ہی جلنا چاہئے۔" میں نے سوچا۔

ایک دن ماسی نے مجھے گلی میں روک لیا۔ صبح بارش ہوئی تھی اور اب آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا اور سورج یوں آگ برسا رہا تھا جیسے سوا نیزے پر آ گیا ہو اور گلی کی دونوں طرف کی دیواروں سے بھاپ نکل رہی تھی اور میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میرے کپڑے میرے بدن کے ساتھ چپک گئے تھے۔

اس حالت میں ماسی نے میرا راستہ روکا تو میں نے جھنجھلا کر کہا "کیا بات ہے ماسی؟"

"میرے گھر چلو۔"

"کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بیچاری لڑکی تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔"

"بیچاری لڑکی کون؟"

"وہی ––– بیچاری ––– اور کون؟"

"میں نہیں جاؤں گا۔ تمہیں بتا دو کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔"

"مجھے کیا پتہ ماہنے؟"

"میں نہیں جا سکتا تیرے ساتھ ماسی! تُو تو سٹھیا گئی ہے۔ بھلا گاؤں کے لوگ کیا کہیں گے؟"

"کیا کہیں گے؟ کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ میرے گھر میں آنے پر تمہیں کوئی کیا کہے گا؟"

"لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے ماسی؟"

"ماہنے! ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے من میں کوئی کھوٹ ہے۔ من میں کھوٹ ہو تو انسان دنیا والوں سے ڈرتا ہے۔"

میں نے ماسی کی طرف کچھ بے بس سا ہو کر دیکھا ہو گا کہ وہ مسکرانے لگی۔

"اچھا! تیری مرضی۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اجلے کپڑوں پر کوئی داغ دھبا لگ جائے۔"

میں نے کہا "ماسی! چل میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔"

گلی کے موڑ سے ماسی کے گھر تک فاصلہ ہی کتنا ہو گا! یہی گنے چنے دس قدم۔ دس پل۔ میں نے یہی سمجھا میں پل صراط پر سے گزر رہا ہوں۔ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز، بال

سے زیادہ باریک۔ اس کے ایک سرے پر ایک دُنیا تھی، دوسرے پر دوسری۔ میں جو درمیان کی کھائی میں گرنے سے بچ گیا تو دوسری دُنیا میں جا کر میری کلیا نہ پلٹ جائے گی۔ کیا میں وہی منشی عبدالرحمٰن رہوں گا جس نے اُجلے کپڑے پہننے کے لئے اپنے من کی بہت سی آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا تھا، جو جس کے ملنے کے خواب دیکھتا رہا، اُسی کے سامنے نفرت کی دیواریں بھی کھڑی کرتا رہا کہ کوئی یہ نہ کہے "اس کے خون خمیر میں کوئی کھوٹ ہے" اور مجھے یوں لگا جیسے یہ دس پل کسی داستان کے آدمی خور دیو تھے کہ میرا بچپن کھا گئے، میرے لڑکپن کو ہڑپ کر گئے اور اب میری جوانی پر دانت تیز کر رہے تھے۔

اور اب جب یہ لفظ لکھ رہا ہوں، مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کہانی اُنہیں چند پلوں کی تھی جو اتنے لمبے عرصے پر پھیل گئی ہے کہ میں اسے سمیٹ نہیں سکتا۔

"ماہنے!" ماسی نے کہیں بہت دُور سے مجھے آواز دی۔

"کہو ماسی!"

"تم وہاں کیوں کھڑے ہو؟ بیٹھو۔"

میں اس گھر میں کئی مرتبہ پہلے بھی آیا تھا۔ ماسی اپنے گھر کو بہت صاف ستھرا رکھتی تھی۔ اندر کی دیواریں کھڑیا مٹی سے لپی ہوئی تھیں۔ ان میں نیل کا ہلکا ہلکا رنگ بھی شامل تھا۔ سامنے کی دیوار میں چھتی پر تانبے اور پیتل کے چمکتے ہوئے برتن سجے تھے۔ کمرے کے لپے پتے کچے فرش پر دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ان میں سے ایک چارپائی کے پائے رنگین تھے اور یہ سوت سے بنی ہوئی تھی۔ دوسری چارپائی جو بان سے بنی ہوئی تھی، اس چارپائی سے ذرا ہٹ کر بچھی تھی۔ ماسی نے مجھے سوت کی چارپائی پر بٹھایا۔ ایک رنگین پنکھا میرے ہاتھ میں تھما کر کہا "آج بڑی اُمس ہے اور تم پسینے میں نہائے ہوئے ہو۔"

میں نے پنکھا ہلایا۔ ہوا کا ایک سانس آیا جیسے کسی نے سسکی بھری ہو یا رُکا ہوا کا کوئی لمحہ حرکت میں آ گیا ہو۔

ماسی نے کہا "بیچاری لڑکی دوسرے کوٹھے میں ہے۔ میں اُسے آنے کے لئے کہہ دوں۔"

وہ لڑکی آئی، وہ بیچاری لڑکی۔ وہ دروازے میں ایک پل کے لئے رُکی۔ اُس کا دوسرا قدم دہلیز سے اندر آیا تو زمانے کا چرخ اُلٹا گھومنے لگا۔ میں اس کی لپیٹ میں آ گیا اور چرخ

گھومتا رہا چرخ الٹا گھومے تو وہ کسی منزل پر خود بخود نہیں رکتا، اسے روکنا پڑتا ہے۔ میں بولی سے تو کہاں ہیں؟" تو کہیں سے بچپن میں پکڑا اور بچپن کی اس منزل کی ایک جھلک پر کر ہی نے رک جانا چاہا۔ جب گلیوں میں پہلی بار مشین کا پہیہ گھوما تھا اور بجلی کے بلب چمکے تھے لیکن الٹا چکر کہیں نہ رکا اور ماسی نے کہا "بیٹھ جا شمیلہ ——— ماسٹر جی!"

"میں نے کہا "لو ماسی!"

"میں نے کچھ نہیں کہا ماسٹر جی! تم اس سے پوچھو جس نے تمہیں بلایا ہے۔"

میں نے اسے کھلی کھلی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ سامنے کی چارپائی پر بیٹھی تھی اور اس کا سراپا دھندلا تھا کیونکہ میری آنکھوں میں پسینے کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور پسینہ بھاپ بن کر اڑتی دھول کی طرح میرے اور اس کے درمیان حائل ہو چکا تھا۔ میں نے سامنے سے چہرے کا پسینہ پونچھا، آنکھیں صاف کیں اور دھندلا سراپا یوں نکھر آیا جیسے بھورے بادلوں سے کوئی ٹمٹماتا ہوا ستارہ یکدم چمک اٹھتا ہے۔ میں کانپ گیا۔ ستارہ ٹمٹمایا تو میرا وجود کپکپا کر یکدم جاگ اٹھا اور چلتا پہیہ یکدم رک گیا۔ میں نے سوچا "میں اس لڑکی کو نہیں جانتا، یہ وہ نہیں ہے جسے بچپن سے لے کر جوانی تک ایک ہی روپ میں دیکھتا رہا۔ کیا اب یہ روپ بدل گیا ہے؟"

میرے من کے اندھے کنویں سے آواز آئی "زندگی کا روپ کبھی نہیں بدلتا۔ یہ وہی ہے، یہ وہی ہے۔ یہ زندگی کی ہر منزل پر تمہارے ساتھ رہی ہے۔"

میں نے کہا "ماسی! شمیلہ کیا کہنا چاہتی ہے؟"

میں مدت تک اندھے کنویں میں اپنی پکار کی گونج سنتا رہا۔

دیر بعد ماسی نے کہا "بیچاری لڑکی تو رو رہی ہے۔"

میں نے زندگی کو کھلکھلا کر قہقہے لگاتے بھی سنا ہے اور ابلتے آنسوؤں کی صورت میں بھی اسے دیکھا ہے۔ کبھی کبھار مجھے آنسوؤں میں قہقہے اور قہقہوں میں آنسو نظر آئے ہیں لیکن یہ آنسو دنیا جہان سے نرالے تھے جو پلکوں کی اوٹ سے یوں ڈھلک رہے تھے جیسے کوئی سوتا اچانک پھوٹ پڑا ہو اور ان کے پیچھے نہ غم تھا نہ خوشی تھی۔ اجلے دھلے دھلے آنسو جیسے ——— نہیں ——— میں ان آنسوؤں کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا ——— نکھرے نکھرے دھلے دھلائے آسمان سے کبھی کبھار سفید بادل کا ایک ٹکڑا اچانک برس پڑے تو اس سے ٹپکنے والی

بوندوں کو آپ کیا نام دے سکتے ہیں۔

ماسی نے کہا "ماسٹر جی! بیچاری لڑکی جو کچھ کہنا چاہتی ہے، اسے میری زبان سے سن لو۔"

"کہو ماسی!"

ماسی نے پہلے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ بستی کے متعلق بتایا کہ وہ بیچارہ اب کوئی کام کاج نہیں کر سکتا۔ یوں بھی وہ نشہ کرتا ہے اور نشئی کو بال بچوں کی کیا فکر ہو سکتی ہے۔ شمیلہ سارا دن مشین چلاتی ہے۔ بیچاری رات کو تھک ٹوٹ کر تختہ بن جاتی ہے اور میں بوڑھی عورت کب تک اس کا ساتھ نبھا سکوں گی۔ ایک سانس آئے تو دوسرے کا پتہ نہیں ہوتا اور آج مرے کل دوسرا دن۔ شریک اکٹھا کر کے ٹوٹ پڑیں گے۔ پھر بتاؤ ماسٹر جی! بیچاری لڑکی کہاں جائے گی؟"

"میں نہیں سمجھا ماسی!"

"ماسٹر جی! میں کوئی پہیلیاں تو نہیں بجھا رہی۔ ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں یہ مکان لڑکی کے نام لکھ دوں۔"

"ماسی! یہ اتنا آسان کام تو نہیں۔ اسے اس مکان میں کون رہنے دے گا؟ تیرے کئی وارث ہیں۔ سارا گاؤں تیرا دشمن بن جائے گا۔ تو کس کس سے لڑے گی؟"

"یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں۔ ایک بات ہے ماسٹر جی! پر ہے وہ بھی پہاڑ جتنی بڑی۔ کیا پتہ تو میرا ساتھ دے سکے یا نہیں؟"

"کہو ماسی!"

"مجھ بخشے بیا تو کا جو مکان ہے، اس کی شمیلہ ہی تو وارث ہے۔"

ماسی اگر میرے کان میں کوئی بم کا گولا چھوڑتی تو شاید اتنا بڑا دھماکہ نہ ہوتا۔ میں سن ہو کر رہ گیا۔ میری زبان گنگ ہو گئی۔

ماسی نے کہا "ڈر گئے ماسٹر جی؟"

"ہاں ——— میں ڈر گیا ہوں ماسی!" میں نے کہا۔

"پھر میں اونچے طرے والے کے پاس خود جاؤں گی۔ جو وہ نہ مانا تو میں تھانے کچہری جاؤں گی۔ جس کا حق ہے، وہ اسے مل کر رہے گا ماسٹر جی!"

"نہیں ماسی!" شمیلہ بولی "تم کیوں مصیبت میں پڑو گی۔"

"لوکی! میں تیری بات کر رہی ہوں اور تو مجھے روک رہی ہے۔"

"میں چوہدری کے پاس خود جاؤں گی" شیماں نے کچھ اس انداز میں کہا کہ میری جھکی ہوئی آنکھیں اٹھ گئیں۔

ہماری نظریں یوں ملیں جیسے دو ستارے ٹکرا گئے ہوں لیکن میری آنکھیں اس کی آنکھوں میں جم سی گئیں۔ میں نے مدتوں بعد آج ان آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ ان آنکھوں میں کیا تھا۔ کوئی دکھ کوئی حسرت؟ کوئی ارمان؟ کوئی گلہ؟ کوئی شکایت؟ ان آنکھوں میں کچھ بھی نہیں تھا اور بہت کچھ بھی تھا اور یہ تصویر اس کی آنکھ میں تھی یا میری آنکھ میں کہ میں نے اپنے آپ کو جوہڑ کے کنارے کھڑا پایا اور وہ بگے پر سوار ہو کر جا رہی تھی اور میں نے سوچا تھا جیسے گاؤں مر گیا ہو لیکن میں نے جاتے ہوئے بگے کو روکا نہیں تھا اور شرم کی نمی میرے ماتھے پر تھی اور میرے ہونٹ سوکھ چکے تھے اور اب میں پھر۔۔۔۔

میں نے کہا "ماسی! تھوڑا سا صبر کرو۔ میں لوگوں سے بات چیت کروں گا۔ چوہدری کے ہاں جانے میں کچھ فائدہ نہ ہو گا۔"

جب میں نے تھڑے کی محفل میں ماسی کی تجویز کا یونہی سرسری طور پر ذکر کیا تو ایک چنگاری سی چٹخی اور لوگ دم بخود رہ گئے۔

بابا حیات نے کہا "رنجو تو سدا کی پاگل ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آؤ ماہنے!"

چوہدری رحمت خان بولا "بابا تمہیں چوہدری سے دشمنی ہے پر دشمنی لینے کا یہ طریقہ بھی تو اچھا نہیں کہ آگ لگے تو اپنا ہی دامن جل جائے۔"

بھا اسلم نے کہا "ماہنے! تم ماسی رنجم کی تجویز کو ٹھیک سمجھتے ہو۔"

"ہاں ابھا۔" میں نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا تو بھا میرا منہ تکنے لگا۔ تب اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر کچھ دیکھا تو آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

میرے باپ نے جب یہ بات سنی تو اس نے بیٹھک میں مجھ سے پوچھا "ماہنے! تم کچھ بولے بولے سے کیوں لگتے ہو؟" "تم نے پاگل رنجو کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"وہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے بابا! کیا ساتھ دینا چاہیے۔"

"ماہنے! سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا۔ چوہدری سے مقابلے کی بات ہوتی تو میں تمہیں پاگل نہ کہتا۔ مجھے ڈر ہے کہیں تمہیں سارے گاؤں سے ٹکر نہ لینی پڑے۔ سچ بھی میٹھا نہیں ہوتا۔ تم اس کڑوی گولی کو لوگوں کے حلق سے کیسے اتارو گے؟"

"میں نہیں جانتا بابا! کبھی کبھار اکیلے آدمی کو بھی دنیا جہان سے لڑائی کرنی پڑ جاتی ہے۔"

میرے باپ نے مجھے خاموش نگاہوں سے ایک بار دیکھا اور منہ پھیر گیا۔

چوہدری نے تھڑے پر پیغام بھجوایا "اس مکان پر نتھو خرادیے کی پوتی کا کوئی حق نہیں بنتا۔ نتھو کا بیٹا اس کی عین حیات میں فوت ہو گیا تھا۔ دادا کی میراث پوتی پوتوں کو نہیں پہنچتی۔ اس مکان کی زمین شاملات دیہہ ہے اور ملبہ نتھو کا تھا۔ مکان پچھلے سیلاب میں گر پڑا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ بنوایا۔ اب یہ سارے گاؤں کی ملکیت ہے اور حکومت کا ایک افسر اس میں رہتا ہے۔"

چوہدری خود کسی سے نہ ملا۔ پھر بھی گاؤں کے سارے لوگوں نے اس کی بات کو سچ جانا۔ میں اب اکیلا تھا۔

تب مجھے یوں لگا جیسے میں نے خود سارے گاؤں کا حقہ پانی بند کر دیا ہے۔ میں نے بھا اسلم کی دکان پر بیٹھنا ترک کر دیا۔ نہ دور کر کے ہاں جا کر ٹرانسسٹر سنتا۔ باپ سے آنکھیں چار ہوتیں تو میں آنکھیں پھیر لیتا۔ میری ماں حسب معمول میرے آرام کا خیال رکھتی لیکن وہ ممتا کا دامن پھیلاتی تو میں چھوئی موئی کی طرح سمٹ جاتا اور میں ندامت سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تو اس کی آنکھوں میں دکھ کی آگ سلگنے لگی میرا دامن جلنے ہی والا تھا کہ میں چونک گیا۔

"یہ مجھے کیا ہو گیا؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

ماسی سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا "ماہنے! نجانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میرے جی میں ایسی بات آئی۔"

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا ماسی!"

"اب تو گاؤں کی لڑکیاں کپڑے سلوانے بھی شیماں کے ہاں نہیں آتیں۔ بیچاری سارا دن بے کار میں کٹ رہتی ہے۔"

میرے بچپن کی ساتھی مجھے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے اور کوئی من چلا یہ

بھی کہہ دیتا کہ عشق بری بلا ہے۔ بڑے بڑے نمازی پرہیز گاروں کو لے ڈوبتا ہے اور ہمارا
ماہتا بھلا کس کھیت کی مولی ہے اور مجھے دکھ اس بات کا تھا کہ میں ان کے منہ پر ہاتھ بھی نہ
رکھ سکا اور سلیمان میرے منہ پر تو نہ کہہ سکا لیکن اُس کی بات مجھ تک پہنچ گئی۔ "آخر ماہتا
بھی اپنے دوزخ میں جا پہنچا۔ سبھی کو کبھی نہ کبھی اس آگ کا مزہ چکھنا ہی پڑتا ہے۔" میں
اُس کے اس پیغام کا جواب بھی نہ دے سکا۔ مجھے اپنی بے بسی پر خود رحم آیا اور میں اپنے
آپ میں گھٹ کر رہ گیا۔

اور بھری برسات میں جب ایک دن موسلادھار بارش ہو رہی تھی، ہمارے گھر میں
وہ مہمان آگیا جس کا گھر بھر کو انتظار تھا۔ میں گھر پہنچا تو عائشہ مجھے گھیر گھار کی زینت کی
چارپائی کے پاس لے گئی۔ میں نے بچے کو ایک نظر دیکھ کر پلٹنا چاہا تو وہ میرے گلے کا ہار ہو
گئی "نہیں بھا! اسے ایک بار گود میں لے کر تو دکھاؤ۔" میں زینت کی چارپائی پر جھکا تو اُس
نے منہ پھیر لیا۔ میں جھجکے جھجکے سَن ہو گیا تو ماں نے کہا "عائشہ! اتنی بھی جلدی کیا ہے۔"
میں گھر سے نکل گیا۔

"کچھ سنا ماہتے؟"

"نہیں!"

"سلیمان نے بجلی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔"

"بجلی بھی کسی کے ہاتھ آتی بھلا؟" میں بے اختیار ہنس پڑا۔ خبر سنانے والا حیران ہوا
ہو گا۔ میں نہیں جانتا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میں ہنسا کیوں۔ اس سے پہلے کہ دکان کے
تھڑے پر پہنچتا، گاؤں کی ایک ایک گلی اس خبر کو سن چکی تھی۔

بجلی اپنے کنویں سے آ رہی تھی۔ پگڈنڈی کا ایک بل کملو کے ایک کھیت کی اوٹ
میں تھا۔ یہاں سلیمان چھپ کر کھڑا تھا۔ اُس نے اچانک بجلی کی کلائی پکڑ لی تو اُس کی چیخ نکل
گئی۔ کملو کے کھیت کے اندر گاؤں کا ایک کسان گھاس کاٹ رہا تھا۔ وہ چیخ سن کر کھیت سے
نکلا تو سلیمان نے کہا "دیکھو! میرے نزدیک نہ آنا۔"

"چودھری کے بیٹے! ایک تو تو گاؤں کی لڑکیوں پر ہاتھ ڈالتا ہے اور ساتھ ہی مجھے
دھمکاتا بھی ہے۔"

وہ درانتی لہراتا ہوا آگے بڑھا تو سلیمان نے بجلی کی کلائی چھوڑ دی۔

بجلی نے روتے ہوئے کہا "ویرا! کسی سے کچھ نہ کہنا۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔"

"تو بے قصور ہے بجلی! پر جس نے تجھ پر ہاتھ ڈالا ہے وہ تو قصور وار ہے۔ اسے
ضرور سزا ملنی چاہئے۔"

اس کسان نے مجھ سے پوچھا "چودھری عبدالرحمن! دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ ہے
نا؟ بجلی کے دل میں کھوٹ نہ ہوتا تو وہ میری اتنی منت سماجت کیوں کرتی؟ میرا تو خیال ہے
جو سلیمان اس پر اچانک حملہ نہ کرتا تو ڈر کے مارے اُس کی چیخ نہ نکلتی۔ تم دیکھنا، کوئی نہ
کوئی گل کھل کر رہے گا۔"

میں نے کہا "چودھری! اب اس بات پر خاک ڈالو۔"

لیکن لوگ اس واقعے پر خاک ڈالنے کو تیار نہ ہوئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اس
معاملے کی تحقیق کے لئے پنچایت بلائی جائے۔ چودھری نے سلیمان کو گاؤں سے بھگا دیا اور
بجلی کے باپ پر ایسا اثر ڈالا کہ اس نے تھڑے کی ایک محفل میں آکر ہمیں گالیاں دیں اور
کہا "چودھری سے بدلہ لینے کے لئے تم میری بیٹی کو بدنام کرنا چاہتے ہو۔ کچھ بھی نہیں ہوا، تم
لوگوں نے اپنے جی سے قصہ گھڑ لیا ہے۔"

اور اس واقعے سے پانچ سات دن بعد بجلی لہرا کر میرے پاس سے گزری تو میں نے
سوچا "وہ کسان سچ بول رہا تھا۔ اب اس کی لہراہٹ میں لڑکھڑاہٹ بھی ہے۔ گاؤں کے بڑے
چودھری کے بیٹے نے جو بی اے پاس ہے اور وکالت پڑھ رہا ہے، اس کی کلائی پر جو محبت بھرا
ہاتھ رکھا ہے، اس کا نشہ اس کی چال میں آگیا ہے۔"

اور عجیب بات یہ ہوئی کہ میری نسبت گاؤں کے رویے میں اچانک نرمی آگئی۔ یہ
اس واقعے کا اثر تھا یا کوئی اور بات تھی، میں نہیں جانتا پر لوگ کہنے لگے "چودھری کا بیٹا
شیطان ہے۔ بیچاری نتھو کی پوتی کے متعلق اس نے جھوٹ موٹ بری باتیں پھیلائی ہیں۔"

ایک دن چودھری رحمت خان نے علیحدگی میں مجھ سے کہا "ماہتے! مجھے معاف کر
دو۔ میں نے تم پر شک کیا۔ اب پھر اٹھاؤ مکان کے مسئلے کو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"چچا! ابھی کچھ دیر اور سوچ لو۔"

بابا حیات نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ میں نے اپنے ماں باپ کے
سلوک میں بھی فرق محسوس کیا اور میرے دل سے ایک ایک کر کے پتھر اٹھتے چلے گئے۔ بھا

کے رونے سے مجھے کبھی شک بھی نہ گزرا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان [illegible] باریک سا پردہ آگیا ہے۔ البتہ زمنت کی آنکھیں کبھی کبھار اس شک کی چغلی ضرور کھا جاتیں جو عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اور شاید اس کی سب سے بڑی طاقت بھی کہ جب کبھی میرے دل میں شیماں کا خیال آتا تو یہ شک بجلی بن کر لپکتا اور اسے چاٹ کر چلا جاتا اور میرا سینہ اس طرح خالی خولی ہو جاتا جیسے دنیا میں میرے لئے کوئی خوشی باقی نہ رہی ہو!

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۱۸

○

تب ایک گونج کی آواز آئی اور منھی منی آوازوں کو کھا گئی!

گزشتہ دو تین سالوں سے ملک کی سیاست دگرگوں تھی۔ ایک وزارت جو آج بنتی، کل ٹوٹ جاتی۔ آج ایک آدمی وزیر بنتا، کل دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔ ہمارا گاؤں کراچی اور لاہور سے بہت دور تھا۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی آواز اخبار کے گنگ منگ لفظوں میں یہاں پہنچ کر کوئی دھماکہ پیدا نہ کرتی۔ کبھی کبھار ورکر کے ٹرانسسٹر سے کوئی آواز آتی بھی تو گاؤں کی فضا میں کوئی ہلچل پیدا نہ ہوتی۔ ہمیں ہل پنجالی سے کام تھا۔ صبح سے شام تک کام ہی کام۔ ہمیں دور کی سیاست سے کیا واسطہ۔ ہاں ہمارے گاؤں کے جوہڑ میں کوئی کنکر بھی گرتا تو ہم اس کی آواز سن لیتے اور جب تک لہروں کے دائرے کنارے سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ نہ جاتے، ہم ان کا تماشا کرتے نہ تھکتے لیکن یہ گونج ہم نے سنی تو ہم نے کان کھڑے کر لئے۔

ہم دکان کے تھڑے پر بیٹھے تھے۔ اُس دن کے اخبار میں کوئی ایسی خبر نہ تھی جس سے محفل میں گرمی آتی، نہ گاؤں میں کوئی نیا قضیہ کھڑا ہوا تھا کہ اس پر گرم گرم گفتگو ہوتی۔ مغرب کی اذان ہوئی تو کچھ لوگ اٹھ کر اپنے گھروں کو چلے گئے اور کچھ نماز پڑھنے کو مسجد میں۔ کچھ نے کلمہ شہادت پڑھ کر دل کی تسلی کر لی۔ میں بھی انہیں لوگوں میں شامل تھا۔ بہانے نمازیوں کا ساتھ دیا۔ کھیتوں کی طرف سے جہاں ابھی صرف گندم کی کونپلیں پھوٹی تھیں اور ابھی سبزے کا فرش نہیں بچھا تھا، میٹھی میٹھی سردی کی ایک لہر آئی۔ پچھم کے دامن میں لگی ہوئی سرخ آگ دھیرے دھیرے بجھنے لگی تو پورب سے اندھیرے کا ریلا آہستہ آہستہ آسمان پر چھانے لگا۔ میں نے لالٹین جلا کر باہر کی دیوار پر لگے کیل سے لٹکا دی۔ لالٹین کی لال لال روشنی اندھیرے اجالے کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ تب اندھیرا چھا گیا اور گاؤں کی خاموشی میں گہرے پانی کی گھمبیرتا سما گئی۔ میں اکیلا تھا اور اندھیرے میں ڈوب کر

اور بھی اکیلا ہو گیا تھا کہ گلی کی طرف سے ٹرانسسٹر پر نشر ہونے والی آواز کا ایک ریلا آیا اور میں چونک گیا۔

ٹرانسسٹر میرے قریب آیا تو جذبے سے لرزتی ہوئی آواز نے کہا "کچھ سنا چوہدری عبدالرحمٰن۔"

"نہیں تو۔" میں نے ورکر کی آواز کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"ملک میں مارشل لا لگ گیا ہے۔" ورکر نے کہا۔

"مارشل لا!"

"فوج نے ملک کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔"

میں کانپ گیا۔ نہ جانے کیوں؟ حالانکہ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہو سکتی تھی بھلا؟

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تو میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ ممکن ہے ملک میں کوئی بہت بڑا انقلاب آ جائے۔"

مجھے نہیں پتا، یہ آواز گلیوں میں آگ کی طرح کیسے پھیلی، کس کس نے سنی اور ایک کان سے دوسرے کان میں کس طرح پہنچی البتہ میں نے یہ دیکھا کہ دکان کے تھڑے پر بہت سے لوگ جمع ہیں اور دم بخود کھڑے ہیں۔ ورکر نے ٹرانسسٹر بند کیا تو لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کیا ہوا۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جو کچھ ہوا، اس کی کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور تھی۔ لوگوں نے ورکر سے کہا کہ وہ کچھ کہے۔ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا "نہ بھائی! میں سرکاری آدمی ہوں۔ میں اس بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔"

"ماہنے! تم تو سرکاری آدمی نہیں ہو، تمہیں کچھ بتاؤ یہ کیا ہوا؟" بابا حیات نے کہا۔

"پاکستان کے صدر میجر جنرل سکندر مرزا نے اسمبلیاں توڑ دی ہیں اور حکومت فوج کے سپرد کر دی ہے۔"

"اب بادشاہ کون ہو گا؟" بابا حیات نے پوچھا۔

"بادشاہ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں! ہاں! ملکوں پر بادشاہ ہی تو حکومت کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے بوڑھے کہا کرتے

تھے کہ کبھی ہندو یہاں بادشاہی کرتے تھے پھر سکھ بادشاہ ہوئے اور ان کے بعد انگریزوں کی باری آئی۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا تو بابا حیات نے کہا "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ماہنے؟"

"پاکستان میں کسی ایک شخص کی بادشاہی نہیں بابا۔ پاکستان جمہوری ملک ہے۔"

"ابھی تو سب لوگ بادشاہ بنے بیٹھے ہیں۔ سیدپور کا ذیلدار جب سے ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر بنا ہے وہ علاقے پر بادشاہی کرتا ہے۔ پٹواری ہمارا بادشاہ ہے۔ پلس کا سپاہی ہمارا بادشاہ ہے۔ وہ جو ہمارا بڑا ممبر شہر میں رہتا ہے، وہ بھی تو ہمارا بادشاہ ہے۔ دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں، کوئی پوچھتا نہیں۔ بتاؤ تو اسلم کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں چوہدری نے بادشاہوں کا سا کام نہ کیا۔ بادشاہ ایک ہو تو کچھ سکون چین بھی ملے۔ اب دیکھنا جو ہم نے ملک میں ایک بادشاہ نہ بنایا تو ہمارا حال اور بھی خراب ہو گا۔ اینٹ سے اینٹ بجے گی۔"

بابا حیات کی لمبی تقریر سن کر چوہدری رحمت خان نے کہا "کہتے ہیں کسی گاؤں میں ایک بڑا سیانا بوڑھا ہوا کرتا تھا۔ لوگوں سے جب کوئی گتھی نہ سلجھتی، وہ اس کے پاس پہنچتے۔ وہ منٹوں میں ان کی مشکل حل کر دیتا ہے ـــــ تمہیں اس کا نام تو یاد ہو گا بابا حیات؟"

"نہیں تو ـــــ کوئی تمہارا بڑا بوڑھا ہوتا، تو مجھے اس کا نام ضرور یاد ہوتا۔"

"کیا پتا؟ کوئی ہمارا ہی بڑا بوڑھا ہو۔"

"اچھا! بحث کس چیز کی؟ اس کا نام تمہیں بتا دوں۔"

اس کا نام تھا بابا لال ـــــ میرا مطلب ہے بابا لال بجھکڑ۔"

لوگ ہنسنے لگے تو بابا حیات اونچی آواز میں بولا "رحمت خان! مسخری سے کام نہیں چلے گا۔ سچ جانو پاکستان والوں نے اپنا بادشاہ نہ بنایا تو ملک چلنے کا نہیں۔"

اس کے اگلے دن بھا اسلم شہر گیا۔ وہاں سے دوپہر کو واپس آیا۔ اس روز دن ڈھلے دکان پر پہلے سے بھی زیادہ لوگ جمع تھے۔ بھا اسلم نے شہر کا جو نقشہ کھینچا، وہ کچھ یوں تھا۔ شہریے بہت ڈرے ہوئے تھے جیسے ان میں سے ہر کوئی مجرم ہو۔ فوج تو شہر میں خال خال نظر آئی لیکن جب کوئی فوجی جیپ گزرتی تو لوگ سڑک چھوڑ کر ایک طرف کو ہٹ جاتے ہیں اور پاک فوج زندہ باد کے نعرے بھی لگاتے ہیں۔ کسی سے کچھ پوچھو تو وہ جواب دینے سے بچتا ہے۔ پولیس کے سپاہی چوکوں پر چاق و چوبند ڈیوٹی دے رہے تھے اور اُن کی حالت

پر رحم آتا تھا کیونکہ وہ اکڑفوں جو پولیس کا خاصہ ہے، ان میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ مٹھائی، سبزی، کپڑا، نون تیل، آٹا دال، سگریٹ سب سستے داموں بک رہے تھے۔ دکاندار گاہک سے ڈر رہا تھا اور گاہک دکاندار سے۔

"ماہنے! شہر میں وہ رونق بھی نہیں رہی تھی، جو پہلے ہوا کرتی تھی۔"

بھا اسلم کو اس دن کا اخبار بڑی مشکل سے ملا تھا۔ اس پر جنرل محمد ایوب خان اور صدر سکندر مرزا کی تصویریں آمنے سامنے آئی تھیں۔ اخبار میں خبریں کم تھیں۔ صدر کی تقریر اور مارشل لا کے ناظم اعلیٰ کا اعلان موٹے حرفوں میں چھپا ہوا تھا۔

بابا حیات صدر اور ناظم اعلیٰ کی تصویروں کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے پوچھا "ماہنے! ان میں بادشاہ کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"شکل صورت سے دونوں بادشاہ لگتے ہیں۔"

"یہ ملک کا صدر ہے اور یہ فوجی حکومت کا ناظم اعلیٰ ہے۔" میں نے تصویروں پر انگلی رکھ کر بتایا۔

"چلو بادشاہ نہ سہی۔ ان میں سے حکومت کس کے پاس ہے؟"

میں نے سوچ کر کہا "بابا یہ فیصلہ کرنا تو مشکل ہے کہ ان میں سے حکومت کس کے پاس ہے۔ سمجھ لو دونوں مل کر حکومت کریں گے۔"

"نہیں! یہ نہیں ہو سکتا ماہنے!" بابا حیات سر ہلا کر بولا۔ "ایک ملک میں دو بادشاہ؟ ایک نیام میں بھلا دو تلواریں سما سکتی ہیں؟"

میں کوشش کے باوجود بابا حیات کے ذہن میں صدر اور بادشاہ کا فرق نہ بٹھا سکا۔ وہ ان پڑھ تھا اور جس دنیا میں وہ رہتا تھا اس میں اس کی عقل خوب کام کرتی تھی۔ میں اسے اس دنیا سے آگے کیسے لے جاتا لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے جو کچھ کہا، وہ کچھ دنوں کے بعد سچ ثابت ہوا۔ سکندر مرزا نے صدارت سے دستبرداری کا اعلان کیا اور ملک سے باہر چلا گیا۔ واقعی ایک نیام میں دو تلواریں نہ سما سکیں۔

مارشل لا کے آغاز ہی میں دو لفظ بڑے مشہور ہوئے۔ سمگلر اور بلیکیے۔ ہر شہر سے بلیکیے پکڑے گئے اور ہر دکان سے سمگلنگ کا سامان برآمد ہوا۔ ہر روز خبریں آتی

تھیں کہ سمگلنگ اور بلیک کرنے والوں کو کوڑوں کی سزائیں سنائی جا رہی ہیں۔

لوگوں نے کہا "ہمارے گاؤں میں کسی کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں کون سا سمگلر ہے؟ کون سا بلیکیا ہے؟"

"بلیک تو اسلم کر سکتا ہے۔" چوہدری رحمت خان نے ہنس کر کہا "ہم اس کے لئے قسم اٹھانے کو تیار ہیں پر گاؤں میں کوئی سمگلر ہو تو اُس کی بے گناہی کی گواہی کون دے گا۔"

اس کا اشارہ چوہدری کی طرف تھا۔ تمزے کی یہ بات چوہدری تک پہنچ گئی۔ اُس نے ہمیں پیغام بھجوایا۔ "رحمت خان سے پوچھنا کہ سمگلنگ کا سامان کس کے ہاں سے پکڑا گیا تھا۔ تھانے میں اس کا رکارڈ موجود ہے لیکن گاؤں میں اب پولیس آئی تو اس میں بدنامی سارے گاؤں کی ہے۔" اس پیغام سے ظاہر ہوتا ہے کہ چوہدری ڈرا ہوا ہے۔ اسے خطرہ ہے کہ کوئی اس کی شکایت نہ کر دے۔ اس کا شک بے بنیاد تھا۔

بھا اسلم شہر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوتا رہا کہ شہر میں ہر چیز یکدم سستی ہو گئی ہے۔ لوگ غیاری اور کریانے کی دکانوں پر ٹوٹ پڑے۔ سمگلنگ کا کپڑا یوں ہاتھوں ہاتھ اڑا جیسے چوروں کا کپڑا ہو اور ڈانگوں کے گز۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ عرصہ قائم نہ رہی۔ دکانوں پر سامان ختم ہو گیا اور تب عام استعمال کی چیزیں بھی مشکل سے ہاتھ آنے لگیں۔ اس سَت پائی سے ہم گاؤں والوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا البتہ جب بھی مہنگائی شروع ہوئی تو اس کا وافر حصہ ہم کو ملا اور جو ایک اور واقعہ گاؤں میں پیش نہ آتا تو اب اس کی کہانی لکھتے وقت اس زمانے کی شاید یہ چند ایک یادیں بھی میرے ذہن میں نہ آتیں۔

اور یہ مارشل لا لگنے سے تین چار مہینے بعد کی بات ہے۔

گاؤں میں پولیس کا ایک حوالدار اور ایک سپاہی صبح صبح بھا اسلم کی دکان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بھا اسلم نے بعد بتایا "ماہنے! میں انہیں دیکھ کر اتنا ڈر گیا تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں لیکن حوالدار نے بڑی تمیز سے بات کی۔ اس نے مجھے "اوئے" کہہ کر نہ بلایا۔" اس نے پوچھا کہ گاؤں کا نمبردار کون ہے۔ بھا نے چوہدری کا نام بتایا اور اُس کی حویلی کی طرف انہیں بھیج دیا اور خود بھا میرے پاس آیا۔ جب میں بھا کی دکان پر پہنچا تو پولیس کی آمد کی خبر گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھیں۔ ہر شخص اپنی اپنی عقل کے مطابق قیافہ لگا رہا تھا۔ کہیں چوہدری کے گھر پر چھاپا تو نہیں پڑ رہا۔ نہیں ـــــ اب انہیں اُس کے گھر

سے کیا ملے گا؟ ـــــ سب کچھ ٹھکانے لگ چکا ہو گا۔ اچانک چوہدری کا ایک آدمی دکان پر آیا۔ اس نے کہا چوہدری مجھے اپنی حویلی میں بلا رہا ہے۔ میرا دل دھڑکا میں نے پوچھا کہ چوہدری کو مجھ سے کیا کام ہے۔ چوہدری کے آدمی نے میرے کان میں کہا "وہ جو نتھو کی پوتی ہے نا' اس نے پلس بلوائی ہے۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میں کیا جانوں ماسٹر؟ وہاں چلو تو سب پتا چل جائے گا۔"

میں چوہدری کی حویلی میں پہنچا تو وہاں بابا حیات بھی موجود تھا اور چوہدری رحمت خان بھی۔ کچھ اور لوگ بھی جمع تھے۔ میں مدتوں بعد چوہدری کی حویلی میں آیا تھا۔ اس لئے مجھے وہاں اپنی موجودگی کچھ عجیب سی لگی۔ چوہدری پولیس والوں کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ ان کی لسّی پانی سے تواضع ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر چوہدری شہد بھری آواز میں بولا "عبدالرحمٰن' بیٹھ جاؤ۔" پھر اس نے حوالدار کی طرف متوجہ ہو کر کہا "عبدالرحمٰن پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ میرے بیٹے سلیمان کا ہم جماعت رہا ہے۔" بھلا حوالدار کو اس بات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ تاہم اس نے پوچھا "چوہدری انگریزی پڑھ سکتے ہو؟"

"جی ہاں! آٹھویں تک پڑھی تھی۔"

اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا کر پوچھا "اس کو پڑھ لو گے؟"

میں نے کاغذ پر ایک نظر ڈال کر کہا "جی نہیں! مجھے اتنی انگریزی نہیں آتی۔"

چوہدری نے کہا "حوالدار صاحب! جو بات آپ نے زبانی کی ہے۔ اس پر ہمیں پورا پورا یقین ہے۔"

"مسماۃ شمیم بیگم کو بھی تو یہاں آنا چاہئے۔"

میں نے حیران ہو کر چوہدری کی طرف دیکھا "حوالدار صاحب اللہ بخشے بابا نتھو کی پوتی شیماں کا ذکر کر رہے ہیں۔" اُس نے مسکرا کر کہا۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ تب میں نے حویلی میں ماہی ریشم اور شیماں کو آتے دیکھا۔ شیماں کو گاؤں میں آنے کے بعد دوسری بار دیکھ رہا تھا اور مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہو۔ گزشتہ چھ مہینوں سے میں نے شیماں کو جب بھی اپنی تصوّر کی نگاہوں کے سامنے دیکھا' وہ مجھے آنسو کا ایک قطرہ نظر آئی اور اس ایک قطرے کے لئے میں نے اپنی دنیا

کو زیر و زبر کر لیا تھا۔ آج مجھے وہ آنسو کا قطرہ نظر نہ آئی۔ سردیوں کی نرم نرم دھوپ میں وہ جس شان سے چوہدری کی حویلی میں آئی تھی' اس نے میرے دل پر ہیبت طاری کر دی تھی۔ اس لئے مجھے معلوم ہوا کہ میرے لڑکپن کی وہ گول چہرے والی لڑکی جس کے گلابی رنگ میں ہلکی ہلکی زردی بھی گھلی ہوئی تھی اور جس کی بڑی بڑی آنکھوں کی چمک میں سردیوں کی سنہری دھوپ کی نرمی تھی اور جن میں میں نے دکھ درد کی راکھ بھی اڑتی ہوئی دیکھی تھی' آج عورت بن کر فاتحانہ انداز سے مجمعے میں آن کھڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کے ساتھ وہ جسم بھی لگ گیا تھا جسے میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا جیسے چوہدری کی حویلی میں سرو کا بوٹا اگ آیا ہو۔ تب مجھے ساری دنیا پر غصہ آیا۔ میں نے سارے گاؤں پر ایک جلتی چبھتی نظر ڈالی۔ ہم نے گلاب کے پودے کو کنڈیاری سمجھ کر گاؤں کی کھیتی سے نکال پھینکا تھا اور مجھے اس وقت گاؤں کی ہر وہ لڑکی جس کی جوانی میری جوانی کے کندھے سے کندھا ملا کر پروان چڑھی تھی یا جسے میں نے ذرا فاصلے سے اپنی آنکھوں کے سامنے پروان چڑھتے دیکھا تھا' راکھ کا ایک ڈھیر نظر آئی' لہو سے خالی' مٹی کی مورت' بے چہرہ' بے جسم لڑکی۔ اب اس لمحے میں ان میں سے کسی کو نہ پہچانتا تھا حتیٰ کہ زینت کو بھی جس کے جسم سے میرے جسم کا ملاپ ہوا تھا اور اب وہ میرے بچے کی ماں بھی تھی۔

"مسماۃ شمیم بیگم کون ہے؟" حوالدار نے پوچھا۔

"یہی لڑکی جو آپ کے سامنے کھڑی ہے۔" چوہدری نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

حوالدار نے ایک نظر اس پر ڈالی اور وہ نظر اس کے چہرے پر گڑی کی گڑی رہ گئی۔ اس نے ذرا دیر بعد لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا "بی بی! میں تمہیں تمہارے مکان کا قبضہ دلوانے آیا ہوں۔"

اس کے بعد ہم شیماں کے آنگن میں کھڑے تھے اور میں نے دیکھا کہ ورکر اپنے دفتر سے اپنا سامان نکال رہا ہے اور چوہدری ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہے۔ حوالدار نے شیماں سے کہا "بی بی! مکان پر اپنا تالا لگا لو۔ کوئی تمہیں مکان میں جانے سے روکے تو تھانے میں خبر کر دینا۔"

تب حوالدار نے ایک کاغذ پر ہم گاؤں والوں کے دستخط کروائے' کچھ لوگوں سے انگوٹھے لگوائے اور ضابطے کی کاروائی پوری ہو گئی تو پولیس والے گاؤں سے چلے گئے۔

ہم گاؤں والے اس واقعے سے اتنے حیران تھے کہ اُس شام تھڑے کی محفل میں ہر زبان یوں بند رہی جیسے اس پر تالا لگ گیا ہو۔ دوسرے تیسرے دن زبانوں پر لگی گرہ ڈھیلی پڑی تو بھانت بھانت کی باتیں شروع ہو گئیں۔ جس کے منہ میں جو آیا اس نے کہہ دیا۔ "نتھو کی پوتی تو بڑی کائیاں نکلی۔ پتہ نہیں وہ کب گاؤں سے شہر گئی اور شہر سے گاؤں آئی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور وہ فوج والوں سے مکان کا پروانہ لے آئی۔ سنا ہے شہر میں کوئی آدمی ہے جو اس کی مدد امداد کرتا ہے۔ اس نے کوشش کی ہو گی ورنہ عورت ذات کا کیا کام کہ اتنا بڑا کام چٹکیوں میں ہو جائے۔ نہیں! یہ بات نہیں وہ خود فوج کے دفتر میں گئی ہو گی۔ آخر وہ شہر میں رہی اور منہ چٹ لگتی عورت ہے، اپنا دُکھڑا رویا ہو گا، کسی کا دل پسیج گیا ہو گا۔ عورت کے آنسو تو پتھر میں چھید کر دیتے ہیں۔ کسی کو کیا پتہ تھا کہ نتھو کی پوتی اتنی شکل مند نکلے گی۔ اس دن حویلی میں اُس کا جوبن کتنا نکھرا ہوا تھا کہ جس نے دیکھا حیران رہ گیا۔ کتنی شان سے کھڑی تھی جیسے دُنیا کی ہر چیز اُس کی ٹھوکر میں ہو!"

ماسی ریشم نے کہا "اونچے طُرّے والا گاؤں کا بادشاہ بنا پھرتا تھا۔ اس دن ایک بات بھی تو نہ کر سکا۔ بچاری لڑکی کو اپنا حق مل گیا۔"

"مل گیا ماسی پر کس قیمت پر؟ لوگوں کی باتیں سنیں تم نے؟"

"لوگ تو باتیں کرتے رہتے ہیں ماہنے! کسی کے منہ پر ہاتھ تو نہیں رکھا جا سکتا۔"

"ماسی! تو جیتی اور چوہدری ہارا پر مجھے صرف اتنا بتا دے کہ شیماں کو مکان کا پروانہ کیسے ملا؟"

"ماہنے! میں بتا دوں گی پر دل میں شک کا بیج پھوٹ پڑے تو اس کی جڑ پاتال تک جا پہنچتی ہے اور پودا بڑھ آئے تو جتنا کاٹو گے بڑھتا ہے۔ اچھا سن! میں، شیماں اور مستری کو لے کر شہر گئی۔ صبح اندھیرے ہم گاؤں سے نکلے۔ پوچھتے پاچھتے فوج کے دفتر میں جا پہنچے اور درخواست لکھوا کر بڑے صاحب کو پیش کی۔ وہ کوئی اللہ کا بندہ تھا جو اُس نے ہماری باتیں غور سے سنیں اور کہا "بی بی! جاؤ تمہارے ساتھ انصاف ہو گا۔" ہم رات گئے گاؤں لوٹے تھے۔ اب بتا تیرے دل سے کانٹا نکلا یا نہیں؟"

میں منہ سے کچھ نہ بولا پر ماسی نے میرے چہرے سے میرے دل کی بات پڑھ لی اور وہ مسکرانے لگی۔ مکان پر قبضہ ملنے کے بعد شیماں کا سارا کردار بدل گیا۔ وہ گویا قید سے باہر

نکل آئی۔ جس پرندے کو پنجرے کا دروازہ کھول کر کھلی ہواؤں میں اُڑا دیا جائے اُسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے اور دُنیا جہان کی ایک ایک چیز اُسے عجیب لگتی ہے اور پیاری بھی۔ یہی حال شیماں کا تھا۔ وہ دن میں کئی بار کبھی گلی کے اس موڑ پر نظر آتی، کبھی اس نکڑ پر۔ اس کے چہرے پر میں نے مدتوں بعد وہ ہنسی دیکھی تھی جو کبھی چکّی کے پاٹوں کے بیچ میں آ کر پس گئی تھی۔ میں نے دیکھا جیسے وہ گاؤں سے دیس نکالے اور گاؤں میں واپسی کے درمیانی عرصے کو بھول جانا چاہتی ہو۔ تب گلی کے ایک موڑ پر میرے کانوں میں ایک دھیمی سی آواز آئی "ماہنے!" میں نے سمجھا گلی نے میرے ساتھ شرارت کی ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہنسی کی ایک پھلجھڑی چھوٹی اور میرا بچپن زندہ ہو گیا۔ یکدم --- کبھی کبھی گزرے ہوئے لمحے یوں جاگتے ہیں جیسے کسی جادوگر نے پتھر کی مورتوں میں جان ڈال دی ہو۔ میں بچپن کی دُنیا میں یوں کھویا جیسے کبھی جوان ہی نہ ہوا تھا اور زندگی کی کسی کڑواہٹ کو میری زبان نے کبھی چکھا ہی نہ ہو۔ نہ اس کی بُرائی نے میری روح کو چھوا ہو۔ میں اس پرندے کی طرح ہلکی پھلکی اڑان کا مزا لینے لگا جسے اڑنے کے لئے ابھی ابھی پَر ملے ہوں۔

میں نے کہا "مجھے کس نے آواز دی ہے؟"

"تیرے بچپن نے۔" اندھے کنویں سے آواز آئی۔

"ماہنے! آج میرے آنگن میں نہیں آؤ گے گولیاں کھیلنے کے لئے؟"

یہ شیماں کی آواز تھی جو وقت کے دھارے میں بہتی ہوئی آئی تو میں نے چکّی کی آواز سنی اور مستری کو دیکھا جو کشکول لے کر ہر غیار سے پیار کی بھیک مانگ رہا تھا اور سلی کو جس نے گولیاں ہار کر میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

تب میں حیران ہوا۔ دھند میں لپٹا ہوا ایک سایہ میرے سامنے کھڑا تھا اور ایک لمحے کا سپنا صدیوں کی حقیقت میں ڈھل گیا تھا اور گلی تنہا اور ویران تھی جیسے لق و دق صحرا۔

"تم نے مجھے کیوں پکارا؟" میں نے دُھند میں لپٹے ہوئے سائے سے کہا۔

"تم اتنے اجنبی کیوں بن گئے ہو ماہنے؟"

"تم دیکھتی نہیں ہو کہ میرے اور تمہارے درمیان صدیوں کے کالے کوس آ گئے ہیں۔"

"نہیں --- میں تو وہی ہوں --- میں تو پھر اسی منزل پر کھڑی ہوں جہاں سے

ہمارے سفر کا آغاز ہوا تھا۔"

اس آواز میں کتنی مٹھاس تھی! اس جلوہ گرنی کے گیت کا جادو جو شہزادے کو موت کی نیند سلانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا "نہیں --- نہیں --- اب ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔ میں تمہارے جادو کا شکار نہیں بنوں گا۔"

تب گلی کا اندھیرا دور ہو گیا۔ روشنی کی چکاچوند میں میں نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ شیماں میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی زردی ملے گلابی چہرے پر فتح مندی کی آنچ تھی۔ اس کے گالوں کے عین درمیان آنچ کے شعلے لو دے رہے تھے اور ، انہی گال کے گڑھے میں ایک تل ڈوب ابھر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈوبنے ابھرنے لگا تو میں نے بوجھل میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا

"شیماں! مجھ سے کچھ کام ہے۔"

"نہیں ماہنے! کوئی کام نہیں۔"

"اپنے گھر میں اٹھ آئی ہو؟"

"کب کی! تم آج پوچھ رہے ہو۔"

"کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"نہیں تو---"

"گلی میں اس طرح کسی کا راستہ روکنا اچھا ہے کیا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"کس نے راستہ روکا ہے تمہارا ماہنے! ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والے اچانک گلی کے کسی موڑ پر آمنے سامنے آ جائیں، تو اسے راستہ روکنا کہتے ہیں؟" شیماں کی آواز میں غصّے کی کھنک تھی۔

"اب ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔"

"آج سے یا اُس وقت سے جب تم لوگوں نے مجھے یکے میں بٹھا کر گاؤں سے نکال دیا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تجھے کچھ بھی معلوم نہیں ماہنے؟"

"شیماں!" ماسی نے اپنے دروازے سے گلی میں جھانک کر اُسے بلایا۔

"آئی ماسی۔"

تب گلی سونی اور اداس ہو گئی۔ لق و دق جنگل کی طرح جہاں کسی پتے کی سرسراہٹ کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ اتنی گمبھیر خاموشی جیسے پتھرا گئی ہو۔ گلی کے دونوں طرف کی آوازیں مجھے بھینچنے لگیں تو میں نے گھبرا کر اس موڑ کو قطع کر لیا اور بھٹے پر آ کر پناہ لی جہاں پتھیروں کے کالے ننگے بدنوں پر پسینہ چمک رہا تھا۔ حالانکہ ابھی سردی میں دھوپ کی ذرا سی دبک پیدا ہوئی تھی۔

اس دن بھٹے کے مالک شیخ صاحب بھٹے پر آئے۔ انہوں نے مجھے خوشخبری سنائی کہ آج سے انہوں نے کاروبار میں مجھے شریک کر لیا ہے۔ میں اب بھٹے میں دو آنے کا حصہ دار تھا۔ سیٹھ عبدالرحمن --- میں نے مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے کہا "منشی عبدالرحمن! میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ بھی ایک کاروباری چال ہے۔ اب یہ کاروبار میرا بھی ہے اور تمہارا بھی۔" میں اس اچانک خوشی پر اپنے آپ سے باہر نہ ہوا۔ ایسا لگا جیسے بھٹے کی چمنی سے نکلنے والا دھواں میرے اور آسمان کے درمیان لٹک گیا ہو اور وہ کرنیں جو اس سے چھن چھن کر آ رہی تھی، ان میں دھوئیں کی سیاہی بھی شامل تھی اور خوشی کی دھوپ بھی جو کملا سی گئی تھی---

"اب گاؤں کی کہانی پھر میری کہانی بنتی جا رہی ہے۔" میں نے سوچا۔

"نہیں--- ایسا نہیں ہونا چاہئے---" میں نے اپنے دل سے کہا۔

"یہ دھواں جب چھٹے گا تو کہانی کا دھارا خود بخود کوئی موڑ لے لے گا۔"

پر وہ دھواں نہ چھٹا اور میں اپنے آپ سے بچنے کے لئے اس دھوئیں میں ڈوبا رہا۔ میں اب گاؤں میں بہت کم رہتا۔ رات کو بھٹے ہی پر پڑا رہتا اور تب اینٹوں کی نئی کھیپ کے پکنے پر گاہک ٹوٹ کر آئے اور مجھے اتنا کام پڑا کہ میں اپنے آپ کو بھول گیا۔ میں ایک ٹرک پر اینٹیں لدوا رہا تھا کہ ماسی چپکے سے میرے پاس آ کھڑی ہوئی اور مجھے اس کی آمد کی خبر بھی نہ ہوئی۔

"ماہنے!" ماسی کی آواز سن کر میں چونکا۔

"کہو ماسی!"

"مستری کی پانچ سات دن سے بتہ اک سنگ نہیں مل رہی۔"

"کسی کنویں، کسی کونے کھدرے میں تلاش کرو۔ نشہ کر کے کسی کونے میں پڑا ہو گا۔"

"میں سب جگہ اُسے ڈھونڈھ آئی ہوں ماہنے!"

"میں نے اُسے یہاں بھی نہیں چھپا رکھا۔ اسے کہیں اور تلاش کرو۔"

"ماہنے! تو کتنا بے لحاظ ہو گیا ہے۔"

"نہیں ماسی! دیکھو تو مجھے کتنا کام ہے۔"

"اچھا! تم کام کرو ماہنے! میں جاتی ہوں۔" ماسی نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

اس دن دوپہر کو عبدالغفار میرا کھانا گھر سے لے کر آیا تو اس نے ڈرے سہمے لہجے میں کہا "بھا! تم نے کچھ سنا؟"

"نہیں تو۔"

"مستری کی لاش ملی ہے۔"

"لاش!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ڈل سے۔ وہ جو ٹیکری کے پاس ہے۔"

"وہ وہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"کچھ پتہ نہیں بھا۔ لوگ کہتے ہیں وہ نشے میں وہاں چلا گیا اور کسی بھوت نے اسے ڈل میں پھینک دیا۔"

"مذاق مذاق میں؟" میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا بھا؟"

"نشئی کے ساتھ سبھی مذاق کرتے ہیں۔ اس بھوت نے بھی ایسا ہی کیا ہو گا۔"

میں مسکرانے لگا تو عبدالغفار مجھے بٹ بٹ تکنے لگا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ میں "موت" کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں حالانکہ موت سے ڈرنا چاہئے۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔ میں نے کہا "عبدالغفار! میں اس ٹیکری کے پاس سے کئی بار گزرا ہوں، مجھے وہاں کوئی بھوت نہیں ملا۔ مستری نشہ کر کے ادھر سے گزرا ہو گا۔ کیا پتہ اسے ڈل کا پتہ نہ لگا ہو اور وہ اس میں گر گیا ہو۔"

اس ٹیکری کے متعلق مشہور تھا کہ یہ کچی جگہ ہے اور یہاں جن بھوت رہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا جہاں کنکر روڑے بکھرے ہوئے تھے اور لال لال ٹھیکریاں بھی اور اس پر ببول اور بیری کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک غیر آباد کنواں تھا۔ پگڈنڈی اس سے کچھ فاصلے پر گزرتی تھی۔ مستری پگڈنڈی سے ہٹ کر چل رہا ہو گا۔ ڈل میں جا گرا۔

یہ بڑا ہولناک حادثہ تھا۔ نجانے کیوں اس خبر کو سن کر میں چونک نہ سکا لیکن آہستہ آہستہ جب میرے دماغ سے دھواں چھٹا تو میں کانپ گیا لیکن میں جلد گاؤں نہ جا سکا۔ میں رات پڑے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ گاؤں میں پولیس آئی ہوئی ہے۔ پولیس نے چوہدری کی حویلی میں گاؤں کے لوگوں کا اکٹھ کیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں گاؤں کا ہر آدمی مجرم تھا۔ میں بھی مجرموں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ تھانیدار لوگوں سے بیان لے رہا تھا اور لوگ ڈرے ہوئے تھے۔ کہیں آدھی رات کو تفتیش ختم ہوئی۔ پولیس نے مستری کی موت کو حادثہ قرار دیا اور ہم نے اگلے روز اسے مٹی کے سپرد کر دیا۔ مستری بے چارہ تو منوں مٹی کے نیچے دفن تھا لیکن گاؤں والوں نے ایک عرصے تک اُسے مرنے نہ دیا۔

"مستری نے خودکشی کیوں کی؟" ہر ایک کی زبان پر یہی سوال تھا۔

"اسے گھر میں پوچھتا کون تھا؟ نتھو کی پوتی کپڑے سی کر گزارہ کرتی ہے۔ اسے نشہ کہاں سے لا کر دیتی؟ کپڑے سی کر کیا کما لیتی ہو گی؟ سنا ہے اس شہریئے نے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے جس کے کارخانے میں مستری کام کرتا تھا۔ مرد آخر مرد ہوتا ہے، شرم سے کنویں میں ڈوب مرا ہے۔"

اس سارے معاملے میں چوہدری خاموش رہا۔ اُس کی خاموشی میں پتہ نہیں کیا اسرار تھا۔ ان دنوں میں نے سلیمان کو بھی گاؤں آتے جاتے نہ دیکھا۔ وہ لاہور سے آتا تو وہ زیادہ ٹیوب ویل پر رہتا۔ تب یہ پتھر بھی گاؤں کے گدلے جوہڑ میں ڈوب گیا۔ مستری کی موت کے بعد شیماں گاؤں کی خاموشی میں یوں سما گئی جیسے وہ مدتوں سے اس کا حصہ تھی اور میں نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا تو مجھے وہاں بھی گدلے جوہڑ کے ٹھہرے ہوئے پانی کی ایک تہہ نظر آئی مجھے اس سے اطمینان بھی نصیب ہوا اور ڈر بھی لگا۔ "ٹھہرے ہوئے پانی سے بو بھی آنے لگتی ہے۔"

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۱۹

○

تب اس سال کے آخر میں گاؤں پھر جاگا۔

ملک میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کرنے کے لئے پہلا چناؤ ہو رہا تھا۔ چند گ
پہلے تھڑے کی محفل میں پھر سے گرمی آ گئی۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ رحیم پور کے گاؤں
ملا کر ایک وارڈ بنا دیا گیا تھا۔ گاؤں میں یکایک دو پارٹیاں بن گئیں۔ ہماری پارٹی کے ل
تھڑے پر جمع ہوتے اور چوہدری کی پارٹی کے لوگ اس کے ٹیوب ویل پر محفل لگات
دونوں پارٹیوں کے جاسوس ایک دوسرے کی کن سوئیاں لیتے پھرتے۔ ہم نے اپنی پارٹی
طرف سے چوہدری رحمت خان کو کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا۔ سیالکوٹ جا کر اس کے کاغذا
پیش کئے۔ اس دن چوہدری بھی تحصیل کے دفتر میں موجود تھا اور سلیمان بھی۔ سلیمان کو
پتلون پہنے ہوئے تھے اور اس کے چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے کے انداز بدلے ہوئ
تھے۔ اس نے پہلے تو میرے ساتھ آنکھ نہ ملائی۔ پھر نجانے اس کے جی میں کیا آئی کہ
نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "چوہدری عبدالرحمن! گاؤں کا کیا حال ہے؟"

"سارا گاؤں خیریت سے ہے۔" میں نے خوشدلی سے جواب دیا۔

"سنا ہے آج کل گاؤں میں بڑی رونق ہے۔"

"ہاں! اپنے الرشن جو ہونے والے ہیں۔"

"الرشن!" سلیمان اس لفظ پر حیران ہوا۔

"بابا حیات الیکشن کو الرشن' ووٹ کو بوٹ اور وارڈ کو واٹ کہتا ہے۔" میں نے ہن
کر کہا۔ سلیمان نے میری ہنسی کا جواب ہنسی میں نہ دیا۔

"میرا مطلب کچھ اور تھا؟" اس نے کہا۔

"کیا مطلب تھا تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

"شیماں کے آنے سے گاؤں کی رونق بڑھ گئی ہو گی؟"

"ہاں! کیوں نہیں؟ گاؤں میں کوئی نیا آدمی آئے تو اس سے رونق بڑھتی ہے۔"

"سنا ہے اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور لڑکیوں نے بھی پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے

"تم نے کس سے سنا ہے؟"

"کسی سے بھی سنا ہو۔"

"میں نے تو کسی کو پر پرزے لگتے ہوئے نہیں دیکھے۔ سبھی زمین پر پاؤں رکھ کر
ی ہیں۔"

"عبدالرحمن! تم میری بات مذاق میں ٹال رہے ہو۔ تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی
ے بنتے ہو۔"

"چلو یہی بات سہی پھر؟"

"اگر یہی حال رہا تو دیکھنا گاؤں میں ایک دن ہیرا منڈی کھل جائے گی۔"

"ابھی تمہارے جیسا اور کوئی تماش بین گاؤں میں پیدا نہیں ہوا۔ جب ایک دو آدمی
ے چیلے چانٹے بن گئے تو کیا پتہ پورا گاؤں ہیرا منڈی بن جائے۔"

"تم اپنی چھوٹی چھوٹی دشمنیاں لینے کے لئے گاؤں میں ابا کی پوزیشن کمزور کر رہے
گاؤں پر ان کا رعب تھا' کوئی ان کے سامنے دم نہیں مارتا تھا۔ اب حالت یہ ہے کہ نتھو
ے کی پوتی چپکے سے گاؤں میں آتی ہے اور مکان پر قبضہ کر لیتی ہے۔ مستری ڈوب کر
ے تو کوئی اس سے کچھ نہیں پوچھتا۔"

"کس سے؟ مستری سے؟"

"عبدالرحمن! تم بھی جانتے ہو' میں بھی جانتا ہوں بلکہ سارا گاؤں جانتا ہے' مستری
د کشی نہیں کی تھی۔ اُسے کنوئیں میں گرا کر مارا گیا۔"

"کس نے گرایا اُسے؟"

سلیمان نے میرے سوال کا جواب سیدھے سادے انداز میں نہ دیا۔ اس نے کہا "ابا
ہتے تو شیماں کو تھانے کچہری میں پھراتے۔ اسے ملزموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتے
ں میں گاؤں کی بدنامی کا ڈر تھا اور اب تم اسی گاؤں سے ان کی چودھراہٹ ختم کرنے

پر تلے ہوئے ہو۔ یاد رکھو! اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔"

"سلیمان! تمہیں گاؤں کی فکر میں دُبلا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ گاؤں کو کچھ نہیں ہو گا۔ اصل بات الیکشن کی ہے۔ تم نہیں چاہتے کہ ہم چوہدری کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا کریں۔"

"ہمیں الیکشن میں کوئی خطرہ نہیں۔ مجھے ڈر صرف اس بات کا ہے کہ اس چوہدری سے گاؤں پر کسی کا کنٹرول نہیں رہے گا۔"

"اس خطرے کا روکنا اگر ضروری تھا تو تم نے ہمیں پہلے کیوں نہ کہا۔ تم بتا بلاتے۔ کیا پتہ ہم وہی فیصلہ کرتے جو تم چاہتے ہو۔"

"ہم بھکاری نہیں ہیں ماسٹر! ہم سینے کے زور سے الیکشن جیتیں گے۔"

"کون جانے کون الیکشن جیتے گا لیکن مجھے ایک خطرہ ضرور ہے، تم الیکشن کے لئے بیچاری شیماں کو ضرور بدنام کرو گے۔ صرف اتنا خیال رکھنا، وہ کبھی اس گاؤں کی بیٹی تھی اب وہ بیوہ ہے۔ مستری کو اُس نے نہیں مارا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ ہم اسے بچپن سے جانتے ہیں۔ بتاؤ کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟"

"ہر عورت ایسا کر سکتی ہے۔ انسان کو بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ کیا پتہ وہ مستری کو رستے سے ہٹا کر اس آدمی کے لئے رستہ صاف کرنا چاہتی ہو جو کارخانے کا مالک ہے اور اسے دنیا کا ہر سکھ چین دے سکتا ہے۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو سلی!" میں نے غصے میں آ کر کہا۔

سلیمان کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ہماری پارٹی کے لوگ کاغذات جمع کرا کے دفتر سے باہر آ گئے۔ سلیمان وہاں سے کھسک گیا تو چوہدری رحمت خان نے پوچھا۔ "تم میں کوئی جھگڑا ہو رہا تھا؟"

میں نے اسے سارا قصہ سنایا۔ چوہدری رحمت خان نے کہا۔ ہمیں ان کی چالوں سے بچنا چاہئے۔ اسے یقین تھا کہ چوہدری شرف دین شیماں کا معاملہ ضرور اٹھائے گا۔ اُس نے جس طرح مکان پر قبضہ کیا ہے، اس کا ذمے دار ہمیں ٹھہرائے گا اور اس بیچاری کو بدنام کر کے گاؤں والوں کو ہمارا مخالف بنائے گا۔

"پر اب چال کا جواب چال سے دینا ہو گا۔ غصے میں آ کر سارا کام چوپٹ ہو سکتا ہے

ماسٹر!" چوہدری رحمت خان نے کہا اور مجھے حیرت ہوئی کہ الیکشن کی مہم کا ابھی آغاز ہو رہا تھا اور چوہدری رحمت خان ایک سیدھے سادے جاٹ سے سیاست دان بن گیا تھا۔

سیاست دانی کا دور شروع ہوا تو کھیتوں کی مینڈھوں پر، کنوؤں پر، دکان کے تھڑے پر جہاں کہیں دو چار آدمی اکٹھے ہوتے الیکشن کی باتیں ہوتیں۔

چوہدری کے ٹیوب ویل پر اور اس کی حویلی میں اکثر اکٹھ ہوتے رہتے۔ ہماری پارٹی کا کوئی سرکردہ آدمی تو وہاں نہ جاتا لیکن وہاں کی خبریں ہمیں ملتی رہتیں۔ چوہدری ہر چھوٹے بڑے کے سامنے بچھ بچھ جاتا تھا۔ ہر وقت حقہ تازہ اور گرم رہتا۔ کڑوے تمباکو کے کش میں جو جادو ہے اس کا کوئی توڑ نہیں۔ سردیوں کے دن تھے، اس لئے آنے جانے والوں کی تواضع لسی کی بجائے چائے سے ہوتی اور چائے میں چینی ڈالی جاتی۔ انہیں دنوں چوہدری نے مسجد کے صحن میں پکی اینٹیں بھی لگوائیں اور نئی صفیں بچھائیں۔ یہ وعدہ بھی کیا کہ الیکشن کے بعد وہ مسجد میں نلکا بھی لگوا دے گا۔ اس کے ٹیوب ویل سے جن کسانوں کی زمینیں سیراب ہوتی تھیں، ان سے پانی کی قیمت میں کمی کا وعدہ بھی کیا۔ یہ بھی کہا کہ اگر میں ممبر ہو گیا تو پرائمری سکول کے لئے عمارت ضرور بنواؤں گا۔

"میں جب سردی گرمی، دھوپ، بارش میں بیچارے ننھے ننھے بچوں کو تکیے میں درختوں کے سائے تلے جتا، بھیگتا اور ٹھٹھرتا ہوا دیکھتا ہوں تو سچ جانو، مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔"

اس نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ گاؤں میں بچیوں کی تعلیم کے لئے بھی کوئی سکول ہونا چاہئے۔ ہم حکومت کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے ورنہ سیلاب کے بعد نتھو مرحوم کے مکان کو جو میں نے ٹھیک ٹھاک کرایا تھا تو اس نیت کے ساتھ کہ میں ان کمروں میں لڑکیوں کے لئے سکول کھلوا دوں گا۔ پر اب تو کوئی اور سبیل سوچنی پڑے گی۔ بیچاری بیوہ لڑکی کو ہم دیس نکالا بھی تو نہیں دے سکتے۔"

اس بات میں لوگوں نے بڑی دلچسپی لی۔ چوہدری کو بھانت بھانت کے مشورے ملے۔ کسی نے کہا "نتھو کی پوتی کو کہیں حق کر لینا چاہئے۔ جوان جہان لڑکی ہے۔ اتنی لمبی بیوگی کیسے کاٹ سکے گی۔ کسی کا خیال تھا کہ اسے جب ایک بار گاؤں سے نکال دیا گیا تھا تو اس کا واپس گاؤں میں لانا اچھا نہیں تھا۔ یہ کلنک کا ٹیکہ اُسی کے ماتھے پر نہیں لگا، سارے گاؤں کے ماتھے پر لگا ہے۔ ہم بے غیرت ہیں۔ بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ آخری تین ماہ ریشم پر

ٹوٹی۔ چوہدری نے کہا "جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ریشم تو سدا کی جھلی ہے پر دل کی بری نہیں۔ کیا پتا کوئی اسے اُس وقت روک دیتا تو ایسا نہ ہوتا۔ میرا خیال ہے کچھ لوگوں نے اندر خانے ریشم کا ساتھ دیا ہو گا ورنہ ریشم کو نتھو کی پوتی کو گاؤں میں لانے کی جرات نہ ہوتی۔"

"وہ کون لوگ ہیں چوہدری؟" لوگوں نے پوچھا۔

"بس پردہ ہی پڑا رہنے دو چوہدریو! جو ہوا اس پر مٹی ڈالو۔ اب سوچو آگے کیا ہو گا؟" چوہدری نے گھمبیر انداز میں کہا۔

کسان حقے کی نے ایک طرف کو سرکا کر اس کی طرف حیرت سے تکنے لگے۔

"کیوں چوہدری آگے کیا ہو گا؟" ایک کسان نے پوچھ ہی لیا۔

"کوئی بات خود بھی سوچنے کی کوشش کرو یا ساری باتیں میرے منہ سے کہلواؤ گے۔ نہیں چوہدریو! میں اور کچھ نہیں کہوں گا' منہ سے نکلی بات کوٹھوں چڑھ جاتی ہے۔"

یہ اشارہ بڑا باریک تھا۔ لوگ سوچنے لگے اور آخر دوسرے تیسرے اکٹھ پر چوہدری نے اس بھید پر سے پردہ اٹھا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ شیماں کی وجہ سے گاؤں کی لڑکیاں خراب ہو رہی ہیں۔ وہ شہری فیشن کے کپڑے پہننا سیکھ رہی ہیں۔ اس کے گھر جا کر سینا پرونا کاڑھنا سیکھتی ہیں۔

"دیکھ لینا کوئی گل ضرور کھلے گا۔"

ہمارے دھڑے کی ایک محفل میں یہ خبر پہنچی تو چوہدری رحمت خان نے کہا "مانے! میری بات سچ نکلی نا۔ دیکھ لی چوہدری کی سیاست۔"

بابا حیات نے کہا "گاؤں میں تو اس کا دھڑا مضبوط ہو رہا ہے۔ رحمت خان! تم رحیم پور کے ووٹ توڑنے کی کوشش کرو۔"

میں الیکشن کی کہانی کو لمبا نہیں کروں گا اگرچہ یہ کہانی مزیدار ہے۔ قصہ مختصر رحیم پور میں رحمت خان کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی لیکن گاؤں میں ہماری حالت پتلی تھی۔ گاؤں والے کسی بڑی تبدیلی کو پسند نہیں کرتے۔ مدتوں سے چوہدری کے خاندان کو گاؤں کی سرداری حاصل تھی۔ لوگ اس کے بزرگوں کو بڑا جانتے چلے آ رہے تھے۔ گاؤں میں سب سے زیادہ زمین انہی کے پاس تھی۔ سیدپور کا ذیلدار اس کا سمدھی تھا۔ یونین کونسل بھی سیدپور میں قائم ہوئی تھی۔ ذیلدار کے بڑے بیٹے کا ممبر بننا یقینی ہے۔ ممبر بن کر وہی یونین

کونسل کا چیئرمین بھی ہو گا۔ چوہدری اس صورت حال کا فائدہ بھی اٹھا رہا تھا۔ اس کا پلڑا بھاری تھا۔ اس نے گاؤں والوں کے دل میں یہ بات بھی بٹھا دی تھی کہ اگر رحمت خان ممبر بن بھی گیا تو وہ گاؤں کی بہتری کے لئے کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ ہمارے پاس اس دلیل کا کوئی توڑ نہیں تھا یوں بھی سیاسی طور پر چوہدری رحمت کا قد چوہدری شرف دین کے برابر نہیں تھا لیکن جاٹ کی ضد مشہور ہے۔ ہم نے سوچا کہ اب جو قدم اٹھ گیا ہے' وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔

تب ایک واقعہ ہوا جس نے سیاست کا پلڑا ہمارے حق میں جُھکا دیا۔ ایک دن افواہ اڑی کہ بجلی گاؤں سے غائب ہے۔ یہ پتا نہ لگا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ ابھی اس کی تصدیق بھی نہ ہو سکی تھی کہ معلوم ہوا وہ گاؤں لوٹ آئی ہے۔ چوہدری کے دھڑے کے کچھ آدمی ہمارے پاس آئے کہ اب موقع ہے' اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ چوہدری رحمت خاں نے کہا "نہیں! میں ووٹ لینے کے لئے گاؤں کی ایک بیٹی کی بدنامی سے فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔" وہ لوگ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ جب گاؤں میں چوہدری رحمت خان کی یہ بات پھیلی تو اکثر لوگوں نے کہا "رحمت خان کے خون خمیر میں کوئی کھوٹ نہیں۔ ہم اسے ووٹ دیں گے۔"

افواہ کو پر لگ جائیں تو اس کی سرسراہٹ ہر کان سنتا ہے۔ ہم نے اس کی طرف سے کان بند کرنے چاہے پر ہم اس سرسراہٹ کا گلا نہ گھونٹ سکے۔ چوہدری اپنے شک کے جال میں پھنس گیا۔ اُس نے سوچا کہ دوسرا دھڑا اس افواہ کو پھیلا رہا ہے۔ اُس نے ہمیں پیغام بھیجا کہ دشمنی اس طرح نہیں لی جاتی' جو کہنا ہے کھُل کر کہو۔ ہم پھر بھی خاموش رہے تو اُس نے بجلی کے باپ کو ہمارے ہاں بھیجا۔ رات کا وقت تھا اور چوہدری رحمت خاں کے گھر میں محفل لگی تھی۔ بجلی کا باپ گرجتا برستا آیا۔ اَس نے کہا "رحمت خاں! تم لوگوں سے ووٹ لینے کے لئے میری بیٹی کو بدنام کر رہے ہو۔"

"نہیں تو۔" چوہدری رحمت خاں بولا "ہم سے قسم لے لو جو ہم نے کبھی کوئی ایسی بات کی ہو۔"

اُس نے ہمیں ایک بڑی سی گالی دی تو میں نے کہا "چچا! طیش میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ یقین کرو ہم تو خود اس قصے کو جھوٹ سمجھتے ہیں۔"

"موج دین کے بیٹے! سارے فساد کی جڑ تو ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس جھوٹے قصے کو

تو ہوا دے رہا ہے۔"

چوہدری کے دھڑے کے کچھ آدمی ہمارے پاس آئے کہ اب موقع ہے' اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا "چچا! تم نے جس سے سنا ہے' جھوٹ اس نے بولا ہے۔ وہ بھُس میں چنگاری ڈال کر آگ کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔ ویسے بہتر ہے کہ تم اپنی لڑکی کا خیال رکھو اور یاد رکھو لوگوں کی زبان کوئی پکڑ نہیں سکتا۔"

اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور چلا گیا۔

ہمارے گاؤں میں کوئی ایسی عمارت نہ تھی جہاں پولنگ سٹیشن بنتا۔ چنانچہ ہمیں ووٹ دینے کے لئے گل بہار کے پرائمری سکول میں جانا پڑا۔ اس دن صبح سویرے گل بہار میں میلہ سا لگ گیا۔ ہمارے گاؤں اور رحیم پور کے لوگ دُھلے کپڑے پہن کر آئے۔ نوجوان تو خوب بن ٹھن کر آئے تھے۔ سر پر چیرے اور ہاتھ میں لاٹھیاں۔ گاؤں کی عورتیں بھی آئیں اور ان کے ساتھ بچے بھی۔ گل بہار کے ایک دکاندار نے سکول سے باہر ایک تخت بچھا کر اس پر چنے ریوڑیاں اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں رکھ لی تھیں۔ ایک اور دکاندار پکوڑے بھی تل رہا تھا۔ ان دونوں جگہوں پر بچوں کا ہجوم تھا۔ گل بہار کے لوگ بھی میلہ دیکھنے کے لئے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ ان کے وارڈ کا پولنگ بھی اگلے دن اُسی سکول میں ہونا تھا۔

چوہدری نے اپنا کیمپ سکول کے قریب ایک مکان کے صحن میں لگایا تھا۔ وہ چائے کی دیگ پکانے کے لئے نائی کو ساتھ لے آیا تھا۔ سیدپور سے اس کا داماد بھی آیا تھا۔ چوہدری کے کیمپ میں لوگوں کا بڑا ہجوم تھا۔ حقہ چل رہا تھا اور چائے اُڑ رہی تھی۔ ہم نے سکول سے باہر کچھ فاصلے پر دو چار چارپائیاں بچھائیں اور زمین پر ایک دو چٹائیاں بچھا دیں۔ چوہدری کے کیمپ کا ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر ہمارا جو ووٹر ہمارے کیمپ میں آتا' اس کا منہ لٹک جاتا۔ ہم بھی کچھ مایوس سے ہو گئے۔ لوگ رونق میلے سے بڑا اثر لیتے ہیں۔ ہمارے کیمپ کی سادگی کو دیکھ کر گل بہار کے لوگوں نے ہمارا مذاق بھی اُڑایا۔ "یہ کیمپ ہے یا کسی کا فاتحہ پڑھا جا رہا ہے۔" گل بہار کے نمبردار نے ہمارے کیمپ میں آ کر کہا "رحمت خاں! بڑا افسوس ہے کہ تو مجھ سے ملا تک نہیں میں تیرے لئے بھی کسی مکان میں کیمپ لگوا دیتا۔ اب بھی

اگر کہو تو کچھ چارپائیاں بچھوا دوں۔"

"نہیں چاچا! تیری مہربانی۔ جن جن دوستوں نے مجھے ووٹ دینے ہیں' وہ زمین پر بیٹھ کر بھی میرے ہی رہیں گے۔"

نمبردار کے جانے کے بعد اس نے کہا "ماہنے! وہ لوگ کدھر گئے جو ہمیں کل تک ووٹ دینے کا یقین دلاتے رہے۔"

"دلوں کی بات کون جان سکتا ہے چچا!" میں نے کہا۔

ہم نے اپنے کیمپ میں عبدالغفار کو پرچیاں کاٹنے پر لگایا اور چوہدری کے کیمپ میں اس کے داماد کا چھوٹا بھائی پرچیاں کاٹ رہا تھا۔ سلیمان کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ چوہدری رحمت خاں کا ایجنٹ میں تھا اور چوہدری شرف دین کا ایجنٹ اس کا داماد۔ ہمارا امتیازی نشان ہل تھا اور چوہدری کا بیل۔ ہل اور بیل کا آپس میں وہی تعلق ہوتا ہے جو جسم کا جان سے پر آج وہ ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ ہمیں اپنے ووٹروں کو بہت سکھانا پڑھانا پڑا کہ ووٹ کس طرح صندوقچی میں ڈالنا ہے اور صندوقچی کی پہچان کیا ہے۔ وہ بیچارے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ووٹ کسے کہتے ہیں اور یہ کیوں دیا جاتا ہے۔ ہم نے ان کے سامنے ووٹ کو پرچی کہنا شروع کیا تو ان کی سمجھ میں کچھ کچھ آیا۔

پولنگ سٹیشن نو بجے کھلنا تھا۔ ایک حوالدار اور پولیس کے دو تین سپاہی پہنچ چکے تھے اور وہ سکول کی عمارت کے نزدیک کسی کو پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ چوہدری اپنے کیمپ سے نکلا۔ اس نے اردگرد نظر ڈالی۔ وہ لٹھے کے سفید تہبند اور بادامی رنگ کے بوسکی کے کُرتے میں بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ اس کی کلف لگی پگڑی کا طرہ ہمیشہ کی طرح اُونچا تھا۔ اس نے دُور سے ہمارے کیمپ کو دیکھا اور نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ وہ بڑے وقار سے ٹہلتے ٹہلتے ہمارے کیمپ تک پہنچ گیا۔ اس نے چند گنے چنے آدمیوں کو یہاں بیٹھے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس نے ذرا دُور سے ہمارا حال چال پوچھا تو چوہدری رحمت خاں نے کہا "آؤ چوہدری! بیٹھو۔"

"نہیں رحمت خان! پولنگ شروع ہونے والا ہے' خیال ہے کہ پہلے عورتوں کو بھگتا لیا جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ انہیں جلدی فارغ ہونا چاہئے۔"

"تمہارا ایجنٹ تو عبدالرحمٰن ہو گا؟"

"ہاں!"

"عبدالرحمٰن! ہار جیت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"اس وقت تو لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔

"میری بات تو سن لو ـــــ میرا مطلب ہے' دونوں طرف سے کوشش ہونی چاہئے کہ کوئی جعلی ووٹ بھگتنے نہ پائے۔"

"چوہدری! اس طرف سے کوئی جعلی ووٹ نہیں بھگتے گا۔" چوہدری رحمت خاں نے کہا۔

اس نے ایک نظر ہمارے ووٹروں پر ڈالی اور مسکرا کر کہنے لگا "ہاں! مجھے بھی ایسا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ یہ جو لوگ تمہارے پاس بیٹھے ہیں' ان میں سے کوئی جعلی نہیں ہے۔ میں ان سب کو جانتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے کیمپ کی طرف پلٹ گیا۔ چوہدری رحمت خاں نے میری طرف دیکھ کر کہا "آج چوہدری کا دل کتنا بڑا ہو گیا ہے! چلو شکر ہے کبھی تو اس میں بڑائی نظر آئی۔"

"دل میں جیت کا یقین ہو تو چھوٹا دل بھی بڑا ہو جاتا ہے۔"

میں پولنگ سٹیشن کے اندر چلا گیا۔ پولنگ افسر ہمارے علاقے کا اے۔ ڈی۔ آئی تھا۔ وہ مجھے جانتا تھا لیکن اس نے میرے ساتھ آنکھیں نہ ملائیں۔ اس کے ماتحت کام کرنے والے دونوں ماسٹر ہمارے سکول کے تھے۔ یہ دونوں چوہدری کے نمک خوار تھے۔ ان میں سے ایک تو اسی کی حویلی میں رہتا تھا۔ چوہدری کے داماد نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "چوہدری عبدالرحمٰن! تم نے پولنگ کروا کے خواہ مخواہ حکومت کا خرچ کروایا۔"

"چوہدری اگر بلا مقابلہ منتخب ہو جاتا تو اس میں کیا مزہ آتا؟" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ پر چوہدری رحمت خاں سے تو پوچھ لیا ہوتا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ تم لوگ پتا نہیں اس سے کون سی دشمنی لے رہے ہو؟ سچ ہے شریکوں کی چالیں بڑی باریک ہوتی ہیں۔ یہ تو اس گیدڑ والی بات ہوئی نا جسے شریک شیر کے مقابلے میں لے آئے تھے اور بیچارے کو مفت میں لہولہان کرا دیا تھا۔"

میری آنکھوں میں غصے کی چمک دیکھ کر پولنگ افسر نے میز پر ہاتھ مارا اور اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا "اب پولنگ شروع کیوں نہ کر دیا جائے۔ دروازہ کھول دو۔"

پہلی عورت جو اندر داخل ہوئی' وہ چودھرائن تھی۔ ماسٹر نے ووٹ کی پرچی کاٹی اور اس کے ہاتھ میں تھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے۔"

چودھرائن نے ساتھ کے کمرے میں جا کر پرچی صندوقچی میں ڈالی اور دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی۔ دوسری عورت ہماری طرف سے آئی۔ یہ ماسی ریشم تھی۔ ماسٹر نے اس کے ہاتھ سے پرچی لی اور پوچھا "تمہارا نام مسماۃ ریشم بی بی ہے؟"

"تو کیوں پوچھتا ہے؟ پرچی پر جو لکھا ہے' اسے پڑھ نہیں سکتا؟"

"مائی قاعدے قانون کا خیال بھی تو رکھنا پڑتا ہے۔" پولنگ افسر نے کہا۔

"مائی ہو گی تمہاری کوئی لگتی ساتی۔ مجھے گاؤں میں سب ماسی کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "ماسی! جھگڑا کیوں کرتی ہو؟"

"بی بی! تیرے خاوند کا کیا نام ہے؟" ماسٹر نے پوچھا۔

"تو کچہری کر رہا ہے منشی یا ووٹ لے رہا ہے؟ پرچی پر جو لکھا ہے' وہی اس کا نام ہے۔"

"نام تو بتانا پڑے گا مائی!" پولنگ افسر نے کہا۔

میں نے کہا "جناب! ماسی اپنی زبان سے اپنے خاوند کا نام نہیں لے گی۔"

"پھر اُسے ووٹ کی پرچی بھی نہیں ملے گی۔"

"کیوں نہیں ملے گی؟" ماسی نے اُسے گھور کر دیکھا۔ "تیرے گھر سے آئی ہے؟ سرکار کا مال ہے۔"

میں نے چوہدری کے داماد کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا "میں تمہارے گاؤں کی عورتوں کو نہیں پہچانتا۔"

"پھر تم چوہدری کے ایجنٹ کیوں بنے؟" میں نے پوچھا۔

پولنگ افسر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "تمہارے خاوند کا نام علم دین ہے نا مائی؟"

ماسی نے پھر اُسے گھور کر دیکھا۔ پولنگ افسر نے آنکھیں جھکا لیں۔ ماسی نے میری طرف دیکھا میں نے سر ہلا دیا۔

ماسی نے دھیمی سی آواز میں کہا "ہاں! اس کالے منہ والے کا ہی بم تھا۔"

پولنگ افسر کا حیران چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ ووٹ کی پرچی دینے والا ماسٹر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ماسی نے کہا "منشی! پڑھ لکھ کر یہی تمیز سیکھی ہے تم نے؟ بچارے بچوں کو بھی یہی سکھاتے ہو گے؟ اصل میں تو چوہدری کی روٹیاں توڑ توڑ کر ساری تمیز بھول گیا ہے۔" اُس نے ووٹ کی پرچی جلد جلد اس کے ہاتھ میں تھمائی اور ساتھ کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں کیا ہے؟"

"وہاں صندوقچیاں ہیں بی بی! ایک پر ہل کی تصویر لگی اور دوسری پر بیل کی۔ جس میں تمہارا جی چاہے، پرچی ڈال دینا۔" پولنگ افسر نے کہا۔

خدا خدا کر کے ماسی کا ووٹ بھگتا۔ عورتوں نے ایسے ہی اور کئی لطیفے کئے۔ ہماری طرف کی ووٹر عورتیں جلد بھگت گئیں۔ چوہدری کی طرف سے عورتیں آتی رہیں اور میراثی بیٹھتا رہا۔ چوہدری کا دلالو مسکراتا رہا۔ بعدازاں مردوں کی باری آئی۔ کوئی تین گھنٹوں کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب اِکّا دُکّا ووٹر آ رہے تھے اور وقت گزرنے میں نہیں آ رہا تھا۔ چار بجے کے قریب پولنگ افسر نے سکول کے صحن کا جائزہ لیا۔ صحن خالی تھا۔ پورے چار بجے اس نے ووٹنگ بند کر دی اور کہا "امیدواروں کو بلاؤ۔" پولیس کا ایک سپاہی انہیں بلا لایا۔ چوہدری بڑی شان سے اندر آیا۔ اُس نے رحمت خاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اُس نے اندر آ کر کہا "رحمت خاں میرا بھائی ہے۔ یہ جیتے یا میں جیتوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ناخن سے گوشت جدا ہو سکتا ہے لیکن بھائی بھائی سے جدا نہیں ہو سکتا۔"

پولنگ افسر نے کہا "یہی جمہوریت کی روح ہے۔ اگر سب لوگ آپ کی طرح سوچنے لگیں تو پھر اس ملک میں جمہوریت کا مستقبل بڑا روشن ہے۔" دانائی کی یہ بات کہہ کر وہ اُٹھا اور اندر سے صندوقچیاں اٹھا لایا۔ دونوں امیدواروں سے اُس نے کہا "دیکھ لیجئے، ان کی مہریں تو صحیح ہیں۔"

"ٹھیک ہیں۔" چوہدری نے کہا۔

اس نے ایک کاغذ پر چوہدری سے دستخط کرائے اور رحمت خاں سے انگوٹھا لگوایا۔ اُس نے پہلے چوہدری کی صندوقچی کی مہر توڑ دی۔ اُس کو الٹا کر پرچیاں میز پر انڈیل دیں۔ پھر

اُس نے پرچیاں گنتی شروع کر دیں۔ ایک—— دو—— تین—— اور گنتی کا یہ سلسلہ بہت لمبا ہو گیا۔ ایک سو کے بعد کے دوسرا سو اور چوہدری کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ دو سو اکاون—— پولنگ افسر نے آخری پرچی گن کر چوہدری کی طرف دیکھا۔

"بس!" چوہدری نے کہا۔

"جو کچھ ہے، آپ کے سامنے ہے۔ دوبارہ گنتی کر لوں۔"

دوبارہ گنتی پر بھی دو سو اکاون پرچیاں نکلیں تو چوہدری کے چہرے کی چمک بجھ سی گئی۔

ایک ماسٹر نے ایک کاغذ بھر کر چوہدری کے سامنے رکھا۔ اَس کے دلالو نے کاغذ پڑھا اور چوہدری نے اس پر دستخط کر دیئے۔

اب چوہدری رحمت خاں کی قسمت کی تھیلی کھلی۔ میز پر پرچیوں کی ڈھیری لگ گئی۔ گنتی شروع ہوئی۔ ایک سو۔ دو سو۔ دو سو پچاس—— میں نے چوہدری کی طرف دیکھا۔ اُس کے ماتھے پر ایک رگ کانپ رہی تھی اور اس کے چہرے پر راکھ اڑ رہی تھی—— اکاون—— میں اس سے آگے نہ سن سکا۔ مجھے ڈر لگا کہیں چوہدری کے دل کی حرکت نہ رک جائے۔ باون—— ترپن—— چوہدری نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ "بس بس! میں نہیں سن سکتا۔ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو اُس کے دلالو نے اُسے روک لیا۔ "چچا کیا کر رہے ہیں آپ؟" چون۔ پچپن۔ تین سو—— تین سو ایک پر چوہدری رحمت خاں کی ڈھیری ختم ہو گئی۔ میں نے چوہدری رحمت خاں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ جب تک کاغذی کارروائی مکمل ہو، کمرے میں اندھیرا چھا چکا تھا اور لالٹین روشن ہو چکی تھی۔ لالٹین کی لال لال روشنی میں مجھے کمرے کا منظر عجیب سا لگا۔

چوہدری چند لمحوں کے اندر اندر بوڑھا ہو چکا تھا اور اُس کی خضاب لگی مونچھوں کی نوکیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ اُس کا طرہ ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ پولنگ افسر خود بھی حیران تھا اور اس کے ماتحت دونوں ماسٹر میری آنکھ سے آنکھ نہیں ملا رہے تھے۔ پولیس کا حوالدار بھی پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

تب پولنگ افسر نے کہا "چوہدریو! میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ سب کے ساتھ انصاف ہو۔ حکومت بھی یہی چاہتی تھی۔ اب چاہیئے کہ آپ ایک دوسرے

کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھائیں۔"

"میں چچا کی طرف سے چوہدری رحمت خاں کو مبارکباد کہتا ہوں۔" چوہدری کے والد نے کہا۔

"نہیں —— رحمت خاں میرا دشمن ہے —— میں اس سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔" چوہدری نے کہا۔ اُس نے رحمت خاں کو اور مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں آگ بھری تھی۔ جو ہم سوکھی گھاس کا ڈھیر ہوتے تو دھڑ دھڑ جل جاتے۔ اُس وقت میں نے سوچا "جب ملک کی سیاست ہمارے گھروں کی چوکھٹ پار کر کے ہم تک آ پہنچی ہے۔ خدا خیر کرے۔ دور آگ جل رہی ہو تو اس کی لپٹیں ہم تک نہیں پہنچتیں۔ اب اس آگ میں جانے کون کون جلے۔"

گاؤں کا بھرائیں الیکشن کے اس جھگڑے میں غیر جانبدار رہا تھا۔ یہ تو وہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے کس کو ووٹ دیا تھا لیکن اب تک نہ وہ ہمارے کیمپ میں آیا تھا نہ چوہدری کے کیمپ میں اُسے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ جب ہم سکول کی عمارت سے نکل کر کھیتوں میں پہنچے تو اچانک ڈھول پر "ڈگا" لگا۔ چاند کی مدھم روشنی میں نوجوانوں نے اس کے گرد حلقہ بنا لیا اور ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالنے لگے۔ ہم بھنگڑا ڈالتے ہوئے گاؤں پہنچے۔ وہ رات ہم نے جاگ کر کاٹی۔ اگلے دن کا سورج نکلا تو یوں لگا جیسے یہ سورج ہم نے پہلی بار دیکھا ہو۔

اب میں اس قصے کو سمیٹتا ہوں۔

یوں لکھنے کو بہت سی باتیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں مثلاً" بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کا سیالکوٹ میں تربیت حاصل کرنا' چوہدری رحمت خاں کا مذاق میں کہنا کہ بڑھے طوطوں کو پڑھنا پڑ گیا ہے' ورکر کا یونین کونسل کا سیکرٹری لگنا' سیدپور کے ذیلدار کے بڑے لڑکے کا چیئرمین بننا' چوہدری رحمت خاں کی ہر تجویز کی خواہ مخواہ مخالفت کرنا' ایوب خاں کا صدر منتخب ہونا' یونین کونسل کے نامزد ممبروں کی فہرست میں میرا نام آنا لیکن چوہدری کی کوشش سے میرے نام کا خارج ہونا' مجوزہ ٹیکسوں کی تفصیل سے لوگوں کی گھبراہٹ' چولہا ٹیکس' مویشیوں اور مرغیوں پر ٹیکس' شادی بیاہ' پیدائش پر ٹیکس' شاملات دیہہ مثلاً" گاؤں کے قبرستان اور تکیے کے درختوں کا یونین کونسل کی تحویل میں جانا وغیرہ وغیرہ۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بنیادی جمہوریت بھی ایک قسم کی پنچایت ہے۔ لیکن پنچایت کے انتخاب نہیں

ہوتے تھے اور وہ کوئی ٹیکس نہیں لگا سکتی تھی۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ گاؤں کا چوکیدار ہمارا افسر بن گیا۔ وہ چولہا ٹیکس جس رعب سے اکٹھا کرتا' اس پر ہمیں حیرت بھی ہوتی اور غصہ بھی آتا۔

ان ٹیکسوں کے علاوہ یونین کونسل کو سرکار کی طرف سے امداد بھی ملتی تھی۔ سیدپور کے ذیلدار کا گھرانا خاصا مالدار تھا لیکن لالچ کا خدا برا کرے کہ یونین کونسل کا چیئرمین فنڈوں کو ہڑپ کرنے کی کوشش میں اتنا دلیر ہو گیا کہ چوہدری رحمت خاں کو اس کے خلاف مہم چلانی پڑی۔ اس کے جواب میں اُس نے اپنے ہی گاؤں سیدپور کی گلیاں پکی کرنے میں سارا فنڈ خرچ کر دیا اور یونین کونسل میں شامل دوسرے گاؤں منہ دیکھتے رہ گئے۔ بنیادی جمہوریتوں کے زمانے میں ہمارے گاؤں کی ایک گلی بھی پکی نہ ہوئی اور نہ سکول کی عمارت کے لئے ہماری کوئی کوشش کامیاب ہوئی تو چوہدری نے کہا "دیکھ لیا مجھے ہرانے کا نتیجہ۔"

اُنہیں دنوں گاؤں میں اشتمال اراضی کے لئے ہماری درخواست منظور ہو گئی۔ چوہدری رحمت خاں نے اس کے لئے بڑی تگ و دو کی تھی۔ میں بھی اس کوشش میں اس کا پورا پورا ساتھ دیتا رہا۔ چونکہ چوہدری کو اپنی بکھری ہوئی زمین اپنے ٹیوب ویل پر اکٹھی کرنے کا بہت فائدہ تھا' اُس نے ہماری مخالفت نہ کی لیکن جب اشتمال کے پٹواری نے ہمارے گاؤں میں قدم رکھا تو چوہدری نے اُسے یوں اُچک لیا جیسے شکرا چڑیا کو۔ چوہدری نے اُسے اپنے ٹیوب ویل پر رہنے کو جگہ دی۔ جب اُس نے کام شروع کیا تو چوہدری اس پر کڑا پہرہ دیتا رہا کہ کہیں ہمارا اس پر سایہ بھی نہ پڑ جائے۔

اشتمال کا کام بہت لمبا ہوتا ہے۔ پٹواری جوں کی چال چلتا ہے اور چھچھوندر کی طرح اندر ہی اندر سرنگ لگاتا ہے۔ اس لئے گاؤں کا ہر کسان اُس سے ڈرتا ہے اور اُس سے دوستی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جس کنوئیں پر آتا ہے' لوگ اُس کے سامنے بچھ بچھ جاتے ہیں۔ وہ سب کا دوست بن جاتا ہے اور کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ ہمارا پٹواری نوجوان تھا۔ سانولے رنگ کا ہنس مکھ لڑکا۔ وہ جس سے بھی ملتا' اسے اپنا بنا لیتا۔ وہ چوہدری شرف دین کا دوست بھی تھا اور چوہدری رحمت خاں کا خیر خواہ بھی۔ وہ دکان کے تھڑے پر باقاعدگی سے آتا اور اخبار پڑھتا۔ اُسے ملکی سیاست سے بھی دلچسپی تھی اور دو چار مہینوں کے اندر اندر وہ گاؤں کی سیاست سے بھی پورا پورا واقف ہو چکا تھا۔

نہ جانے کیا بات ہے، سارے گاؤں میں میں ہی ایک شخص تھا جس سے اس کی
بھیگ نہ سکی تھی۔ ظاہر میں ہمارے درمیان ہنسی مذاق کا چولہ ہوتا لیکن جب تک ہم دونوں
محفل میں بیٹھتے رہتے، ایک دوسرے کو ریلتے دھکیلتے رہتے۔ میں اس کی موجودگی میں ایک
عجیب بے کلی سی محسوس کرتا۔ میں اپنے دل کی اس حالت پر خود بھی حیران تھا۔ میں نے
سوچا "وہ ہمارے گاؤں کا مہمان ہے۔ مہمان سے کون نفرت کرتا ہے لیکن کیا بات ہے کہ
میں اُسے دل سے قبول نہ کر سکا۔" مجھے اپنی فطرت کے اس چھوٹے پن پر شرم بھی آتی
لیکن ایک پل ایسا آیا کہ میں نے اس بے کلی کا بھید پا لیا۔ یہ بھید پٹواری کی آنکھوں میں
تھا۔ وہ کسی بات پر قہقہہ لگا کر جھوم رہا تھا کہ میری آنکھ اُس کی آنکھ میں ایک جھانکی لگا کر
حیران رہ گئی۔ پٹواری کے ہونٹوں کی ہنسی اُس کی آنکھوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ "ایسی
آنکھیں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔" میں نے سوچا ایک بات اور تھی جو مجھے اچھی نہیں لگ
رہی تھی۔ پٹواری دکان پر آنے جانے والی لڑکیوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا تو وہ آنکھ بھی نہ
جھپکتا۔ آپ کہیں بیٹھے ہوں، آنے جانے والے آدمی پر ایک نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ اس ایک
نظر میں کوئی خرابی نہیں۔ خرابی دوسری نظر میں ہوتی ہے۔ پٹواری کی یہ نظر آنے جانے والی
کے انگ انگ کو ٹٹولتی اور اُس کی پتلیاں ایک نقطے پر رُک جاتیں۔ اُن سیاہ نقطوں سے مجھے
ڈر لگتا اور اُس کی موجودگی میں شیفاں ڈھولک کا دکان پر بار بار آنا مجھے بہت کھلتا۔

پٹواری ایک سال تک مربع بندی میں مصروف رہا۔ اس نے کاغذات تیار کر لئے
تھے۔ اب بڑے افسروں کی موجودگی میں زمین کے نمبر کسانوں کی مرضی سے اُنہیں الاٹ
ہونے تھے۔ اس مرحلے پر گاؤں میں اکثر جھگڑے اُٹھتے ہیں اور سارے گاؤں کی توجہ انہیں
مسئلوں کی طرف لگ جاتی ہے۔ ایک فصل کے لئے زمین کو خالی بھی رکھنا پڑتا ہے۔ اگر سارا
گاؤں کسی فیصلے پر نہ پہنچ پاتا تو اشتمال کے منسوخ ہونے کا خطرہ ہوتا اور کیا پتہ دوسری فصل
بھی ضائع چلی جاتی۔ اُن دنوں چوہدری بڑی سرگرمی سے کام کر رہا تھا۔ وہ اپنی ساری زمینیں
اپنے ٹیوب ویل پر ڈلوانا چاہتا تھا اور اس کے علاوہ اپنے حمائتیوں کو بھی اچھی زمینیں
الاٹ کروانا چاہتا تھا۔ اُدھر چوہدری رحمت خاں کی کوشش تھی کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ
ہو۔ چوہدری کے ٹیوب ویل پر جہاں پٹواری کی رہائش تھی، ایک میلہ سا لگا رہتا۔

جب میلہ لگا ہو اور ڈھول بج رہے ہوں تو شور و غل میں کان پڑی آواز سنائی نہیں

دیتی۔ کوئی کسی کا ایک کان بھی اُڑا لے جائے تو دوسرا کان اُس کی چیخ نہیں سن سکتا۔ طوفان
آیا ہو تو اُس کی چیخ دھاڑ میں چھوٹی چھوٹی آوازیں دب جاتی ہیں۔ اگر گاؤں میں اشتمال کا
ہنگامہ نہ ہوتا تو یہ آواز گولے کی طرح پھٹتی اور اس کی گونج دور دور تک سنائی دیتی پر ہم
نے اس آواز کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُس کا گلا دبا دیا اور جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو ہم ایک
دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے کیونکہ ہر دوسرے چہرے پر ہمیں اپنا ہی چہرہ نظر آ رہا تھا جس
پر کالک ملی ہوئی تھی۔

اس وقت جب چوہدری کے ٹیوب ویل پر اشتمال کے بڑے افسر آئے ہوئے تھے
اور ہم میں سے ہر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لئے چالیں سوچ رہا تھا اور
ان پڑھ سے ان پڑھ کسان کے سامنے بھی گاؤں کی زمین کا نقشہ کھلا ہوا تھا۔ ایک ایک
کھوے کا نمبر اس کی نوک زبان تھا جیسے اس کی ذات خسرے اور جمع بندی میں گم ہو چکی ہو
اور پٹواری کی ذات تقدیرِ یزداں بنی ہوئی تھی کہ گویا آئندہ کا سارا رزق اس کے ہاتھ میں
ہے۔ ہمارے کان میں یہ بھنک پڑی کہ شیفاں ڈھولک گاؤں سے غائب ہے۔ اُس کے باپ
نے اس کا ذکر چوہدری سے کیا۔ چوہدری نے کہا "زبان پر تالا لگا لو۔ جو ہونا تھا، سو ہو گیا۔
اس کام سے فارغ ہو لیں تو اُس کے متعلق سوچیں گے۔"

یہ ہنگامہ تین دن جاری رہا۔ اس کے دوران میں اس واقعے کی بھنک ہر کان میں
پڑی۔ ہر ایک نے خبر ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اُڑا دی اور جب ہم اس ہنگامے
سے فارغ ہوئے تو اتنے نڈھال ہو چکے تھے کہ کچھ سوچنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔
تیسرے دن اشتمال پر مہر تصدیق لگ گئی۔ کوئی اس سے خوش تھا اور کوئی ناراض۔ چوہدری
نے اپنی ساری زمین اپنے ٹیوب ویل پر ڈلوا لی تھی اور اشتمال کی تصدیق کروانے میں اُس
نے ہر حربے سے کام لیا تھا۔ دھمکی، منت سماجت، قانون کا خوف۔ اشتمال کی منسوخی کا
خطرہ۔ جو لوگ گھاٹے میں رہے تھے، انہوں نے بھی چوہدری کے اثر و رسوخ کو دیکھ کر
اشتمال کو مان لیا تھا۔ اگر وہ نہ مانتے تو کرتے بھی کیا۔

تب شیفاں ڈھولک کے فرار کی گونج جو ہم نے دل کی گہرائیوں میں گم کر دی تھی،
ماتھے کا پسینہ بن کر ابھری۔ ابھی ہم پسینہ پونچھ بھی نہ پائے تھے کہ وہ گاؤں لوٹ آئی۔ ہم
نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ہر ایک نے اس پہیلی کا جواب

دوسرے کے ہونٹ سے سنتا چلا۔ شیفاں کے گھر والے خاموش تھے۔ پر وہ سب کو شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور تب سناٹا چھا گیا۔

ہر سناٹے کی کوکھ سے کوئی نہ کوئی طوفان ضرور جنم لیتا ہے۔

ایک دن ہم نے سنا کہ شیفاں کی ماں شیماں کے ہاں پہنچی اور اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہنے لگی۔ "کنجریے! باہر نکل۔ تو نے اپنا منہ تو کالا کیا' اب دوسروں کے منہ پر بھی اپنی کالک مل رہی ہو۔" اُس نے شیماں کو وہ ننگی گالیاں دی کہ میرا قلم اُنہیں لکھ نہیں سکتا۔ شیفاں کے بھائیوں نے کہا "ہم اس کنجری کا خون پی جائیں گے۔" لوگوں نے کہا "یہ سارا قصور نتھو کی پوتی کا ہے۔ وہ شہر سے گاؤں نہ آتی تو ہماری گائے جیسی لڑکیاں خراب نہ ہوتیں۔ اصل قصور وار تو مجھّی والی اوتر نکھتر ریشو ہے جو اس کلموہی کو گاؤں میں لائی۔ وہ تو گاؤں سے ہمیشہ کے لئے منہ کالا کر گئی تھی۔"

پانی ہمیشہ نچان کی طرف بہتا ہے۔ لوگوں نے اپنا سارا غصہ شیماں پر نکالا۔ جو ماسی اُس کے آڑے نہ آتی تو شیفاں کے بھائی اُس پر ہاتھ اُٹھانے سے بھی باز نہ آتے۔ اس سارے قصے کا تانا بانا کچھ اس طرح الجھا ہوا تھا کہ کوئی سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس معاملے پر پنچایت بھی نہ بیٹھی۔ اس سارے ہنگامے میں چوہدری نے ایسی چپ سادھی کہ مجھے اس کی نیت پر شک گزرنے لگا اور پٹواری کو اُس دن کے بعد کسی نے گاؤں میں آتے جاتے نہ دیکھا حتیٰ کہ ایک دن اس نے اشتمال کے سارے کاغذ مال پٹواری کے سپرد کئے اور گاؤں سے چلتا بنا۔ اس کا پتا ہمیں مال پٹواری سے لگا۔ تب ایک لمحے اچانک میرے من میں کھٹکا سا ہوا اور میں نے اپنا کالک لگا چہرہ اپنے آئینے میں دیکھ لیا۔ پٹواری ہم سے مال بھی لے گیا اور ہماری عزت پر ڈاکہ بھی ڈال گیا تھا۔ اور ہم اس پر پردہ ڈالتے رہے کہ کہیں اشتمال منسوخ نہ ہو جائے۔ چونکہ اس حمام میں سب لوگ ننگے تھے' اس لئے ہم نے ایک دوسرے کو کچھ نہ کہا اور سارا غصہ بے آسرا عورت پر نکالا۔

"ماسی! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"کون سی ماجنے؟"

"شیماں اسے ساتھ لے کر شہر کیوں گئی؟"

ماسی نے ایک لمحے کو میری طرف غور سے دیکھا اور پھر کہا۔ "اتنی سی بات بھی

تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں ماجنے۔ بے شرمی کی بات زبان پر کیسے آئے؟"

"ماسی! جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔"

"وہ کالے منہ والا پٹوارا جو زمین کے کچھ ٹکڑوں کے ساتھ ساتھ تمہیں کوئی اور تحفہ بھی دے جاتا تو بتاؤ کیا ہوتا۔ تم اسے گود میں اٹھائے اٹھائے لئے پھرتے۔ لوگوں کو چاہئے تھا کہ بیچاری لڑکی کے پاؤں دھو دھو کر پیتے۔ اس نے اپنی عزت کی پروا نہ کی۔ میں نے شیفاں کی ماں کو کھری کھری سنائی ہیں۔ اب مجال ہے جو وہ کوئی بات کر جائے۔"

میرے دل پر جو غبار سا آ گیا تھا' وہ یکدم ڈھل کر رہ گیا لیکن گاؤں کے لوگوں تک میں یہ بات پہنچا نہ سکا کیونکہ میں جانتا تھا کہ آہستہ آہستہ لوگ اس بھید کو خود بخود پا جائیں گے۔ البتہ میں گاؤں کی اس نفرت کے سامنے کوئی بند نہ باندھ سکا جس کا نشانہ شیماں بن گئی تھی۔ عورتوں نے اُس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اس کو سلائی کڑھائی کے لئے ان کی طرف سے کوئی کام نہیں ملتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ وہ اپنی دو بچیوں کو کس طرح پال سکے گی۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۲۲

○

ندی بہتی رہتی ہے۔ اس کے کنارے کا کوئی پودا سوکھ جاتا ہے، کسی کو سیلاب کا ریلا بہا لے جاتا ہے، کسی کو پت جھڑ لگ جاتا ہے، کوئی آکاس بیل کی نذر ہو جاتا ہے، کسی کی جڑ دیمک کھا جاتی ہے پر ندی چلتی رہتی ہے اور ایک پودے کی کوکھ سے دوسرا جنم لے لیتا ہے۔ گاؤں کی کہانی تو ندی کا چلتا پانی ہے اور ندی بہتی رہتی ہے، کبھی کناروں سے چھلک کر، کبھی تہہ میں بیٹھی ریت سے لگ کر۔

اب میں سوچتا ہوں کہ کہانی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ کہاں سے جوڑوں۔ اس کا سلسلہ میں پھر اپنی ذات سے جوڑتا ہوں، حالانکہ گاؤں کی کہانی صرف میری کہانی نہیں پر گاؤں میری ذات میں گم ہو چکا ہے، اور میں گاؤں میں۔ میں گاؤں کو اپنے آپ سے الگ کر کے دیکھنے کا عادی نہیں بن سکا۔

ماسی کی موت کے بعد میں کئی دنوں تک بھٹے پر نہ گیا۔ میں ماسی کے سوگ میں بچھنے والی صف پر بیٹھا رہا۔ ماسی کے جنازے اور ماتم میں گاؤں کے سب لوگ شریک ہوئے تھے۔ وہ لوگ بھی جن کا دل ماسی کے بچ نے دکھایا تھا۔ میرا اشارہ چودھری کی طرف ہے۔ یہ گاؤں کی ریت ہے۔ ہم جیتے جی ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں پر مرنے کے بعد ہمارا مرنے والے سے کوئی بیر باقی نہیں رہتا اور سوگ کی صف پر بیٹھ کر ہم ایک دوسرے کے بیری بھی نہیں رہتے۔ موت کے بعد ماسی نے چودھری کو اور مجھے یہ موقع دیا کہ ہم پھر گاؤں والوں کا سامنا کر سکیں۔ ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کیں۔

ٹوٹے ناطے پھر سے جڑ گئے۔ مجھے ماں، باپ، بیوی، بچے، بھائی، بہن کے رشتوں میں پرانے بندھنوں کا پھر سے مزا محسوس ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے مجھے کسی بیماری سے اچانک شفا حاصل ہو گئی ہو اور میرے ذائقے نے نمک، مرچ اور کھٹاس کی لذت کو از سرِ نو پا لیا ہو۔ اس

میں صرف ایک ذائقے کی کمی رہ گئی تھی۔ یہ ذائقہ جس میں نہ کڑواہٹ تھی، نہ کھٹاس، نہ مٹھاس، زندگی میں ہر چیز کہاں ملتی ہے۔

بھا کی دکان پر پھر محفلیں گرم ہونے لگیں تو میں ان میں رچ بس گیا۔ بھا نے ٹرانسسٹر خرید لیا تھا اس لئے محفل کی رونق بڑھ گئی تھی۔ انھیں دنوں بنیادی جمہوریتوں کے دوسرے انتخابات کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے لئے چودھری چاہتا تھا کہ سلیمان کو کھڑا کیا جائے۔ ابھی تک سلیمان کے مقابلے میں کسی اور آدمی کا ہم نے نام نہیں سنا تھا۔ چودھری رحمت خان دوسری بار انتخاب نہیں لڑنا چاہتا تھا۔ یوں بھی چودھری رحمت خان کا خیال تھا کہ اگر یونین کونسل کی چیئرمینی سیدپور کے ذیلداروں کے خاندان میں رہتی ہے تو چک مراد کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ ایک بات اور بھی تھی اور وہ یہ تھی کہ چودھری رحمت خان اپنی زمین پر ٹیوب ویل لگانا چاہتا تھا۔ اس کی ساری توجہ اسی کام میں لگی ہوئی تھی۔

انھیں دنوں سیالکوٹ سے سیدپور جانے والی سڑک کے متوازی بجلی کے بڑے بڑے کھمبے لگ چکے تھے۔ ایک کھمبا بھٹے سے چند گز کے فاصلے پر نصب ہوا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہاں سے ایک لائن ہمارے گاؤں کے پاس سے گزرتی ہوئی گل بہار اور اس سے آگے کے دیہات میں بھی جائے گی۔ میں نے چودھری رحمت خان سے کہا کہ ابھی وہ تیل سے چلنے والے انجن کا ٹیوب ویل نہ لگائے، بجلی آئے گی تو موٹر سے چلنے والا ٹیوب ویل لگائے۔ بہرحال چودھری رحمت خان نے ٹیوب ویل کے لئے قرضے کی درخواست دے دی اور بھا نے کھاد کی ایجنسی لینے کے لئے۔

ہمارے گاؤں کے قریب ٹرانسفارمر لگا تو گاؤں والوں کے لئے یہ ایک عجوبے سے کم نہیں تھا۔ پھر یہ عجوبہ بجلی کا قمقمہ بن کر بھا کی دکان، چودھری کی حویلی اور رحمت خان کے مکان میں روشن ہوا تو یوں لگا جیسے سویا ہوا گاؤں جاگ اٹھا ہو۔ میرا مکان کھمبے سے دور تھا اور ابھی راستے کے لوگ بجلی سے ڈر رہے تھے، بابا حیات کہتا تھا۔ "کچے مکانوں میں مٹی کے دیے ہی بھلے لگتے ہیں۔" پر میرا خیال تھا کہ مکان کچے ہوں یا پکے ان کی رونق روشنی کے دم قدم سے ہے۔ چودھری رحمت خان کو ٹیوب ویل کے لئے قرضہ مل گیا اور بھا کو کھاد کی ایجنسی مل گئی۔ جس دن رحمت خان کا ٹیوب ویل چلا، اس دن وہاں میلے کا سماں تھا۔ جیتے بولتے لوگوں کا میلہ لگے تو جی میں پیار کا میلہ لگ جاتا ہے۔ میں اس دن بہت خوش تھا۔

حالانکہ میرے باپ کے دو تین کھیتوں کو اس ٹیوب ویل سے پانی نہیں لگ سکتا تھا کھیت
کسی کے ہوں، ان کی لہر بہر دیکھ کر کس کسان کا جی خوش نہیں ہوتا؟ اب لوگوں کو کھاد بھی
آسانی سے مل سکتی تھی۔ پانی اور کھاد کا ملاپ ہو تو کھیت انگڑائی لے کر جاگ اٹھتے ہیں اور
دنوں میں جوان ہو جاتے ہیں۔

اس سال گندم کی بوائی پر کسانوں نے ترقی یافتہ بیج بویا اور کھیتوں میں کھاد ڈالی۔ پر
اس بوائی سے پہلے انتخاب کا ہنگامہ بپا ہوا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے اپنے
پرانے دوست سُلّی کے مقابلے پر آنا پڑے گا۔ میرے باپ کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ اس کا
خیال تھا کہ کسان کو سیاست سے کیا کام؟ اس سے کام میں برکت اٹھ جاتی ہے۔ پر گاؤں کے
نوجوان طبقے نے مجھے اس مقابلے پر اُکسایا۔ وہ بڑے بوڑھوں کی سیاست سے تنگ آ چکے
تھے۔ سلیمان کو اس کا پتا لگا تو وہ گاؤں آیا۔ اس نے لوگوں سے میل ملاپ کی مہم شروع کر
دی۔ پہلے پہلے میں ڈانوا ڈول سا رہا۔ کون اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالے؟ سیاست تو
اَستروں کا ہار ہے۔ خواہ مخواہ گھائل ہونے سے فائدہ؟ پر جب سلیمان نے جوڑ توڑ شروع کیا تو
میں بھی میدان میں اُتر آیا۔ "پڑ" لگا ہو اور کوئی پہلوان رانوں پر ہاتھ مار کر دوسروں کو
مقابلے پر للکارے تو کسی نہ کسی کا خون تو ضرور کھول اُٹھتا ہے۔ یہی بات میرے ساتھ ہوئی۔
میں لنگر لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اُترا تو مجھے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ بس ایک ہی دُھن
میرے سر پر سوار تھی "میں سلیمان کا غرور خاک میں ملا دوں گا۔" سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے
میں اسی دیوانگی میں گرفتار رہا۔ میں گاؤں کے ایک ایک آدمی سے ملا۔ گاؤں کے جوانوں نے
میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا کیونکہ سلیمان شہر میں رہنے کی وجہ سے اُن کے لئے اجنبی بن چکا
تھا پر ان جوانوں میں سے ووٹ کا حق کسی کسی کو تھا۔ زیادہ ووٹ بڑے بوڑھوں کے تھے۔
میں نے محسوس کیا کہ اُن کے دل پھر چوہدری کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ میں نے جوانوں
کی ایک محفل میں اس خدشے کا ذکر کیا تو وہ یک زبان ہو کر بولے "سُلّی ممبر نہیں بنے گا
ممبر ہو گا تو ماہنا ہو گا۔ ماہنا ہم میں سے ہے۔"

تب ایک ایک گھر میں سیاست کا چکر چلا۔ چھوٹوں نے بڑوں کو اور بڑوں نے
چھوٹوں کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ کہیں باپ بیٹے سے اُلجھ پڑا، کہیں باپ نے بیٹے کو دھتا
بتایا اور عجیب بات ہے کہ ہر گھر میں ماں نے بیٹے کا ساتھ دیا اور اس طرح ہر گھر سے مجھے

ایک دو ووٹ ملنے کی اُمید لگ گئی۔ پولنگ سے پہلے کا ایک مہینہ سلیمان نے گاؤں میں
گزارا۔ اس نے لٹھے کا تہبند اور لٹھے کا کُرتا پہنا۔ اس کے اُوپر کھیس کی بُکل ماری۔ وہ
ہر گھر میں خود چل کر گیا۔ وہ گاؤں کے ہر چھوٹے بڑے کے آگے بچھ بچھ جاتا رہا۔ وہ کسی کو
چاچا، کسی کو ماما کہتا رہا۔ سلیمان کا بہنوئی بھی ہمارے گاؤں آیا۔ اس نے چھوٹے موٹے جلسے
کئے۔ ایک جلسے میں اس نے اپنے خاندان کی خدمات کا ذکر کیا۔ چوہدری رحمت خان نے
اسے موقع پر ٹوک دیا۔ گزرے ہوئے چار سالوں میں ہمارے گاؤں میں ایک گلی بھی پکی نہ
ہوئی تھی، نہ سکول کی عمارت بنی تھی، لڑکیوں کے لئے سکول بھی نہیں کھلا تھا۔

اس نے کہا "تمہارے مکانوں میں بجلی کے لاٹو جلتے ہیں۔ رات کو سارا گاؤں جگمگ
جگمگ کرتا ہے اور چوہدری رحمت خان! تیرے ٹیوب ویل کی موٹر دن رات پھک پھک چلتی
ہے ذرا بتاؤ تو یہ کام کس کی ہمت سے ہوا۔ اس کے لئے دن رات کس نے بھاگ دوڑ کی۔
تو نے یا سلیمان نے؟"

"کسی نے بھی نہیں۔" میں نے فٹ سے کہا۔

"واہ! تو بجلی یہاں کوئی جن لے آیا ہے؟"

"ہاں! وارسک ڈیم ایک جن ہی تو ہے، جو بجلی پیدا کرتا ہے اور اسے گاؤں گاؤں
لے جاتا ہے۔ ہمارا گاؤں اس جن کے راستے میں پڑتا تھا۔ وہ اس پر بھی مہربان ہو گیا۔"

میری بات پر ایک قہقہہ پڑا۔ سلیمان کے بہنوئی نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے
دیکھا۔ سلیمان نے کہا "ماہنے! مقابلہ میرا اور تیرا ہے۔ بھائی صاحب تو مہمان ہیں۔ ان کے
ساتھ شرافت سے تو پیش آؤ۔"

"سُلّی! ماہنے نے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کی۔" بابا حیات نے کہا۔

"تم لوگوں نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔" سُلّی چڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس
کی آواز میں مجھے اس کے بچپن کی کینگنی بولتی ہوئی نظر آئی۔ بابا حیات نے میرے کان میں
سرگوشی کی، "چلو ماہنے! اسے کچھ نہ کہو۔"

سلیمان کے بہنوئی نے پھر تقریر شروع کی۔ وہ ہوا میں لاٹھیاں چلاتا رہا۔ لوگ ہنستے
بھی رہے اور دل ہی دل میں چڑتے بھی رہے۔ اس نے بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے حاصل
ہونے والے فائدوں کی ایک لمبی فہرست پڑھ کر سنا ڈالی اور گاؤں والوں کو دھمکی دی کہ

انہوں نے سلیمان کو ووٹ نہ دیئے تو چک مراد ان سے محروم ہو جائے گا۔ ان کے ٹیوب ویل بند ہو جائیں گے اور زمینیں بنجر ہو جائیں گی۔ اُس نے کہا "سلیمان تو گاؤں کا سنگھار ہے۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ کچہری تھانے میں جا کر کھڑا ہو جائے' تو افسر اُس کی بات سننے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"ماہنا بھی پڑھا لکھا ہے۔" ایک نوجوان نے کہا۔

"صرف سید پور تک ـــــ وہ بیچارہ سیالکوٹ بھی نہ پہنچ سکا اور سلیمان نے لاہور شہر سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔"

"ہمارے لئے ماہنا ہی اچھا ہے۔ وہ ممبر بن گیا تو گاؤں میں تو رہے گا اور ہمارے دکھ سکھ میں ہمارا ساتھی بنے گا۔ ہم سلیمان سے اپنے کام کروانے کے لئے سیالکوٹ اور لاہور تو مارے مارے نہیں پھریں گے۔"

اس انتخاب میں چوہدری نے فیصلہ کیا کہ وہ سلیمان کو جتانے کے لئے ہر ہتھیار استعمال کرے گا۔ اُسے اپنی شکست یاد تھی۔ اُسے اس انتخاب میں اپنی جیت کا پورا پورا یقین تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس اعتماد میں مارا گیا تھا۔ اُسے یہ بھی ڈر تھا کہ سلیمان کی شکست سے اس کی وکالت پر بُرا اثر پڑے گا' اس لئے وہ میرے باپ کے پاس آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اصل قصّہ چھیڑا۔ اُس نے اپنے پرانے تعلقات کا واسطہ دیا۔ اپنی زیادتیوں پر شرمساری کا اظہار کیا۔ یہ بھی کہا کہ سُلی اور ماہنے میں مقابلہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کہو تو میں سلیمان کو بٹھا دوں۔ اس طرح دونوں میں دشمنی کا بیج تو نہیں پڑے گا۔ میرے باپ کا دل پسیج گیا۔ اس نے بابا حیات اور چوہدری رحمت خان سے مشورہ کیا۔ اُن دونوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ میں مقابلے میں حصہ نہ لوں۔ بھا اسلم بھی دل سے یہی چاہتا تھا۔ اس کی ہٹّی پر جب بھی دو چار جوان جمع ہوتے وہ کہتا "یہ بھی کوئی ممبری ہے کہ جس میں عزت بھی ہاتھ سے جاتی رہے۔ تم جانتے ہو کہ جب سے بنیادی جمہوریتوں کا دور شروع ہوا ہے' کیسے کیسے ذلیل ٹیکس لگے ہیں۔ نکاح ٹیکس' پیدائش ٹیکس' چولہا ٹیکس' قبرستان اور شاملات دیہہ میں اُگے ہوئے درخت بھی یونین کونسل کے ہیں۔ سارے درخت نیلام کر دیئے گئے۔ قبرستان اُجاڑ نظر آتا ہے۔ نئے درخت لگائے نہیں گئے۔ اور تو اور گاؤں کا چوکیدار بھی پہرہ کم دیتا ہے اور چولہا ٹیکس اکٹھا کرنے کے پیچھے لگا رہتا ہے اور گھر گھر جا کر

رعب ڈالتا ہے۔ تم نے وہ لطیفہ سنا؟"

"کیا؟"

"ایک دن میں نے اُسے فقیرو کہہ کر بلایا تو اُس نے کہا "چوہدری! میرا نام فقیر محمد ہے۔" میں نے کہا کہ میں تو فقیرو ہی کہوں گا' اس کے جواب میں اُس نے کہا۔

"چوہدری! افسروں کے نام تو عزت سے لینے چاہئیں ہو۔"

اس لطیفے پر ایک قہقہہ لگا پر یہ بات قہقہے میں نہ ٹل سکی۔ لوگ سوچنے لگے جو گاؤں کے چوکیدار بھی افسر بن گئے' تو ہم کہاں جائیں گے۔

ایک جاٹ کے لئے اس سے بڑھ کر بے عزتی کی بات اور کون سی ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک شرط پر مقابلے سے دستبردار ہو جاؤں گا۔"

"کون سی شرط؟" بابا حیات نے پوچھا۔

"سُلی یہ وعدہ کرے کہ وہ پکّی سڑک سے گاؤں تک آنے والے رستے کو پکّا کروا دے گا۔"

چوہدری کے کان میں اس کی بھنک پڑی تو وہ ہٹّی پر آ موجود ہوا۔ اُس نے آدمی بھیج کر چوہدری رحمت خان اور بابا حیات کو خاص طور پر بلوایا۔ کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے اور اس نے سب کی موجودگی میں کہا "میں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ چوہدریو! سلیمان ممبر بن گیا تو اس ایک میل کو پکّا کروانا کچھ مشکل نہیں۔ میں سب سے پہلا کام یہی کروں گا۔ سرکار سے کوئی مدد نہ ملی تو میں اپنی گرہ سے یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔"

میں نے کہا "نہیں چوہدری! یہ سارے گاؤں کے فائدے کی بات ہے۔ ہم چندہ اکٹھا کریں گے۔ امداد باہمی کے طریقے پر کام کریں گے۔ میں بھٹے سے سستے داموں اینٹیں مہیا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"چوہدری! ایک شرط اور ہے۔" ایک جوان نے کہا۔

"کہو۔"

"فقیرو چوکیدار سے کہنا کہ وہ آئندہ اپنے آپ کو گاؤں کا افسر نہ کہا کرے۔"

اس بات پر ایک قہقہہ لگا۔ جب چوہدری کو اصل حقیقت کا پتہ چلا تو وہ بھی قہقہے میں شامل ہو گیا۔

سلیمان بلامقابلہ منتخب ہو گیا۔ گاؤں ایک ہنگامے سے محروم رہا۔ یہ کام اتنا چپ چاپ ہوا کہ کوئی پتا بھی نہ کھڑکا۔ مجھے کچھ افسوس بھی ہوا کہ میں گاؤں کو کھیل تماشے کا ایک موقع نہ دے سکا۔ سیدپور کے ذیلدار کا بڑا بیٹا یونین کونسل کا صدر منتخب ہو گیا۔ اس مرحلے تک سلیمان میرا دوست رہا۔ یہ مرحلہ طے ہوا تو اس نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے اور اُس کے درمیان پہلے سے بھی لمبا فاصلہ آ گیا ہو۔ میں نے اُسے اُن چوٹیوں پر دیکھا جہاں ٹھنڈے، سرد اور پتھریلے فاصلوں کے تودے چمک رہے تھے۔

تب میں نے زندگی میں پہلی بار اُس شکست کا مزہ چکھا جو منہ میں راکھ بن جاتی ہے۔ میں اپنے آپ سے شرمندہ تھا۔ میں گاؤں والوں سے آنکھیں چار نہ کر سکتا تھا۔ میں ان جوانوں کو منہ نہ دکھا سکتا تھا جو ذرا سی بغاوت پر آمادہ تھے اور میں ان کا ساتھ نہ دے سکا تھا۔ چوہدری رحمت خان اور بابا حیات کچھ عرصہ چوہدری کی محفلوں میں برابری کے احساس کے ساتھ شریک ہوتے رہے، پھر چوہدری کا طُرّہ بلند ہونے لگا اور جب وہ آسمان سے جا لگا تو دونوں اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ چوہدری زبانی کلامی تو سب کے ساتھ بڑی عاجزی سے ملتا لیکن اس کی آنکھیں کہتیں "تم لوگوں نے میرے اقتدار کو خاک میں ملانا چاہا لیکن یاد رکھو یہ عمارت مضبوط ہے اور تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

چوہدری رحمت خان نے سڑک کے بارے میں اسے اپنا وعدہ یاد دلایا تو اُس نے کہا "اتنی بے صبری بھی کیا؟ تم لوگ تو ہتھیلی پر سرسوں اُگانا چاہتے ہو۔ ابھی سرکار کو ان چھوٹے چھوٹے کاموں کی فرصت کہاں۔ ابھی سلیمان کو صدارتی انتخاب کے لئے بہت کام کرنا ہے۔ اس کے بعد دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔"

"شکر ہے اس بہانے تمہارے منہ سے اللہ کا نام تو نکلا چوہدری!" بابا حیات نے کہا۔

چوہدری نے غرور سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اُس طرف اس کا ٹیوب ویل تھا اور پائپ سے پانی کی موٹی دھار نکل رہی تھی۔ اردگرد کے کھیت پانی میں ڈوبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ باسمتی کی فصل پک چکی تھی اور پکی ہوئی مُنجروں سے دُھلی دُھلی شاداب خوشبو آ رہی تھی۔

اُس نے بابا حیات کی طرف دیکھ کر کہا "بابا حیات! اللہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔"

"وہ تو سب پر مہربان ہے۔" بابا حیات نے کہا۔ "تم لوگوں نے میری خاک اڑانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہ مہربان نہ ہوتا تو تم آج میرے پاس یوں سوالی بن کر نہ آتے۔"

"سوالی؟" چوہدری رحمت خاں نے غصے سے لرز کر کہا "ہم تم سے بھیک مانگنے آئے ہیں؟"

"یہ بھیک ہی ہے نا!"

"یہ سارے گاؤں کے فائدے کی چیز ہے ــــ ہم جس کے لئے آئے ــــ اور تو نے الیکشن سے پہلے اس کا وعدہ بھی کیا تھا۔"

"کیا تھا ــــ وہ سڑک جسے تم پکی کروانا چاہتے ہو، میری زمینوں کے پاس سے تو نہیں گزرتی ــــ خیر! میں نے وعدہ کیا ہے، وہ پورا ہو گا پر اپنے وقت پر۔"

یہ باتیں سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میں نے جوانوں سے مشورہ کیا۔ تب لوگوں نے دیکھا کہ سڑک کے اردگرد کے جوان کسان کسیاں ہاتھ میں لئے سڑک پر مٹی ڈال ڈال کر اسے ہموار کر رہے ہیں۔ گزشتہ بارشوں میں سڑک میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اتنے بڑے بڑے کہ گڈے، تانگے اور ریڑھے اس رستے سے گزرتے تو ان کے انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے۔ ہم نے چند دنوں میں سڑک ہموار کر دی۔ اس کے بعد میں نے شیخ صاحب سے کہہ کر اپنے بھٹے سے وہ اینٹیں اونے پونے داموں خرید لیں جو کسی نہ کسی وجہ سے پیچھے رہ گئی تھیں۔ تب ہم میں سے کچھ لوگ راج بن گئے اور کچھ مزدور۔ ہم نے اپنے گاؤں کے راج سے اینٹیں جمانے کی اُنگل سیکھی۔ اُسے اپنا نگران مقرر کیا اور کام شروع کر دیا۔ ان دنوں سڑک پر میلہ سا لگا رہا۔ ہم نے پکی سڑک کی طرف سے کام شروع کیا اور جب ہم گاؤں کی پکی گلی کے ساتھ سڑک کا سلسلہ ملانے میں کامیاب ہو گئے تو اس دن گاؤں کے سارے کسان کام کاج چھوڑ کر بھا کی دکان پر جوہڑ کے کنارے جمع ہو گئے۔ ہم بہت خوش تھے اور وہ لوگ بھی جو ہمارے کام کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور کہتے تھے "ماہیا خود تو پاگل ہو گیا ہے اور اس نے دوسروں کو بھی پاگل بنا دیا ہے۔" میں سوچتا تھا "دُنیا میں کوئی اچھا کام پاگل پن کے بغیر نہیں ہوتا۔"

اس دن کی دھوپ لال لال اینٹوں پر چمک کر ایک سرخ لکیر سی بن گئی تھی۔ اس کی

دونوں طرف باسمتی کے پکے ہوئے کھیت تھے جن کا رنگ سنہری تھا اور کھیتوں میں کٹائی شروع ہو چکی تھی اور موسم میں نرم گرم دھوپ کا رچاؤ تھا اور اس رچاؤ سے دلوں کے اندر عجیب سا پھیلاؤ تھا۔ اُس وقت میرے دل میں اک آگ سی لگی ہوئی تھی، نرم گرم آگ جس میں آنچ نہیں ہوتی۔ میں بہت خوش تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس رات کو جشن منایا جائے۔ کہیں سے کوئی گانے والا منگوایا جائے اور ساری رات بھنگڑا ڈالتے گزر جائے۔ اتنی تھوڑی مدت میں گانے والا کا انتظام مشکل تھا۔ میں نے یہ بات ابھی کسی اور سے نہیں کی تھی کہ اچانک دُور سے اینٹوں کی سُرخ لکیر پر ایک کار دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ سب لوگوں کی نگاہیں سڑک کی طرف لگ گئیں۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے پوچھا "یہ کار کس کی ہے؟" میں انہیں کیا جواب دیتا۔ میں حیران تھا۔ میں نے بھا اسلم کی طرف دیکھا۔ اُس نے میرے قریب آ کر کہا "ماجے! تم ابھی نہیں سمجھے؟"

"نہیں۔"

میں نے لٹھے کے تہبند کی کھڑکھڑاہٹ سنی تو میرے ذہن میں کھٹکا سا ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھا، میرے پیچھے چوہدری کھڑا تھا۔ وہ چپکے سے مجمعے میں آ شامل ہوا تھا۔ وہ کسی ے نظریں نہیں ملا رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور اُس کے ہونٹ بھنچے وئے تھے جیسے وہ ساری دُنیا کا مذاق اڑا رہا ہو۔ تب میں سمجھ گیا اور میرے ماتھے پر پسینہ آ لیا۔ ایک لمحے کو سنہری دھوپ کملا سی گئی اور دوسرے لمحے میرے پہلو کے قریب کار کا وازہ کھلا اور وہ وکیل صاحب کار سے اُترے جو ہمارے علاقے سے اسمبلی کے ممبر تھے۔ ج انہیں میں دوسری بار دیکھ رہا تھا۔ ان کے بعد اور تین آدمی کار نے اگل دیے۔ ان میں ان بھی تھا اور اُس کے بہنوئی کا بڑا بھائی بھی جو ہماری یونین کونسل کا چیئرمین تھا اور وہ انے کا مالک بھی ـــــ وہ شریا ـــــ اُسے دیکھ کر مجھے یوں سنائی دیا جیسے جوہڑ کے گدلے یں ایک چھلاکا سا ہوا ہو۔

"یہ کون تھا جس نے گدلے پانی میں چھلانگ لگا کر ڈوب جانا چاہا؟" میں نے اپنے ے پوچھا اور میری آواز سے موت کی بُو آئی۔

سلیمان نے ایک ڈبا چوہدری کی طرف بڑھایا۔ چوہدری نے اُس میں سے ایک سنہری ور آگے بڑھ کر وکیل صاحب کے گلے میں ڈال دیا۔ سہ پہر کی سنہری دھوپ میں ہار

جھلمل، جھلمل چمکا تو چوہدری مسکرایا۔ وکیل صاحب نے گم سم مجمعے پر ایک نظر ڈال کر سلیمان سے کچھ پوچھا۔ سلیمان نے نہ جانے انہیں کیا جواب دیا۔

وکیل صاحب نے کہا "چک مرلو کے چوہدریو! میں تمہیں اس کارنامے پر مبارک باد دیتا ہوں۔" سارے لوگ چپ رہے تو سلیمان نے کہا "وکیل صاحب اپنی مصروفیت کے باوجود کچھ وقت نکال کر چک مرلو آئے ہیں۔ ہم چک مرلو کے لوگ انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔"

وکیل صاحب مسکرائے۔ انہوں نے کہا "جس گاؤں میں چوہدری شرف دین جیسے بزرگ موجود ہوں اور جسے محمد سلیمان بی اے ایل ایل بی جیسا سپوت ملا ہو، میں اس گاؤں میں آنا اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتا ہوں۔ یہ سڑک آپ نے امداد باہمی کے سنہری اصولوں پر عمل کرتے ہوئے بنائی ہے، میں اس کے لئے آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ کی یونین کونسل کے چیئرمین بڑے کارکن نوجوان ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ سڑک کی تعمیر کے دوران میں چوہدری سلیمان اور چوہدری شرف دین آپ کے ساتھ مزدور بن کر کام کرتے رہے۔"

"نہیں!" مجمع یک زبان ہو کر چلا اٹھا "یہ جھوٹ ہے۔"

وکیل صاحب حیران ہو کر سلیمان کی طرف دیکھنے لگے تو اس نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ وکیل صاحب نے لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر کہا "چوہدریو! سیاسی اختلاف اپنی جگہ پر ہمیشہ موجود رہا کرتا ہے۔ ایسے مبارک موقع پر یہ دشمنی بھلا دی جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ اس سڑک کی تعمیر میں میں اُن لوگوں کو بھی شریک سمجھتا ہوں، جو اس منصوبے کے خلاف تھے۔"

"وکیل صاب! بابا حیات نے پوچھا "وہ کون تھے؟"

"بابا! انہیں بات تو پوری کر لینے دو۔" چوہدری بولا۔

"وکیل صاب! آپ کو پتہ ہے، اس سڑک کی ایک ایک اینٹ پر کس سودائی کا پسینہ گرا اور کس نے اس منصوبے کو روکنے کی کوشش کی؟"

"وہ کون ہے؟" وکیل صاحب نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ بابا حیات کچھ جواب دے، سلیمان آگے بڑھا اور اس نے بابا حیات کو کندھے سے پکڑ کر ایک طرف کرتے ہوئے کہا "وکیل صاحب! اس بڈھے کو ہمارے خاندان سے پرانی دشمنی ہے۔ آپ جانتے ہیں، گاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے کتنا بیر رکھتے ہیں۔

کی پھوٹ تو ہمیں لے ڈوبی ہے۔"

"سَلّی! بابا حیات نے غصے میں آ کر کہا "میرے کندھے سے ہاتھ اٹھا لے۔ وکیل صاب! اس کے باپ شرف دین سے پوچھئے کہ سڑک بنانے میں کن لوگوں نے حصہ لیا اور جب ہم نے اس سے سڑک کے بارے میں پوچھا تو اس نے ہمیں کیا جواب دیا تھا۔"

وکیل صاحب چوہدری کی طرف متوجہ ہوئے تھے کہ چیئرمین نے کہا "ہمیں بال کی کھال اتارنے کی کیا ضرورت ہے؟ سڑک بن چکی ہے۔ آپ نے آج اس کا افتتاح کر دیا۔ آیئے! اب چوہدری صاحب کی حویلی میں تشریف لے چلئے گا۔"

وکیل صاحب اور ان کے ساتھی کار میں بیٹھے تو کسی نے مٹی کا ایک ڈھیلا کار پر دے مارا۔ میں نے اونچی آواز میں کہا "نہیں! وکیل صاحب ہمارے مہمان ہیں۔ ہم ان کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کریں گے۔" پر اس اثنا میں دو چار ڈھیلے پھینکے جا چکے تھے۔ لوگوں نے اپنے غصے کا اظہار کر دیا تھا۔ سَلّی کا چہرہ غصے سے کالا پڑ گیا تھا۔ وہ لوگوں پر ایک جلتی چبھتی نگاہ ڈال کر کار کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس کے آگے آگے چوہدری شرف دین تھا۔ کار جوہڑ کے کنارے کنارے ہوتی ہوئی چوہدری کی حویلی کی طرف مُڑ گئی۔

میں جانتا تھا کہ سڑک کی تعمیر کا سہرا سلیمان کے سر ڈالا جا چکا ہے۔ سیدپور کی یونین کونسل نے چک مراد کا یہ کارنامہ اپنے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ پر سڑک تو اپنی جگہ پر موجود ہے۔ سلیمان کے بس میں ہوتا تو وہ اسے بھی لپیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیتا۔

اس خیال پر میں بے اختیار ہنس پڑا تو چوہدری رحمت خان نے پوچھا۔

"ماہے! اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "چوہدری! رونے سے ہنسنا بہتر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر بھی بتاؤ تو تم ہنسے کس بات پر؟"

"میں سوچ رہا تھا' سلیمان نے ایک کارنامہ اپنے نام لکھوا لیا ہے۔ اب یہ سڑک جو کاغذ یا کپڑے کی بنی ہوتی' تو وہ اسے لپیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیتا اور چلتا بنتا۔"

"کیا پتہ ایسا ہی ہوا ہو۔" چوہدری رحمت خان نے کہا "اس پر جو خرچ ہم نے کیا ہے' وہ یونین کونسل کے کھاتے میں پڑ گیا ہو اور ذیلدار کے بیٹے اور سلیمان کی جیب میں پہنچ چکا ہو۔"

ہم اس رات کوئی جشن نہ منا سکے اور مجمع آہستہ آہستہ منتشر ہو گیا۔ یہ جشن چوہدری کی حویلی میں منایا گیا۔ وکیل صاحب اور ان کے دوستوں نے دعوت اڑائی اور قہقہے اڑائے اور پھر جب رات کا اندھیرا گہرا ہوا تو کار اسی سڑک پر سے ہو کر شہر کی طرف لوٹ گئی۔ اس کی بتیوں کی روشنی دُور تک نظر آتی رہی۔ پھر گاؤں پر اندھیرا چھا گیا اور مکانوں کے اندر جلنے والی بجلیاں بجھ گئیں۔

کچھ دنوں بعد صدارتی انتخاب منعقد ہوا۔ لالٹین اور گلاب کے پھول میں معرکہ ہوا۔ چونکہ ووٹ بنیادی جمہوریت کے ممبروں کے ہاتھ میں تھے اس لئے لالٹین ہار گئی اور گلاب کا پھول جیت گیا۔ لوگوں کو دکھ ہوا کہ قوم کی ماں کو جنہوں نے ملک کے چپے چپے کا دورہ کیا تھا' شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ووٹ ذیلدار کے بیٹے اور سلیمان جیسے لوگوں کے ہاتھ میں تھے۔ ہمارے ہاتھ میں ہوتے تو ہم ماں کو ہار سے بچا لیتے۔

چک مراد کے لوگوں کی بنائی ہوئی سڑک پر تانگے چلتے' ریڑھے اور گڈے آتے جاتے اور ہمیں اپنی فصل کو شہر لے جانے میں بڑی آسانی حاصل ہو گئی تھی لیکن یہ سڑک چوہدری کے کسی کام نہ آ سکی کیونکہ وہ اس پر چل کر کسی بھی منزل پر نہ پہنچ سکا تھا شاید اس لئے کہ اُس نے سڑک سے وہ کام لینا چاہا تھا' جس کے لئے یہ سڑک نہیں بنائی گئی تھی۔ اب اس کی چمک دمک بھی جاتی رہی تھی' اینٹوں کا رنگ مَیلا پڑ چکا تھا اور چمکتی دھوپ میں اس کی سُرخی آنکھوں میں چکاچوند بھی پیدا نہیں کرتی تھی۔ اس کا کنوارپنا اب گرہست کی چکّی میں پس رہا تھا' اس دلہن کی طرح جس نے سُرخ جوڑا اتار کر کھدر کے کپڑے پہن لئے ہوں اور اب اس کی مہندی لگے ہاتھ اُپلے تھاپ تھاپ کر کملا گئے ہوں اور ان پر "پنڈیاں" پڑ گئی ہوں۔

تاہم اس سڑک نے ہمیں شہر سے قریب تر کر دیا تھا!

اس نے چک مراد کی شہرت اور عزّت میں اضافہ کیا تھا۔ اس کی بدولت ہمیں اپنے آپ پر اعتماد اور یقین حاصل ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا کیوں؟ پر مجھے یہ سڑک گاؤں کی شہ رگ معلوم ہوتی تھی۔ ایک دھندلا سا خیال میرے ذہن میں تھا کہ اس رستے گاؤں کے جسم میں نیا خون داخل ہو گا۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۲۰

○

اشتمال کے بعد گاؤں میں کچھ تبدیلیاں آئیں۔ کچھ تو ظاہر میں آ گئی تھیں، کچھ کو ہم نے دھیرے دھیرے محسوس کیا تھا۔ ظاہری تبدیلیاں تو یہ تھیں کہ مربع بندی سے گاؤں کے کھیتوں کی شکل صورت بدل گئی تھی۔ وہ ٹیڑھے بینگے، تکونے اور پیچ کونے کھیت باقی نہیں رہے تھے۔ ان کی جگہ حدِ نظر تک مربعے نظر آنے لگے۔ گاؤں کے چاروں طرف دس فٹ چوڑی سڑک بن گئی۔ اس سے اندر گاؤں کی رہائشی زمین تھی۔ گاؤں کے قبرستان، بچے اور سکول کے لئے زمین کے قطعے مخصوص کر دیئے گئے تھے۔ گاؤں سے باہر جانے کے پرانے راستے کھیتوں میں مل گئے تھے اور نئے راستے خود بخود کھیتوں سے برآمد ہو گئے تھے۔ سید پور سے سیالکوٹ جانے والی کچی سڑک تک پہنچنے والے رستے کو جب ہموار کیا گیا تو ہمیں خیال ہوا کہ اس کو پکا بھی ہونا چاہئے۔

اندر ہی اندر جو تبدیلی آئی، وہ یہ تھی کہ چودھری کا اثر و رسوخ پھر سے بحال ہو گیا تھا۔ چونکہ گاؤں کے اکثر لوگوں کو اشتمال سے فائدہ پہنچا تھا، اس لئے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ چودھری کی بدولت ہوا ہے۔ چودھری رحمت خاں اپنے دھڑے کے لوگوں کو زیادہ خوش نہ کر سکا تھا۔ اس میں اس کا کچھ قصور نہ تھا۔ پٹواری چالاکی سے اُسے سبز باغ دکھاتا رہا لیکن اچھے اچھے نمبر وہ چودھری کے حمائتیوں کے کھاتے میں ڈالتا رہا تھا۔ انہیں دنوں مارشل لا ختم ہو گیا تھا۔ نئے دستور کے مطابق مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب ہوئے۔ ان میں جو امیدوار جیتے تھے، ان کی حمایت بھی چودھری کو حاصل تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں ممبر سیالکوٹ میں وکالت کرتے تھے اور ان میں سے مرکز کے ممبر کے ہاں سلیمان وکالت سیکھ رہا تھا اور اس نے اپنے علاقے کے بی ڈی ممبروں سے ووٹ اسے دلوائے تھے۔

سلیمان نے ان دونوں ممبروں کی گاؤں میں دعوت بھی کی تھی۔ اس دن شہر سے کچھ اور لوگ بھی آئے تھے۔ ان میں وہ کارخانہ دار بھی تھا جس کے ہاں کبھی مستری کام کرتا تھا۔ یہ سب مہمان کاروں میں سوار ہو کر گاؤں میں آئے تھے۔ دعوت کے بعد چودھری نے گاؤں کے لوگوں کو اپنی حویلی میں اکٹھا کیا۔ چودھری رحمت خاں کو بھی جانا تھا کیونکہ وہ بی ڈی ممبر تھا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ دونوں ممبروں نے باری باری تقریریں کیں اور نئے عہد کی برکتوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے ان اصلاحات کی تعریف کی جن کی وجہ سے پاکستان کی کلیا پلٹ ہونے والی تھی۔ انہوں نے بنیادی جمہوریت کے فائدے گنوائے اور کہا کہ اب سیاست شہروں سے نکل کر دیہات میں آ گئی ہے۔ دیکھئے یہ جو آپ کے ہاں اشتمال ہوا ہے، یہ اس نئی حکومت ہی کا تو کارنامہ ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ آئندہ ایک دو سالوں میں آپ کے گاؤں تک آنے والی سڑک پکی ہو گی، پرائمری سکول کی عمارت بنے گی، لڑکیوں کے لئے سکول کھولا جائے گا اور علاج معالجے کے لئے ڈسپنسری بھی قائم کی جائے گی۔

تب وہ ایک جلوس کی صورت میں گاؤں کی گلیوں میں سے گزرے۔ جب جلوس شیماں کے مکان کے پاس سے گزر رہا تھا، تو سلیمان نے شہریئے کارخانہ دار کو آنکھ کے اشارے سے کچھ کہا۔ میں نے اس کی آنکھ کا پیچھا کیا اور جب میری نظر شیماں کے آنگن تک پہنچی تو میں شیماں کو وہاں کھڑے دیکھ کر ایک پل کے لئے اپنے آپ میں نہ رہا پر شیماں کے علاوہ گاؤں کی اور عورتیں اور لڑکیاں بھی تو اپنے اپنے آنگن میں کھڑی تھیں۔ یہ جلوس ان کے لئے ایک اچنبھے سے کم نہیں تھا۔ چھوٹے سے گاؤں میں ہر نئی بات اچنبھا ہوتی ہے۔ شیماں آنگن سے نکل آئی تو کیا فرق پڑا۔ میں فوراً ہوش میں آ گیا۔ میں نے انکھیوں سے شہریئے کو دیکھا۔ وہ ایک آنکھ میچ کر مسکرا رہا تھا۔

اسی لمحے سلیمان پہلی بار میرے وجود سے باخبر ہوا۔ اس سے پہلے وہ میرے پاس سے یوں بے خبر گزر جاتا رہا جیسے میں راستے کے کنارے کی اُگی ہوئی ببول کی جھاڑی ہوں جو کسی کی نگاہوں میں نہیں چڑھتی۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ پھر بڑے تپاک سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "اس سے ملیے شیخ صاحب!"

شہریا چونک کر میری طرف متوجہ ہوا۔ سلیمان نے مسکرا کر کہا "یہ عبدالرحمن ہے، میرا لنگوٹیا۔" شہریے نے بڑی خوشدلی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔

سلیمان نے شیماں کے آنگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کبھی ہم دونوں اس آنگن میں گولیاں کھیلتے تھے۔"

شہریا مسکرا کر پوچھنے لگا "صرف گولیاں کھیلتے تھے یا کوئی اور کھیل بھی۔"

میں نے کہا "شٹاپو اور گلی ڈنڈا بھی۔"

شہریے نے میری طرف دیکھ کر سلیمان سے پوچھا "گلی ڈنڈا آنگنوں میں کھیلا جاتا ہے کیا؟"

"نہیں تو۔" سلیمان نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے چوہدری عبدالرحمٰن میری بات نہیں سمجھے؟" شہریے نے کہا۔

سلیمان نے کہا "یہ آپ کی بات سمجھ کر بھی نہیں سمجھے گا۔ یہ بچپن سے مولوی رہا ہے۔"

"تب تو ان سے ڈرنا چاہئے۔" شہریا بولا۔

جلوس کا آخری آدمی ماسی ریشم کی گلی کا موڑ مُڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے بجلی کو دیکھا جو سامنے سے لہراتی ہوئی آ رہی تھی۔ اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک بھولی بھولی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی لیکن جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر مر گئی۔ وہ ہمارے پاس سے آنکھیں جھکا کر گزر گئی اور شیماں کے گھر کی طرف چلی گئی۔

"دیکھا شیخ صاحب! اس مولوی کا رعب! بجلی بیچاری کس طرح بجھ کر رہ گئی۔" سلیمان نے کہا۔

"بجلی کون؟" شہریے نے پوچھا۔ ذرا دیر حیران رہنے کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنسا "اچھا تو میں سمجھا آپ اس لڑکی کو جو ابھی لہراتی ہوئی یہاں سے گزری، بجلی کہتے ہیں۔"

تب اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا "یہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتے ہیں جو کھلے ہوئے پھول کو دیکھ لیں، تو وہ بھی مرجھا کر رہ جائے۔"

میں نے کہا "یہ تو رُوڑی کا پھول ہے شیخ صاحب۔ یہ کیا کھلے گا اور کیا مرجھائے گا۔"

شہریے نے شیماں کے آنگن کی طرف دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ اس نے آہ بھر کر کہا

"رُوڑی پر کھلنے والے کچھ پھول سدا بہار بھی ہوتے ہیں۔"

سلیمان نے بات بدلنے کے لئے جلدی جلدی کہا "چلئے شیخ صاحب! ہم جلوس سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ خواجہ صاحب آپ کو جلوس میں نہ پا کر پریشان ہوں گے۔"

اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "خواجہ صاحب جو مرکزی اسمبلی میں ہمارے حلقے کی طرف سے ممبر ہیں، وہ شیخ صاحب سے بہت محبت کرتے ہیں۔ شیخ صاحب شہر کے کارخانہ داروں کی انجمن کے سیکرٹری ہیں اور انتخاب میں وہ خواجہ صاحب کی مدد نہ کرتے تو شاید——"

"بس بس سلیمان صاحب! آپ نے زیادہ تعریف کی تو میں غبارے کی طرح پھٹ جاؤں گا۔" شہریا بولا۔

میرا وہاں سے ایک قدم آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن سلیمان آج میرے ساتھ حد درجہ محبت برت رہا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ شہریے کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا میرے بازو پر اور وہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹے لئے چلا جا رہا تھا۔ میں محبت کے اس دکھلاوے پر حیران تھا۔ مجھے سلیمان کے خلوص پر کبھی اعتبار نہ آیا تھا۔ "اب وہ بڑا آدمی بن چکا ہے، کیا پتہ ہے اب اس کا دل بھی بڑا ہو گیا ہو۔" میں نے سوچا۔

دو چار لمحوں کی ملاقات میں کسی کو ناپ تول کر جانچا نہیں جا سکتا اور کسی کی ظاہری شکل صورت کے آئینے میں اس کے اندر کی کوئی جھلک بھی دیکھنی مشکل ہوتی ہے۔ تاہم کبھی کبھار اچھی شکل سے دل پر اچھا اثر بھی ہوتا ہے۔ شہریا چالیس پینتالیس سال کی عمر کے پیٹے میں تھا۔ وہ کبھی چھریرے بدن کا جوان ہو گا لیکن اب اُس کا جسم موٹا ہو رہا تھا۔ اُس کی ٹھوڑی کے نیچے کا گوشت لٹک آیا تھا اور اُس کے پھولے پھولے گالوں پر مسام صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں تلے کالے کالے حلقے تھے۔ اب بھی اُس کے چہرے پر مُرجھائی ہوئی خوبصورتی دیکھی جا سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور بھیگی بھیگی سی تھیں۔ جب بھی وہ کوئی بات کرتا یا مسکراتا تو اس کی بائیں آنکھ خود بخود میچ جاتی۔ یہ ایک عیاش آدمی کا چہرہ تھا پر یہ بُرے آدمی کا چہرہ نہیں تھا۔ ایسا آدمی اپنے آپ پر پردے نہیں ڈالتا۔ وہ جو کچھ اندر سے ہوتا ہے، وہی باہر سے نظر آتا ہے۔ وہ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بے کلی محسوس نہیں کر رہا تھا۔

اُس نے پوچھا "چوہدری عبدالرحمٰن! آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

میں ہل پنجالی کا نام لینے والا تھا کہ سلیمان نے میری بات میرے منہ سے اُچک لی۔ اس نے سڑک کے کنارے واقع بھٹے کا ذکر کیا اور بتایا کہ عبدالرحمٰن وہاں منشی ہے۔ جب میں نے شہریے کے پوچھنے پر بھٹے کے مالک کا نام بتایا تو اُس نے کہا "میں اُنہیں جانتا ہوں۔ وہ شہر کے معزز آدمی ہیں۔"

اتنے میں ہم جلوس میں جا شامل ہوئے تھے۔ چوہدری شہر کے معزز مہمانوں کو سکول کے لئے الگ کی ہوئی زمین کا موقع محل دکھا رہا تھا جسے انہوں نے پسند کیا۔ جلوس واپس چوہدری کی حویلی میں پہنچا۔ کچھ دیر بعد مہمان رخصت ہونے لگے تو میں نے بھی وہاں سے کھسک جانا چاہا۔ میں نہ جانے کیوں شہریے سے ہاتھ ملانے سے بچ رہا تھا۔ اُس وقت سلیمان نے میرا راستہ روک لیا۔ اُس نے کہا "کچھ دیر کے لئے رُک جاؤ۔ میں تم سے ایک دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے سر ہلا کر اُس کی بات مان لی۔ جب مہمان رخصت ہو گئے تو سلیمان مجھے حویلی کے ایک کونے میں لے گیا۔

اُس نے پوچھا "عبدالرحمٰن! شیفاں کے ساتھ کیا ہوا؟"

"سلیمان! تم خود جانتے ہو۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"اس واقعے میں شیماں کیوں بدنام ہوئی۔"

"یہ بھی تمہیں معلوم ہے۔" میں نے بیزار ہو کر کہا۔

"عبدالرحمٰن! تم گاؤں کی عزت کے پہریدار بنتے ہو اور تمہیں کچھ پتہ نہ لگا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

"سلیمان! تم اب بڑے آدمی ہو۔ بڑی باتیں کیا کرو۔"

"میں نے کون سی چھوٹی بات کی؟"

"چلو چھوڑو اس قصے کو۔"

"جب شیماں شیفاں کو لے کر شہر گئی تھی تو جانتے ہو، وہ کہاں ٹھہری؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"انہیں شیخ صاحب کے ہاں جن سے آج تمہاری ملاقات ہوئی۔"

"یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم اس آدمی کو گاؤں میں لے آئے۔"

"میں اسے لے کر نہیں آیا۔ اسے خواجہ صاحب ساتھ لائے تھے۔"

"اب اس نے گاؤں کا رستہ دیکھ لیا ہے۔ یہ اچھا نہیں ہوا سلیمان!"

"تمہیں تو ہر بات میں کوئی نہ کوئی بُرائی نظر آتی ہے۔ شیخ صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ وہ مستری کی مالی امداد کرتے رہے۔ شیفاں کے ساتھ انہوں نے جو بھلائی کی، اُسے تو نہ بھولو۔"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔"

"تمہارے سننے نہ سننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ شیخ صاحب کے ہاں رہیں۔ شیخ صاحب شیفاں کی مدد نہ کرتے تو تم گاؤں والے ایک دوسرے سے منہ چھپائے پھرتے۔ انہوں نے اپنی عزت کی پروا نہ کی اور شیفاں کو اس کی شرم کے بوجھ سے نجات دلائی۔ اب جب وہ گاؤں میں آ گئے تو تمہاری غیرت کیوں چیخنے لگی؟"

"بس کرو سلیمان! میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔"

سلیمان نے میری بے بسی پر ایک قہقہہ لگا کر مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے چھوٹے پن کے باوجود پھر سچی بات کی تھی پر مجھے جب یہ خیال آیا کہ شیماں تین چار راتیں اس شہریے کے پاس رہی جس کے چہرے پر عیاشی کی کہانی صاف لکھی نظر آتی تھی تو میرا دل گھائل پرندے کی طرح پھڑپھڑایا۔ آج تک شیماں کے متعلق سلیمان نے جو کچھ بتایا تھا، اسے میں سچ جاننے کے باوجود بھی سچ نہیں مان رہا تھا۔

"کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"ہاں! سچ ہے۔" ایک آواز گونجی اور گزشتہ کئی سالوں سے جس لاوے کو میں نے اندر ہی اندر دبا رکھا تھا، وہ میرا سینہ پھاڑ کر بہہ نکلا۔ میں اس کی لپیٹ میں آ کر خود ہی جلنے لگا۔ "اپنے اندر کے جوالا مکھی سے کون بچ سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں—— کوئی بھی نہیں۔" یہ آواز میرے کانوں میں شعلوں کی آواز بن کر چیختی رہی اور میں شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ میں لوگوں سے بچتا رہا، کہیں ایسا نہ ہو کہ دُنیا ان شعلوں کی لپیٹ کو محسوس کر لے۔ میں اپنے بھٹے کی پناہ گاہ میں چھپ گیا۔ یہاں دُنیا کی نگاہوں سے بچنے کے لئے میں نے اپنے گرد دیواریں کھڑی کر لیں اور میرے سر پر چمنی سے نکلنے والے گاڑھے دُھویں کا سایہ تھا۔ میں نے دُھویں کی قبر میں دفن ہونا چاہا تو میرا دم گھٹنے لگا۔

میں اندھیرا پڑے گھر جاتا۔ گاؤں کی گلی میں کوئی دیا ٹمٹماتا تو مجھے بے کلی سی محسوس
ہوتی جیسے مجھے اجالے سے ڈر لگتا ہو۔ پہلے کی طرح اس بار بھی زینت نے میرے من میں
جھانکا اور اس نے آواز دے کر مجھے اس اندھے کنویں سے نکالنا چاہا تو مجھے اس سے ڈر لگا
اس نے پوچھا "آپ دن کے وقت گاؤں میں کیوں نہیں آتے؟" میں نے بیلے پر کام کی
زیادتی کا بہانہ کیا تو زینت مطمئن نہ ہو سکی۔ اس نے یہ نہ کہا کہ یہ جھوٹ ہے، پر وہ رونے
لگی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے لیکن میں اس کے آنسو نہ پونچھ سکا۔ تب اس
نے اپنے آنسو آپ پونچھ ڈالے اور ہنس کر مجھ سے پوچھا "وہ آدمی کون تھا جو شیماں
کے ہاں کل رات چوروں کی طرح آیا؟"

"آدمی؟" میں نے اپنی چیخ کو گلے میں دبا کر پوچھا۔

"آج سارے گاؤں میں اس بات کا چرچا رہا۔"

"مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔"

"ہاں! آپ تو صبح اندھیرے گاؤں سے نکل گئے تھے اور سارا دن بیلے پر چھپے بیٹھے
رہے۔ آپ کو کیسے پتہ چلتا؟" زینت نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔

"میں گاؤں کا چوکیدار تو نہیں زینت۔"

"میں کب کہتی ہوں، آپ چوکیدار ہیں پر آپ اسی گاؤں میں تو رہتے ہیں۔"

"اس آدمی کو کس نے دیکھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" زینت نے بے رخی سے جواب دیا۔

میں نے لالٹین کی دھیمی لو پر نظریں جما دیں اور لو پھڑپھڑانے لگی۔ بند دروازے کی
کسی درز سے کوئی جھونکا در آیا تھا۔ اس میں سردی کی ایک لہر تھی۔ شعلہ ایک لمحے کو ٹھٹھر
سا گیا اور میرے اندر کا لاوا سرد پڑ گیا۔ اب میں برف کی سل کی طرح منجمد ہو چکا تھا اور
مجھے یوں لگا جیسے میں مر گیا ہوں، شیماں مر گئی ہے۔ کہتے ہیں مرنے والے موت سے پہلے اپنی
گزری ہوئی زندگی کی پوری تصویر ایک پل کی جھلک میں دیکھ لیتے ہیں۔ میں نے بھی اس
تصویر کی ایک جھلک دیکھی اور تب ساری دنیا میرے لئے مر گئی۔

دن کی روشنی میں مجھے گاؤں کا ہر نقش بدلا ہوا نظر آیا۔ میں حیران پریشان ہو کر
تھڑے پر جا بیٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے آج میں، میں نہیں، کچھ اور ہوں۔ پر یہ بھید اور کسی کو

معلوم نہ ہوا۔ میں اس دن بیلے پر نہ گیا۔ دوپہر کا کھانا میں نے بھا اسلم کے ساتھ کھایا۔ میں
بے دلی سے کھا رہا تھا۔ اس نے پوچھا "ماہنے! تم بیمار تو نہیں ہو؟"

"نہیں تو۔"

"بظاہر تو ایسا ہی نظر آتا ہے۔"

"فکر نہ کرو بھا! میں بھلا چنگا ہوں۔"

دن ڈھلے تھڑے پر لوگ جمع ہونا شروع ہوئے۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ اٹھ کر
بیلے پر چلا جاؤں پر اس سے بھا کے دل میں شک پڑے گا۔ میں جم کر بیٹھا رہا۔ باتیں شروع
ہوئیں اور بات سے بات نکلتی رہی۔ بات کے ساتھ ساتھ چلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں
نہیں جانتا کب بات موڑ کاٹ کر کل رات کے واقعے پر جا پہنچی۔

چوہدری رحمت خاں نے کہا "فقیرا بات کو دبا ہی گیا۔"

"پھر بھی اتنا تو اس کے منہ سے نکل گیا تھا کہ وہ دو آدمی تھے۔" ایک آدمی نے کہا۔

"میرا خیال ہے، ان میں سے ایک سلیمان ہو گا۔" چوہدری رحمت خاں بولا۔

تب اس نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا "ماہنے! پرسوں تم نے اس شہریے کو
سڑک پر سے گزرتے نہیں دیکھا؟"

"نہیں تو ــــ میں کام میں لگ جاؤں، تو دنیا جہان کو بھول جاتا ہوں۔"

"سلیمان اس کو گاؤں میں کیوں لایا؟" ایک کسان نے پوچھا۔

"تم ہر بات میرے منہ سے کہلوانا چاہتے ہو تو سنو! سلیمان گاؤں میں چکلا کھولنا چاہتا
ہے۔" چوہدری رحمت خاں نے کہا۔

"نہیں! مجھے اپنی آواز پر شک ہوا۔ یونہی کسی پر شک کرنا اچھا نہیں۔ انہیں کس
نے دیکھا؟"

"چوکیدار فقیرو نے۔ اب وہ بات کو چھپانا چاہتا ہے۔ اسے چوہدری کا ڈر ہے۔ اسی
وجہ سے میرا خیال ہے کہ دوسرا آدمی سلیمان ہو گا۔" چوہدری رحمت خاں نے میری طرف
دیکھ کر کہا "اس رات سیداں کے گھر والے بھی اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔"

"یہ اچھا نہیں ہوا۔ چوہدری کو اس کی خبر ملنی چاہئے۔" میں نے مشورہ دیا۔

تب میں نے بھا سے مخاطب ہو کر کہا "بھا! میں بیلے پر جا رہا ہوں۔ آج رات میں

وہیں رہوں گی۔"

"کیوں؟" بھا نے پوچھا۔

میں نے بھا کے سوال کا جواب نہ دیا تو چوہدری رحمت خاں نے کہا "ماہنے! تم ہی پوتی نے جب اپنے مکان کا مطالبہ کیا تھا تو تم نے اس کی حمایت کی تھی۔ اب اس کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں۔" میں نے رحمت خاں کی بات کا بھی جواب نہ دیا تو محفل میں بیٹھے لوگ بڑے حیران سے ہو گئے۔

میں جب گاؤں سے نکل کر کھیتوں میں پہنچا تو اس دن شام نے اچانک مجھے پیچھے سے آ لیا۔ گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔ میں تھرتھراتی ہوئی آواز سے بچنے کے لئے تیز تیز چلنے لگا۔ میرے سامنے کے آسمان پر سردیوں کے موسم کے ایک سفید بادل کو ٹکڑی آگ نے آ پکڑا تھا اور میرے پیچھے سے جتنا جلاتا اندھیرا ٹھاٹھیں مارتا آ رہا تھا' ایک بھوت کی طرح جسے ہم نہ دیکھتے ہیں اور نہ اس کے پاؤں کی چاپ سنتے ہیں' پر وہ دبے پاؤں لپکا آتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے وہ ابھی ہم سے چمٹ جائے گا اور ڈر کے مارے ہماری چیخیں نکل جائیں گی۔

کہتے ہیں ایک آدمی کے اندر دوسرا آدمی بھی ہوتا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے آج میرے اندر کا دوسرا آدمی مجھ سے الگ ہو گیا ہے اور وہ دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ یہ میرا ہمزاد تھا۔ یہ میرا بھوت تھا۔ میں اس سے ڈر رہا تھا۔ میں نے چاہا تھا کہ یہ مجھ سے کبھی الگ نہ ہو۔ "یہ میرا سایہ ہے۔ اسے مجھ سے جدا نہیں ہونا چاہئے تھا۔" میں نے سوچا "اب کیا ہو گا؟" میں نے اپنے ماتھے پر پسینے کی تری محسوس کی۔ میں نے ہمیشہ سے یہی چاہا تھا کہ میں ایک ہوں' ایک رہوں لیکن جب سے شیماں گاؤں میں آئی تھی' میری اکائی ٹوٹ پھوٹ سے دوچار تھی۔ میں ایک سیدھا سادا کسان تھا۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو تہ در تہ پردوں میں نہیں لپیٹا تھا اور جب سے شیماں گاؤں میں آئی تھی' میں ایک چادر کے اوپر دوسری چادر اوڑھ رہا تھا کیونکہ میں ایک رہنا چاہتا تھا اور میں ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

اس ماہنے کا سایہ اس سے جدا ہو گیا تھا جو بچپن سے لے کر اب تک گاؤں کی عزت کا رکھوالا تھا۔ جس نے گاؤں کی کسی لڑکی پر بُری نظر نہ ڈالی' جس نے ماں باپ کی خوشی کے لئے وہیں شادی کی جہاں انہوں نے کہا اور جس کا ایک بچہ بھی تھا' جس کو اپنی بہن

سے پیار تھا' جو ماں کے قدموں تلے جنت کی تلاش کرتا تھا اور جس نے باپ کے سامنے ہمیشہ سر جھکایا' وہ جو گاؤں کا سپوت تھا اور گاؤں کو اس بیٹے پر ناز تھا کیونکہ اس نے گاؤں کو کبھی دھوکا نہیں دیا تھا اور آج اس ماہنے کی کوکھ سے دوسرا ماہنا جنم لے چکا تھا۔ تب میری پشت سے دوسرا آدمی مجھ سے ہم کلام ہوا تو میرا رواں رواں کانپ گیا۔

"ماہنے! رک جاؤ۔"

"نہیں۔"

"میں تمہارا سایہ ہوں۔"

"میں جانتا ہوں پر تم مجھ سے الگ کیوں ہوئے؟"

"نہیں تو ۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ آ رہا ہوں۔ مڑ کو تو دیکھو۔"

"میں نہیں دیکھوں گا۔ میں نے دیکھا تو پتھر بن جاؤں گا۔"

"نہیں ۔۔۔ میں تمہیں زندگی بخشوں گا۔ نئی زندگی۔ نجانے کب کے پیاسے ہو۔ میں تمہارے لئے شہد کا گھونٹ لے کر آیا ہوں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم مجھے زہر کا گھونٹ پلانا چاہتے ہو۔"

"جھوٹ تو تم بولتے ہو۔ تم جھوٹ بول بول کر اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہے۔ تمہارے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی رہیں اور تم انہیں ایک گھونٹ پانی سے تر نہ کر سکے۔"

"میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔"

"جس چشمے سے تمہاری پیاس بجھ سکتی تھی' تم اُسے دور سے تکتے رہے۔"

"ہاں! تم سچ کہتے ہو۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں؟"

"وہ چشمہ زہر سے بھر چکا ہے اور زہر کے قطروں سے ہونٹ تر نہیں ہوتے۔ میں مر جاؤں گا۔"

"ایک بار مر کر بھی دیکھو۔"

"نہیں ۔۔۔ میں ایک بار مرا تو پھر زندہ نہیں ہو سکوں گا۔"

"اس موت کی راکھ سے تمہیں چنگاری کی طرح نئی زندگی ملے گی۔"

"چنگاری تو ادھر جلتی ہے اُدھر بجھ جاتی ہیں۔"

"اسی جلنے بجھنے کا نام زندگی ہے۔"

میں اس کی میٹھی باتوں کے جادو سے بچنے کے لئے سرپٹ بھاگا لیکن وہ میرے پاؤں دابے میرے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔ میں نے بجھنے پر پہنچ کر اینٹوں کے حصار میں پناہ لے لی۔ میں نے کُنیا کا دروازہ کھٹ سے بند کر دیا۔ میں نے سوچا "وہ اب اندر نہیں آ سکتا۔" تب میں نے دروازے کی ایک جھری سے باہر جھانکا۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اُس کا چہرہ اتنا ڈراؤنا ہو گا کہ میرا لہو ڈر کے مارے سوکھ جائے گا۔ اس کے نوکیلے دانتوں سے خون ٹپک رہا ہو گا اور اس کے سُرخ ہونٹوں سے آگ برس رہی ہو گی پر وہ ایسا نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر میٹھی میٹھی مسکراہٹ تھی جس کی دھار میں تیز چھُری کی چمک بھی تھی۔ یہ میرا اپنا ہی چہرہ تھا پر اس پر ریاکاری کا نقاب نہیں تھا۔ اس پل مجھے یوں لگا جیسے میری زندگی کی ہر سچائی میرے ہی چہرے کی چمک بن گئی ہے۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چپکے سے آیا اور اس نے میرے جسم پر پڑی تہہ در تہہ چادروں کو نوچ کر مجھے ننگا کر دیا اور پھر اس نے مجھے آگ میں نہلایا اور پھر وہ میرے اندر سما گیا۔ پر عجیب بات تھی کہ جب میں اور وہ ایک ہوئے تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے اپنی لاش کندھوں پر اُٹھائی ہو۔ تب رات کے اندھیرے نے مجھے پیار بھرا اشارہ کیا۔ میں کُنیا سے نکلا تو اندھیرے نے میری بلائیں لیں اور میرا ماتھا چوم لیا۔

میں گاؤں جانے والی سڑک پر ہو لیا لیکن جب انسان کی "میں" بدل جائے تو وہ سیدھا رستہ اختیار کرنا پسند نہیں کرتی۔ میں سڑک چھوڑ کر پگڈنڈیوں کے اینچ پینچ میں گم ہو گیا۔ رات کے گھپ اندھیرے نے میری راہنمائی کی۔ میں گہری کھائیوں میں سے گزرا، میں بال سے باریک گھاٹیوں کے تلوار کی دھار سے تیز پل صراط پر سے ہوا کے جھونکے کی طرح اُڑتا ہوا چلا گیا۔ میں اندھیری گپھاؤں میں سے اندھیرا بن کر گزرا اور جنگل کے اسرار نے بازو پھیلا کر میرا سواگت کیا۔ پھر میں اس غیر آباد کنوئیں کی پہلی منزل پر آ کر رُک گیا جس کے اردگرد ببول، بیری اور پھلاہی کی جھاڑیاں تھیں اور جہاں بھتنوں، بدروحوں اور چڑیلوں کا ڈیرا تھا۔ یہ سب ناچنے لگیں۔ میں نے خوشی کا ایک قہقہہ لگایا اور اس کی گونج ڈل کی گہرائیوں سے کُلبل کر نکلی اور میرا لہو جوش مارنے لگا جیسے اسے کسی بڑے سے کڑاہے میں دوزخ کی آگ پر اُبلا جا رہا ہو۔

تب میں نے "ڈل" میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں مجھے مستری کی لاش تیرتی ہوئی نظر آئی جس کے کھلے دانتوں پر خوشی کی مسکراہٹ تھی۔ اچانک میرے کندھے سے میری لاش خود بخود کھسکی اور دھڑام سے "ڈل" میں جا گری۔ دور پانی سے چھلاکے کی آواز آئی اور میرے کندھے ہلکے ہو گئے اور میں ہوا کے پروں پر اُڑنے لگا اور پگڈنڈیاں میرے قدموں تلے چیخنے چلانے لگیں۔ ابھی میں نے آنکھ بھی نہیں جھپکی تھی کہ میرا ہاتھ ایک بند دروازے کو پیار سے تھپتھپا رہا تھا۔

بند کواڑوں کی اوٹ سے نیند میں ڈوبی ہوئی ایک آواز آئی "کون ہے؟"

"کون؟ ۔۔۔ ماہتے! تم؟" اب اس آواز میں چونکا ہوا خوف بھی شامل تھا۔

"نہیں۔ میں ماہتا نہیں ہوں۔ اسے تو میں ڈل میں پھینک آیا ہوں۔"

"تم آدھی رات کو یہاں کیوں آئے؟"

"یہاں لوگ آدھی رات ہی کو آتے ہیں۔"

"آدھی رات کو آنے والے چور کہلاتے ہیں۔"

"یہاں جو بھی آیا ہے، چور بن کر آیا ہے۔ دروازہ کھولو۔"

"نہیں ماہتے! میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

"دروازہ کیوں نہیں کھلے گا۔ وہ کون سا دروازہ ہے، جو دستک دینے سے کھل نہ سکتا ہو۔"

میں نے دروازے پر ہاتھ مارا تو کواڑ آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔ ابھی کواڑ کھل بھی نہ پائے تھے کہ میں اندر پہنچ گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا پر میں ہر چیز کو دیکھ رہا تھا کیونکہ میری نظریں اندھیروں کے تو بہ تو پردوں کو چیر سکتی تھیں۔ وہ دور کے ایک کونے میں کھڑی تھی اور ڈر سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا اور اُس کے چہرے پر گرہن لگے چاند کی راکھ اُڑ رہی تھی۔ میں حیران ہوا۔ بھلا اُسے مجھ سے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے اپنے دروازے کی جھری سے جس چہرے کو دیکھا تھا، اس پر بڑی دل لبھانے والی مسکراہٹ تھی لیکن شاید آئینے بدل جانے سے چہرے بھی بدل جاتے ہیں۔ اُس کے آئینے میں مجھے اپنا چہرہ خود بہت ڈراؤنا لگا۔ اُس کے ہونٹوں پر لہو کی آنچ تھی اور زبان سے شعلے لپک رہے تھے۔

میں اُس کی طرف بڑھا تو اُس نے اپنی چیخ کو گلے میں گھونٹ کر کہا "ماجے! رک جاؤ۔ دن کے اُجالے میں آنا۔ میں اس دروازے پر کھڑی تمہیں مسکراتی ہوئی ملوں گی۔"

"مجھے دن کے اُجالے سے ڈر لگتا ہے اور پھر یہاں جو بھی آیا رات کا چور بن کر آیا۔"

"ماجے ٹھیک کہتے ہو پر ان چوروں کو کیا ملا؟"

"انہوں نے چشمے سے سیر ہو کر پانی پیا اور جو چور نہ بنا اس کے پیاسے ہونٹ تر نہ ہو سکے۔"

"ماجے! تم تو چور بن کر نہ آتے! تم نے اچھا نہیں کیا۔" اُس کی آواز میں سات سمندروں کا پانی تھا۔ وہ دھیرے دھیرے میری طرف بڑھی۔ اُس نے میرے گلے میں بازو ڈال دیئے۔ اُس نے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ اُس کے سارے آنسو میرے کندھوں پر ڈھلک گئے۔ تن کی تر آگ نے میری آگ کو بھسم کر ڈالا۔ راکھ سے چنگاریاں اُڑیں اور جلتے بجھتے گئیں اور اندھیرا گہرا ہو گیا اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ایک آواز نے میرے کان میں سرگوشی کی "ماجے! اب آؤ تو دن کے اُجالے میں آنا۔"

میرے سائے نے کہا "اس کی بات نہ ماننا۔"

میں اسی پل میں "ڈل" کے منہ پر کھڑا تھا اور روحیں مجھے گھیرے میں لے کر ناچ رہی تھیں اور ڈل کی تہہ میں مجھے اپنی لاش تیرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور اپنے آپ سے کہہ رہا تھا "اب میں اس ماجے کو کبھی نہیں پا سکوں گا جو دن کی روشنی سے ڈرتا رہا پر جس نے رات کا چور بھی نہ بننا چاہا۔"

تب مشرق سے اُجالا پھوٹا اور اذان کی آواز آئی۔ روحیں ڈر کر بھاگیں اور کونے کھدروں میں جا چھپیں اور "ڈل" کا پانی اُوپر کو کھل گیا اور اُس نے میری لاش کو اُگل دیا۔ میں اسے کندھوں پر اٹھانے کو جھکا تو میرا سایہ تڑپ کر مجھ سے الگ ہو گیا اور میں پھر اپنی "جُون" میں آ گیا۔

میں نے کہا "شیماں! اب میں دن کے اُجالے میں آؤں گا۔ میں رات کا چور نہیں بنوں گا۔"

○ ○ ○ ○

باب ۲۱

○

اور اُس سہ پہر کو تھڑے کی محفل میں میں نے ایک عجیب خبر سنی کہ رات پھر کوئی شیماں کے گھر آیا اور جب وہ وہاں سے نکلا تو چوکیدار فقیرو نے اُسے دیکھ لیا۔

میں نے پوچھا "فقیرو نے اُسے کیوں نہ للکارا؟"

"وہ یہی سمجھا ہو گا کہ یہ سلیمان کا مہمان ٹھہرا ہے۔ وہ اُسے پکڑ لیتا تو چوہدری کی بدنامی ہوتی اور بیچارہ فقیرو مفت میں مارا جاتا۔" ایک آدمی بولا۔

"وہ ٹھہرا نہیں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"چوہدری نے سلیمان سے کہہ دیا ہے کہ اب وہ شہریے کو کبھی گاؤں میں لے کر نہ آئے۔"

میں مسکرانے لگا تو بھانے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ میں مسکراتا رہا تو بھانے آنکھیں جھکا لیں۔

میں نے کہا "فقیرو نے کسی چھلاوے کو دیکھا ہو گا۔"

"ماجے!" بھانے بڑی خشک سی آواز میں مجھے ٹوکا۔

"کہو بھا!"

"کچھ بھی نہیں۔" بھانے اپنے اندر گُم ہوتے ہوئے کہا۔

"نتھو کی پوتی کو گاؤں سے نکال دینا چاہیے۔ اُس نے گھر میں چکلا کھول لیا ہے۔ وہ گاؤں میں رہی تو ہر لڑکی کو پیچھے بٹھا دے گی۔"

"اسے گاؤں سے نکال دو۔"

یہ آواز گاؤں کے ہونٹوں سے نکلی اور گلی گلی، کھیت کھیت، کوٹھے کوٹھے پھیل گئی۔
یہ آواز گاؤں کے بڑوں کی زبان پر تھی، چھوٹوں کی زبان پر تھی، عورتوں کی زبان پر تھی، بچوں کی زبان پر تھی۔ میں جس طرف گیا، اس آواز نے لپک کر میرا راستہ روک لیا۔ گلی گلی نے میرے کان میں سرگوشی کی "تم بھی اس آواز میں شامل ہو جاؤ۔"

میں نے کان بند کر لئے تو آواز گولے کی طرح پھٹی "اسے گاؤں سے نکال دو۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر تم بھی گاؤں چھوڑ جاؤ۔"

جب شور اتنا بڑھ گیا کہ سارا گاؤں اس میں ڈوبنے لگا تو چوہدری شرف دین کو اپنی حویلی میں پنچایت بلانی پڑی۔ وہ گاؤں کے اس شور سے ذرا سہما سا معلوم ہوتا تھا۔ پنچایت میں دونوں دھڑے شریک ہوئے۔ میں بھی شامل ہوا۔ لوگوں کا ایک ہی مطالبہ تھا "اسے گاؤں سے نکال دو۔" میں جانتا تھا کہ پنچایت کیا فیصلہ کرے گی۔

"چوہدری شرف دین نے پوچھا "کوئی آنے سے تو نہیں رہ گیا؟"

لوگوں نے کہا "نہیں! سب لوگ آ گئے ہیں۔"

چوہدری نے کہا "لمبی چوڑی بحث کی کیا ضرورت ہے؟ ہم سب جانتے ہیں کہ گاؤں والوں کا فیصلہ کیا ہے۔"

کچھ نوجوانوں نے لاٹھیوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "یہ کنجری گاؤں سے نہ نکلی، تو ہم اس کا خون کر دیں گے۔"

اچانک اس پل مجھے غصہ آ گیا اور یہ پل سوکھے کھلیان کی طرح دھڑ دھڑ جلنے لگا تو میں نے کہا "شیماں کے گاؤں سے نکل جانے کے بعد کیا گاؤں پاک صاف ہو جائے گا؟"

سب نے ایک زبان ہو کر کہا "ہاں!"

میں نے کہا "نہیں۔ کھیت کو جڑی بوٹیوں سے پاک کرنا ہو، تو ایک بوٹی کو نکال دینے سے کچھ نہیں بنتا۔ ان سب بوٹیوں کو اکھاڑ پھینکو جنہوں نے کھیت کو بیمار کر دیا ہے۔"

"وہ کون ہیں؟"

"سیداں بگلی اور شیداں ڈھولک۔"

یہ نام سن کر بگلی اور ڈھولک کے رشتہ داروں کا خون کھول اٹھا۔

انہوں نے کہا "خبردار! جو کسی نے ہماری لڑکیوں کا نام لیا۔ ہم اس کی زبان کاٹ دیں گے۔"

میں نے کہا "وہ بیچاری اکیلی اور بے آسرا ہے نا۔ اس کا بھی کوئی حمایتی ہوتا تو آج یہ پنچایت نہ بیٹھتی۔"

"موج دین کے بیٹے! چپ رہ۔ تو بھری پنچایت میں سارے گاؤں کے منہ پر تھوک رہا ہے۔" چوہدری نے کہا۔

میں نے جواب دیا "اشتمال کے دنوں میں ہم سب ایک دوسرے کے منہ پر کالکھ دیکھتے رہے اور کچھ نہ بولے کیونکہ ہمیں ڈر تھا کہ جس نے بھی زبان کھولی، پٹواری اس کے کھاتے میں بنجر زمینیں ڈال دے گا۔ تمو کی پوتی نے تم پر جو احسان کیا ہے، اسے تم بھول گئے۔"

"چپ رہو ماہنے!" میرا باپ طیش میں آ کر گرجا۔ میری زندگی میں یہ پہلی بار تھی کہ اسے اتنا غصہ آیا۔ میں کانپ گیا۔ میں نے بھری پنچایت میں ہر چہرے کو پڑھا۔ مجھے کسی چہرے پر اپنے لئے ہمدردی کا کوئی لفظ لکھا ہوا نظر نہ آیا۔ میں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر بھا اسلم کی آنکھوں سے آنکھیں ملانی چاہیں۔ اس نے آنکھیں پھیر لیں اور نہ جانے کیا ہوا کہ میرے اندر کا باغی پل میں شوں شوں بجھ گیا۔

چوہدری نے بڑی رسان سے کہا "عبدالرحمن تم جوان ہو اور جوانوں کی سوچ پر عقل کا پہرہ نہیں ہوتا۔ تمہارے بزرگ یہاں بیٹھے ہیں۔ انہیں فیصلہ کرنے دو۔"

میں نے آنکھیں جھکا لیں کیونکہ اب میں اپنے آپ سے شرمسار تھا۔

لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہوئی۔ یوں لگا جیسے شہد کے چھتے میں مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔

اچانک ماسی ریشم پنچایت میں آ دھمکی۔ اسے دیکھ کر بجتے ہوئے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگ گئی۔ ماسی آتے ہی پھٹ پڑی "او اونچے طرّے والے! ان لوگوں کو تو نے اکٹھا کیا ہے؟"

"نہیں تو ریشم بی بی اے! گاؤں والوں نے کہا اور میں نے پنچایت بلا لی۔"

بابا حیات نے کہا "ریشم تو یہاں کیوں آئی؟ عورتوں کا مردوں میں کیا کام؟ جا گھر جا کر

بیٹھ جا۔"

"بابا! میرے گھر میں کوئی مرد ہوتا تو میں اُسے بھیجتی۔ اب بابا میں نہ آتی تو میرے گھر سے اور کون آتا؟"

چوہدری رحمت خاں نے بڑے میٹھے لہجے میں اسے گھر جانے کا مشورہ دیا تو ماسی نے کہا "اچھا! تو تُو بھی اس فریبی کی باتوں میں آ گیا۔"

پھر وہ میرے باپ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔ "مہر دین! تُو بھی؟"

"ہاں میں بھی! دیکھتی نہیں ہو۔ سارا گاؤں پنچایت میں آیا ہے۔ میں نہ آتا تو اچنبھے کی بات ہوتی۔"

"تم سب پر اونچے طرّے والے کا جادو چل گیا ہے۔ ماجے! تُو بھی دیس نکالا دینے والوں میں شامل ہو گیا؟"

"ہاں ماسی! جب سارا گاؤں ایک طرف ہو جائے، تو میں اکیلا کس کونے میں چھپا رہتا؟"

"مہاجر لڑکے! تُو تو سب کے لئے ساجھا تھا۔ تُو یہاں کیوں آیا؟"

"اب میں چک مراد کا بیٹا ہوں۔ اس کے بھلے کے لئے جو کام بھی ہو گا، میں اس میں ساجھی ہوں گا۔"

ماسی کے چہرے پر مایوسی کی ایک لہر آئی۔ اس کا نچلا ہونٹ کانپا جسے اس نے دانتوں تلے دبا لیا۔ میں نے جانا کہ ماسی سوکھی گھاس سے اُٹھنے والے شعلے کی طرح بھڑک کر اچانک بجھ گئی ہے پر میرا خیال ٹھیک نہ نکلا۔ اس نے سارے مجمعے کو ایک نظر دیکھا اور پھر چوہدری کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ دی۔ چوہدری زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ اچانک اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مر گئی۔

ماسی نے بڑے دھیمے لہجے میں اس سے پوچھا "اونچے طرّے والے! تیرا بیٹا کئی پنچایت میں نہیں آیا؟"

"تو کیوں پوچھتی ہے؟ میری مان تو یہاں سے چلی جا۔ نہیں تو ـــ"

"نہیں تو کیا ہو گا؟"

"لوگ تجھے زبردستی اُٹھا کر پھینک دیں گے۔"

"کون لوگ؟" ماسی نے بس بھرے لہجے میں کہا "یہ لوگ!ـــ سنو لوگو! میرا تمہارے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں۔ میں تو اس سے دو دو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"یہ چپ نہیں ہوتی تو اس ڈائن کو بھی گاؤں سے نکال دو۔" سیداں بگلی کے باپ نے کہا اور سارے گاؤں نے شور مچا کر اُس کا ساتھ دیا۔ تب ماسی کو غصہ آ گیا۔ اُس نے گاؤں کے ایک ایک آدمی کا نام لے کر اُس کا کچا چٹھا سنا دیا۔ کسی کی بیوی کے یار گن ڈالے، کسی کی بہو کے متعلق بتایا کہ وہ کس کھیت میں کس کے ساتھ پکڑی گئی تھی۔ جب اس نے سیداں بگلی اور شیداں کا نام لیا تو لوگ سہم کر چپ ہو گئے۔ اُس نے کہا "اونچے طرّے والے ان کے ساتھ اپنے لاڈلے نکّی کو بھی گاؤں سے نکال دے۔ جانتا ہے جب سیداں گاؤں سے غائب رہی تھی تو وہ کہاں اور کس کے پاس گئی تھی؟"

"لوگو! یہ عورت چپ نہ ہوئی تو میں پنچایت سے اُٹھ کر چلا جاؤں گا۔" چوہدری نے چیخ کر کہا۔

"جا! اُٹھ کر چلا جا۔ تو کون سا سچ لے کر بھری پنچایت میں بیٹھا ہے؟"

"اب میں اس کی باتیں سن نہیں سکتا لوگو! اس کا منہ بند کرو۔"

"سچی بات کڑوی ہوتی ہے نا! تو بھلا کیسے سن سکے گا؟ لوگو! ذرا اس اُجلے کپڑوں والے سے پوچھو تو، اُس نے کس کا گناہ مستری کی جھولی میں ڈال کر اُسے گاؤں سے نکالا تھا؟"

چوہدری کا چہرہ جو ایک پل پہلے غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا، یکایک کورے کاغذ کی طرح سفید پڑ گیا۔ تب کاغذ یوں تڑمڑ ہو گیا جیسے کسی نے اسے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ وہ چارپائی پر سے اٹھا پھر بیٹھ گیا جیسے اُس کی ٹانگوں میں کھڑا ہونے کی سکت باقی نہ رہی ہو۔

اُس نے رُک رُک کر کہا "اس ڈائن کو پنچایت سے نکال دو۔"

بابا حیات بولا "رحیم! تُو جانتی ہے، تُو نے چوہدری پر کتنا بڑا الزام لگایا ہے؟"

"ہاں! میں جانتی ہوں۔" ماسی نے آنکھوں میں آگ بھر کر کہا۔

"جو یہ بات سچی نہ نکلی تو تیری سزا؟"

"وہی جو کالے چور کی ہوتی ہے۔ میرا منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا اور مجھے گلی گلی پھرانا۔ کسی سے کہو دینے اور جھنڈو کو پنچایت میں لے آئے۔ ان کے سر پر قرآن رکھ

کر پوچھتا۔"

ہر طرف سے "نہیں۔ نہیں——" کا شور اٹھا اور میں اُس شور میں ڈوب گیا۔ زمانے کا چکر اُلٹا چلا تو ایک افواہ نے چمگادڑ کی طرح پر پھڑپھڑائے۔ رات کا منحوس پرندہ چیخنے لگا تو میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ "نہیں یہ بات سچ نہیں ہو سکتی۔ ماسی ریشم نے جو کچھ کہا ہے، جھوٹ کہا ہے۔" مجھے اپنی آواز پر اعتبار نہ آیا تو میرے کان میں بھا اسلم کی یہ بات گونجنے لگی۔ "وہ کون تھا جس نے ایسا کیا؟ مانجے! وہ میں نہیں تھا۔ وہ تو نہیں تھا۔ گئی نہیں تھا اور کیا پتہ وہ مستری بھی نہ ہو جس کا نام گاؤں کی زبان پر چڑھ گیا ہے۔"

میں نے اپنی یاد کی تصدیق کے لئے بھا اسلم کی طرف دیکھا۔ اُس نے میرے ساتھ آنکھیں ملانے سے انکار کر دیا۔ میں نے سوچا "ابھی ابھی جس خیال کی آگ میں سے گزرا ہوں، کیا اب بھا اسلم بھی اسی میں سے نہیں گزر رہا؟ اچھا ہوا! ماسی نے اُس بھید پر سے پردہ اٹھا دیا۔" یکایک میرے دل پر خوشی کی شبنم سی برس گئی اور میرا تن بدن ایک عجیب لذت سے بھر گیا "آج چوہدری سے ہم نے انتقام لے لیا ہے۔"

چوہدری نے ہمارے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں، وہ ایک ایک کر کے مجھے یاد آنے لگیں۔ ان کا سلسلہ بہت لمبا تھا۔ اس کے ساتھ انتقام کی لذت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

تب چوہدری بھری پنچایت سے یوں اٹھا جیسے اُس نے اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھا لی ہو۔ اُس کی مونچھوں کے کَل ڈھیلے پڑ گئے تھے اور وہ اپنی ذلت پر روتی بسورتی نظر آ رہی تھیں۔ اُس کے چہرے پر ان گنت جھُریوں نے جال سا تن دیا تھا اور ایک لمحے کے اندر اندر بڑھاپے نے لپک کر اُسے آ لیا تھا۔ اُس نے سارے مجمعے پر ایک نظر ڈالی اور مجھے اُس کی آنکھوں میں پہلی بار اس بے بسی کی جھلک نظر آئی جو غرور کی راکھ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس نے دھیمی زبان میں کہا "لوگو! میں ایک عورت سے لڑنا نہیں چاہتا۔" یہ کہہ کر اُس نے پگڑی کے پلّو سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور اپنے گھر میں گھُس کر اُس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور نہ جانے کیا ہوا، میرا کرودھ میرے منہ میں نیم کی طرح کڑوا ہو گیا اور میرا من اس دیے کی طرح بجھ گیا جس کی بتی میں تیل سوکھ گیا ہو۔

"میں اتنا دُکھی کیوں ہو گیا ہوں؟" میری سوچ نے مجھ سے پوچھا۔

"تم بھی تو اندھیری رات کا چور بنے تھے۔" میرے سائے نے جواب دیا۔

"چلے جاؤ۔ خدا کے لئے چلے جاؤ۔ تم یہاں کیوں آ گئے؟ بھری پنچایت میں مجھے رسوا کیوں کرنا چاہتے ہو۔" تب میری سوچ نے چیخ کر اس سے پوچھا۔

"اپنے آپ کو دھوکا نہ دو۔" میرا سایہ بولا۔

"تم نہیں جاؤ گے تو میں چیخ چیخ کر کہوں گا 'لوگو! اصل گنہگار تو میں ہوں۔ تم مجھے خدا پر کیوں نہیں کھینچتے؟ اُس بے بس لڑکی کو پہلا دیس نکالا بھی تو میں نے دیا تھا کیونکہ میں چناں پار سے اُسے آواز نہ دے سکا تھا۔ میرے اور اُس کے درمیان ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا تھا اور میں اُسے پار نہ کر سکا کیونکہ میں ایک جاٹ کا راٹھ بیٹا تھا اور اُس نے ایک کمیرے کے گھر میں جنم لیا تھا اور آج تم اُسے دوسری بار میری وجہ سے گاؤں سے نکال رہے ہو کیونکہ اُس رات کا چور بھی تو میں ہی تھا۔

میرے سائے نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ نہیں یہ میرا سایہ نہیں تھا۔ وہ تو میرے منہ سے سچ بات سن کر میرے اندر سما گیا تھا۔ وہ یہی بات تو مجھ سے کہلوانا چاہتا تھا۔ پر میرے منہ پر ہاتھ کس نے رکھا۔ یہ میرے باپ کا ہاتھ تھا یا میری ماں کا جس کے دودھ کی لاج میرے ہاتھ میں تھی یا یہ زینت کا ہاتھ تھا جو اپنے سہاگ کی مانگ میں رسوائی کی کالکھ نہیں لگانا چاہتی تھی۔ نہیں—— یہ اُس معصوم بچے کا ہاتھ تھا جس نے ابھی ابھی میری کوکھ سے جنم لیا تھا—— نہیں—— میں نہیں جانتا—— میں جانتا ہوں، یہ کون تھا۔ یہ ایک شریف باپ کا شریف بیٹا تھا جس نے اپنے چہرے پر ریاکاری کا نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا کیونکہ وہ گاؤں کا سپوت اور اس کی عزّت کا رکھوالا تھا۔ جو میں ذرا سی آواز بھی نکالتا، تو وہ میری زبان گُدّی سے کھینچ لیتا—— میں نے ایک گھٹا گھٹا سانس لیا اور ماتھے سے ندامت کا پسینہ پونچھا تو بھا نے میری طرف دیکھا اور اُس کا چہرہ غم سے اُتر گیا۔

پھر لوگوں نے ایک آواز ہو کر فیصلہ دے دیا۔

"نتھو کی پوتی کو گاؤں سے نکال دو۔"

بھری پنچایت سے نکلنے والا دوسرا آدمی میں تھا کیونکہ میں اس فیصلے کے خلاف کوئی احتجاج نہ کر سکا تھا۔ میں نے پگڑی کے پلّو سے نہیں، اس نقاب سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا جس کو میں نے ابھی ابھی اوڑھا تھا۔ چوہدری اپنے گھر میں چھُپ گیا تھا۔ میں اپنے گھر بھی نہ جا

سکا۔ میں نے رانجھے کی طرح جوگ لے لیا پر میں نے نہ کان چھدوائے' نہ کسی بالناتھ کا دیا
بنا۔ میں نے بیٹھے پر پہنچ کر اینٹوں کا حصار اپنے گرد کھڑا کیا۔ میرے سر پر چمنی سے نکلنے والے
گاڑھے دھوئیں نے تنبو سا تن دیا۔ میں نے سوچا "کچھ بھیدوں کو ہم اوڈی میں چھپا کر رکھیں
ڈالا دے دیتے ہیں' کچھ کو ہماری اندھیری راتیں بارہ پتھر کر دیتی ہیں۔"

سارے گاؤں میں سے ماسی ریشم نے شیماں کا ساتھ دیا تھا۔ وہ جس طرح نکے پر
بٹھا کر اُسے شہر سے گاؤں بلا لائی تھی' اسی طرح وہ اُسے پھر شہر چھوڑ آئی۔ تب وہ گاؤں کے
ایک ایک آدمی کے گھر گئی۔ اُس نے کہا "اب تو گاؤں پاک صاف ہو گیا ہے؟؟ اب اپنے
طرّے اونچے کر لو۔ پر آئندہ اپنی عزت کے موتیوں کو ڈبیا میں بند کر کے رکھنا۔ کیا پتہ کس
چور کی کب اس پر نظر پڑ جائے؟"

وہ میرے پاس بھی بیٹھے پر آئی۔

اس نے پوچھا "ماہنے! تو نے کیوں گاؤں چھوڑ دیا ہے؟"

"ماسی! میں گاؤں کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟"

"لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔"

"کرتے رہیں۔ یہاں اُن کی بات میرے کان تک نہیں پہنچ سکتی۔"

"نہیں ــــ گاؤں میں چلے آؤ۔ بچاری لڑکی دکھ سے اندر ہی اندر گھل رہی ہے۔"

"کون لڑکی؟"

"وہی بچاری جو تمہارے "نُو" لگ کر آج تک سکھ نہ پا سکی۔"

"ماسی تم زینت کی بات کر رہی ہو نا؟"

"ہاں! ماہنے!"

"میں نے اُسے کون سا دکھ دیا ہے؟" میرا لہجہ پیسے کی طرح کُند تھا۔

ماسی ایک لمحے تک میرے چہرے کو ٹٹولتی رہی۔ پھر اُس نے پوچھا "ماہنے! ایک بات
بتا اس اندھیری رات کا چور کون تھا؟"

"مجھے کیا پتہ ماسی! تم اُس سے پوچھتیں۔"

"اُس نے کچھ نہیں بتایا ماہنے۔ اُس نے ہونٹ سی لئے ہیں۔"

میں نے ٹھنڈی آہ بھری' تو ماسی چونک گئی۔ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکنا چاہا تو

میں نے منہ پھیر لیا۔

"ماسی! تم شہر میں اُسے کس کے پاس چھوڑ آئی ہو؟"

"اس کے پاس؟ یہ تم پوچھ رہے ہو ماہنے! جانتے بوجھتے ہوئے کیوں پوچھتے ہو؟"

"ہاں ماسی! میں جانتا ہوں' تم اُسے کس کے پاس چھوڑ آئی ہو۔ کیا پتہ وہی ہم سب
سے اچھا ہو۔ ہم گھر کی کسی گندی چیز کو روڑی پر پھینک دیتے ہیں یا جوہڑ میں غرق کر دیتے
ہیں تو ہمارے لئے اُس کا وجود یوں مٹ جاتا ہے جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ گوڑا اسے کھا
جاتا ہے' پانی اسے گلا ڈالتا ہے۔"

"ہاں ماہنے! تمہاری بات سچ ہے۔ میں اسے بھرے شہر میں غرق کر آئی ہوں۔ اب
وہ گاؤں کبھی نہیں آئے گی۔"

اور ماسی کو میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار روتے دیکھا۔ یہ چپ چاپ سی پرکھا کا
مینہ تھا پر اُس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو سیلاب بن کر اُمڈے اور میں تنکا بن کر بہا
تو دور تک مجھے کنارہ نہ ملا۔

گاؤں کے ساتھ میرا ذرا سا تعلق عبدالغفار کے ذریعے قائم تھا جس کے ہاتھ ماں مجھے
کھانا بھیجتی تھی۔ وہ مجھے گاؤں کی خبریں سناتا۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ ماسی بیمار ہے۔
میں نے اس خبر پر کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ کیا تو وہ حیران ہوا۔ اُس نے پوچھا "بھا! تم
نے گاؤں کے ساتھ ناطہ کیوں توڑ لیا ہے؟" میں نے اس کی طرف بے بس سی نظروں سے
دیکھا تو اس نے کہا "اب تو نمانا بچہ بھی تماشے کرتا ہے۔ کنکریاں مارتا ہے اور سب کی طرف
ہنستا ہے' تو ماں کہتی ہے' پتہ نہیں ماہنے کا دل پتھر کیوں ہو گیا ہے۔ اُس نے تو گھر نہ آنے
کی قسم کھا رکھی ہے۔ بھا! بتاؤ نا تم گھر کیوں نہیں آتے؟" میں عبدالغفار کو اپنا محرم نہیں بنانا
چاہتا تھا اس لئے میں چپ رہا۔ میرا محرم تو بھا اسلم تھا لیکن جب سے ہم رشتوں کے اونچ نیچ
میں بکھرے گئے تھے' میرا اُس سے اصل رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ بھا نے مجھے گاؤں آنے کے لئے
کوئی پیغام نہ بھیجا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ ماہنا جوگ لے کر بالناتھ کے ٹلے سے اپنے آپ
اُترے گا تو وہ رنگپور نہیں' جھگی سیالاں میں آئے گا پر ابھی گاؤں میں ایک رشتہ باقی تھا اور وہ
تھا ماسی کا رشتہ اور ماسی بیمار تھی۔ کیا پتہ یہ رشتہ بھی ٹوٹ جائے۔ میں اس خیال پر کانپ
اُٹھا۔

تب ایک دن بے چین سا ہو کر میں اپنے حصار سے نکل آیا۔ یہ سردیوں کا ایک دن تھا اور دھوپ میں ٹھنڈک رچی ہوئی تھی۔ شمال کی طرف نیلم کی دیواروں پر برف کی ٹھنڈی قلعی چمک رہی تھی اور آسمان کی بے داغ نیلاہٹ تلے ساری فضا میں آئینے کی سی صفائی تھی کہ اس میں اپنا منہ نظر آتا تھا۔ ایسے موسم میں نیلم کی دیواریں دل کے قریب آ جاتی ہیں اور جب وہ دل سے آ ٹکراتی ہیں تو بچپن کی میٹھی یادیں لوٹ آتی ہیں اور اُس زہر کو چوس لیتی ہیں جو زندگی کو اُس کی مٹھاس سے محروم کر دیتا ہے۔ میری نظروں کے سامنے دور تک گاؤں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں گندم کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کہیں کہیں کماد کے کھیت سرسرا رہے تھے، گہرے سبز کھیت۔ میں ان کے پاس سے گزرا تو سرسراتی ہوا نے میرے کانوں میں سرگوشیاں کیں۔ ان سے انجانے گیتوں کی لے ابھری۔ پگڈنڈیاں گانے لگیں اور میں ہلکا پھلکا ہو کر اُڑنے لگا۔

پر جب میں جوہڑ کے کنارے کنارے چلتا ہوا بھا اسلم کی دکان کے پاس پہنچا تو گلی کی ویرانی نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ دکان بند تھی اور تھڑا سُونا اور سنسان تھا۔ گلی کے ایک موڑ پر سنسناتی ہوا کے ایک جھونکے نے میرے کان میں کہا "تو گاؤں میں کیوں آیا؟" میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں گلیوں سے گزرتا رہا اور آخری گلی یکایک ختم ہو گئی۔ اس سے کچھ دُور میں نے سارے گاؤں کو اکٹھا دیکھا۔ آج سارا گاؤں قبرستان میں آباد نظر آ رہا تھا۔ ایک بستی اُجڑے تو دوسری بس جاتی ہے۔ تب نیلم کی دیواریں مجھ سے دَور ہٹ گئیں اور میرا مَن سُونا او سنسان ہو گیا۔

اس دن قبرستان میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا!

میں اُس کا چہرہ آخری بار دیکھنے کی جرات نہ کر سکا۔ مُردہ لوگوں کے چہروں سے مجھے ڈر لگتا ہے اور یہ تو ماسی کا چہرہ تھا جسے میں اُس وقت سے زندہ دیکھنے کا عادی چلا آ رہا تھا جب سے مجھے دیکھنے کی نظر ملی تھی۔

اور تب میں نے جانا کہ آج سے میری اور شیماں کی کہانی ماسی کے ساتھ اُسی کی قبر میں دفن ہو گئی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۲۳

○

یہ برسات کے موسم کی ایک رات تھی!

لیکن اس رات میں برسات کی خُنکی نہیں تھی، نہ وہ حبس تھا جو ہوا کے سانسوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے کیونکہ پندرہ بیس دنوں سے بارش کا ایک چھینٹا بھی نہیں پڑا تھا اور یہ رات اوس کی نمی سے بھی محروم تھی اور فضا میں گرد سی چھائی تھی—— ایک مہین سی دُھول—— اس دھول میں ایک خطرے کا سایہ بھی منڈلا رہا تھا—— دُور چھمب جوڑیاں میں توپیں گرج رہی تھیں—— ان بجلیوں کی طرح جو اُڈتے بادلوں میں مسلسل گھن گرج بن جاتی ہیں—— ایک گڑگڑاہٹ جس سے کڑک کی وہ آواز نہیں آتی جو زمین کر دہلا دیتی ہے اور کانوں کو بہرہ کر دیتی ہے۔

چھمب جوڑیاں کا علاقہ ہم سے بیس پچیس میل دُور تھا اور جنگ کے میدان اور ہمارے درمیان چناب کی بپھری ہوئی موجیں حائل تھیں۔ ہم خطرے سے دُور تھے لیکن مسلسل گڑگڑاہٹ وَرمے کی طرح ہمارے سکون کو چھیدتی چلی جا رہی تھی جیسے کوئی سیلاب اُڈ کر آ رہا ہو اور وہ دھیرے دھیرے ہمیں اپنی لپیٹ میں لینا چاہتا ہو۔ جب سورج نکلتا اور زندگی جاگتی تو گڑگڑاہٹ کا شور اس کے نیچے دب کر رات کا بھیانک خواب بن جاتا۔ وہ خواب جو بھوت کی طرح چمٹ جاتا ہے اور سائے کی طرح ساتھ لگا رہتا ہے۔ دن کو ہم ریڈیو سنتے رہتے اور بھا اسلم جب کبھی شہر سے ہو کر آتا وہ اخبار کے ساتھ ڈھیروں خبریں بھی لے کر آتا۔ ان خبروں کو سن کر ہم آنے والے خطرے کو بھول جانے کی کوشش کرتے۔

اُس رات سے تین چار دن پہلے ہم نے پہلی بار ہوائی جہازوں کو گاؤں کے اوپر سے اُڑتے دیکھا تھا۔ اتنی گڑگڑاہٹ کہ کلیجہ منہ کو آ گیا۔ یہ جہاز چھمب جوڑیاں جا کر بم گراتے اور دُور جہاں زمین اور آسمان کے کنارے ملتے ہیں، درختوں کی پُھننگوں کو چھو کر نظروں

سے اوجھل ہو جاتے۔ ہم اس نظارے سے مانوس ہو گئے تو ہم صبح کا اُجالا پھیلتے ہی آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے اور ہوائی جہازوں کا اُڑنا ہمارے لئے ایک تماشا بن گیا۔ ہم نے اس رات سے دو دن پہلے دشمن کے ایک ڈولتے ہوئے جہاز کو آگ لگتے اور دُور کہیں دھویں کا مرغولہ بن کر زمین کی طرف گرتے دیکھا اور ہم نے خوشی سے تالیں بجائیں اور اس سے اگلے دن ہم نے ریڈیو پر سنا کہ دشمن نے چُپکے چوری لاہور پر حملہ کر دیا ہے اور ہماری فوجوں نے حملے کو روک لیا ہے تو ہمیں کسی خطرے کا احساس نہ ہوا کیونکہ ہم محاذ سے دُور تھے۔

پر اُس رات جنگ نے ہمیں اچانک چُپکے سے آ لیا!

جب مسجد سے اذان کی آواز آئی' تو جموں کی سرحد سے آنے والے لوگوں کا پہلا قافلہ ہمارے گاؤں میں پہنچا۔ ان کے سروں پر گٹھڑیاں تھیں اور وہ اپنے ڈھورڈنگروں کو ہانک لائے تھے۔ سورج نکلنے سے پہلے پہلے ہمارے گاؤں سے پکی سڑک تک ایک تانتا سا بندھ گیا۔ لوگ جن کے چہروں پر ڈر کی دُھول تھی' کہتے "بھاگ جاؤ—— گاؤں سے نکل جاؤ—— دشمن کی فوجیں اب زیادہ دُور نہیں۔"

ہم نے پوچھا "سرحد کے ساتھ جو ہمارے گاؤں تھے' اُن کا کیا حال ہوا؟"

"ہمیں کچھ پتہ نہیں۔"

جس آدمی سے بھی ہم نے بات کی' وہ چلتے چلتے ایک لمحے کو بھی نہ رُکا جیسے اُسے کوئی پیچھے سے دھکیل رہا ہو۔ اس افراتفری میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں تھا۔ یوں لگتا جیسے قیامت آ چکی ہو اور ہر آدمی پر نفسا نفسی طاری ہو۔ یکایک گُل بہار کی طرف سے توپ کی پہلی آواز آئی۔ نجانے گولا کہاں گرا پر ہم چک مراد کے لوگ اس آواز سے چونک اُٹھے۔ جو لوگ کنوؤں اور ٹیوب ویلوں پر تھے' وہ دوڑے ہوئے گاؤں میں آئے' جو گاؤں میں تھے وہ چولہوں کی آگ نہ بجھا سکے اور دروازوں کو تالے بھی نہ لگا سکے۔ ہم نے تھوڑا بہت سامان گٹھڑیوں میں باندھا اور ہمیں اتنی فرصت بھی نہ ملی کہ اپنے مکانوں اور دیواروں اور دروازوں پر ایک حسرت بھری نگاہ بھی ڈال لیتے کیونکہ ایک گولا گاؤں کے شمالی حصے کے ایک مکان پر گرا اور گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بچے چیخنے لگے اور عورتیں رونے لگیں۔ جوہڑ کے کنارے میرا باپ بھی ہم سے آ ملا۔ اُس نے کہا "ماہنے! تم عورتوں اور بچوں کو لے کر نکل

جاؤ۔ میں اور عبدالغفار مویشی ہانک کر لائیں گے۔ کہیں نہ کہیں ہم تمہارے ساتھ مل جائیں گے۔" اس اثنا میں بھا اسلم اور عائشہ بھی گھر سے نکل آئے۔ میں نے سر پر ایک بڑا سا گٹھڑ رکھا اور زینت کا سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکا لیا۔ زینت نے بچے کو اٹھا لیا۔ بھا اسلم نے سائیکل پر کچھ سامان باندھ لیا تھا۔ میری ماں کے سر پر بھی ایک گٹھڑی تھی۔

ہم پکی سڑک پر پہنچے تو ہم نے گاؤں کی طرف سے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سنی۔ کچھ گولے ہم سے ذرا پیچھے گر کر پھٹے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم پوری طرح سے جنگ کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ میں نے اپنے بھٹے کے قریب کھڑے ہو کر گاؤں کی طرف دیکھا۔ دور دور تک دھان کے کھیت لہرا رہے تھے اور ان پر صبح کی دھوپ نے ایک چادر سی تان دی تھی اور ہوا بند تھی اور گاؤں کے کچے پکے مکان دھوپ میں چمک رہے تھے۔ یہ کتنا پُرسکون منظر تھا! پر یہ منظر مجھے ایک دھوکا معلوم ہوا۔ میں نے سوچا "یہ تو کوئی جادو کا تماشا ہے۔ یہ کھیت—— یہ مکان—— یہ سڑک—— اس گاؤں نے ابھی ابھی رات کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور ابھی دھوپ کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔"

"ماہنے! کیا سوچ رہے ہو؟" بھا نے پوچھا۔

میں چونک گیا۔ یکایک بادل کے ایک ٹکڑے نے سورج کا چہرہ ڈھانپ دیا اور دھوپ کلا سی گئی اور یکایک برسات کی وہ کالی رات میری آنکھوں کے سامنے چھا گئی' جب بھا نے ہمارے گاؤں میں پناہ لی تھی۔ میں نے کہا "بھا! میں سوچ رہا تھا' چک مراد دھوپ کے سمندر میں ڈوب گیا تو کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میرا دل کہہ رہا ہے' ہم جلد گاؤں لوٹ آئیں گے۔"

"جب تم آج سے اٹھارہ سال پہلے اپنے گاؤں سے نکلے تھے' تو تم نے بھی اپنے گاؤں کو دھوپ کے سمندر میں——"

"نہیں ماہنے! دھوپ کے سمندر میں نہیں' خون کے سمندر میں ڈوبتے دیکھا تھا۔" بھا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

میری ماں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ماہنے! چلو——"

ہم نے گاؤں کی طرف سے منہ موڑ لیا اور شہر کا رُخ کر لیا۔ سڑک کے دونوں طرف شیشم کے درخت تھے اور سڑک پر ان کا سایہ تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم کسی قلعے کی

خفیہ سُرنگ میں سے گزر رہے ہو۔ اس سڑک پر ہم نے اتنا بڑا ہجوم کبھی نہ دیکھا تھا۔ اردگرد کے دیہات نے اپنی ساری آبادی کو اگل دیا تھا۔ اکثر لوگ پیدل تھے۔ کچھ لوگ چھکڑوں' ریڑوں اور یکّوں پر سوار تھے۔ سیدپور کی طرف سے آنے والی ایک دو لاریوں نے ہارن بجا بجا کر اپنا رستہ بنایا۔ وہ رینگ رینگ کر چل رہی تھیں اور سواریاں چھت پر بھی بیٹھی تھیں۔ اتنے بڑے ہجوم میں مجھے ایک عجیب کیفیت محسوس ہوئی جیسے میرا دکھ سب میں بٹ گیا ہو اور اس میں سے جو دکھ میرے حصے میں آیا ہو وہ اتنا تھوڑا ہو کہ اسے محسوس بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔

میری ماں نے پوچھا "ماجے! تیرا باپ کہیں نظر نہیں آ رہا؟"

"فکر نہ کرو ماں۔ وہ اور عبدالغفار مویشیوں کو ہانک کر لا رہے ہیں۔ کہیں نہ کہیں ہم سے آملیں گے۔"

ابھی ہم سیالکوٹ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر تھے کہ سڑک پر ایک جیپ نے ہمارا رستہ روک لیا۔ ایک جوان نے جیپ سے اتر کر کہا "دیکھو! پکی سڑک چھوڑ دو اور کھیتوں میں سے ہو کر آگے بڑھو۔ خطرہ ہے کہ ابھی دشمن کا فائر آئے گا۔ جب کوئی گولا چلے یا تمہارے سروں پر سے کوئی جہاز گزرے تو زمین پر لیٹ جاؤ۔ سڑک سے کم از کم ایک میل دور چلے جاؤ اور پھیل کر چلو۔" ہم سڑک کو چھوڑ کر کھیتوں میں چلنے لگے۔ سڑک کے اردگرد مورچے کھد رہے تھے اور جوان پوزیشن لے رہے تھے۔ یکایک توپیں گرجنے لگیں۔ ایک دم اتنے سارے گولے چلے کہ ہم بوکھلا گئے۔ مویشیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بچے چیخنے لگے۔ میری ماں نے میرا دامن تھام لیا۔ میں نے کہا "ماں! ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ہماری توپیں چل رہی ہیں۔"

ان کے جواب میں جب دشمن کی طرف سے کچھ گولے ہمارے پیچھے گر کر پھٹے تو مجھے یوں لگا جیسے میرا کلیجہ منہ کو آگیا ہو اور میرے ماتھے پر موت نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھ دیا ہو یا کسی بھوت نے نوکیلا پنجہ میرے سینے میں گاڑ دیا ہو پر خوف کے یہ لمحے بہت جلد گزر گئے۔ گولے ہم سے دور پیچھے پھٹے تھے۔ اب لوگ کھیتوں کی مینڈھوں پر بکھر گئے تھے اور سڑک پر ٹینک اور جیپیں چل رہی تھیں۔ تب جموں کی سرحد کی طرف سے ایک ہوائی جہاز دندناتے کے ساتھ آیا۔ ہم زمین پر لیٹ گئے اور جہاز تڑ تڑ گولیاں برساتا ہوا سیالکوٹ چھاؤنی

کی طرف اڑتا ہوا چلا گیا۔ دور درختوں کے ایک جھنڈ سے دھم کی آواز آئی اور دھوئیں کا بادل اٹھا۔ ہمارے دل دہل گئے۔ چھاؤنی کی طرف سے "ایک ایک ڈم ڈم" کی کئی آوازیں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی ہم تک پہنچیں۔ چند لمحوں بعد وہی جہاز واپس ہمارے سروں پر سے گزرا تو اس کی دم سے کالا کالا دھواں نکل رہا تھا۔ دھوئیں کی لکیر نیلے آسماں کے نیچے دور تک چلی گئی۔ تب اس لکیر سے ایک شعلہ نکلا اور پھر ہمیں کچھ بھی نظر نہ آیا اور دھان کے کھیتوں سے لوگ یوں اٹھے جیسے برسات میں "کھمبیاں" نکل آئی ہوں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ کچھ لوگ زخمی ہو گئے ہیں اور دور درختوں کے جھنڈ میں جو توپ لگی تھی' اس نے پھر دم سے گولا اگلا تو ہمیں خود بخود معلوم ہو گیا کہ یہاں ہوائی جہاز نے بم کیوں گرایا تھا پر توپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

ہم پھر چلنے لگے۔ پکی سڑک سے دو تین کوس دور جا کر میں نے ماں سے پوچھا "ماں! ہم آج کی رات کہاں گزاریں گے؟"

"جہاں رات پڑ گئی' لیٹ رہیں گے۔" میری ماں کی بجائے بھا نے جواب دیا "کل ہم لائل پور جانے کے لئے شہر سے گاڑی پر سوار ہو جائیں گے؟"

"نہیں بھا! ابھی کوئی خطرہ نہیں۔ کیا پتہ ہمیں کل پرسوں ہی گاؤں لوٹ آنا پڑے۔" بھا نے مسکرا کر کہا "ماجے! عقل کی بات کرو۔ ہمارا گاؤں جنگ کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ اب خدا خیر کرے تو جنگ کے بعد گاؤں لوٹنا نصیب ہو گا۔"

"جنگ کب ختم ہو گی اسلم؟" میری ماں نے پوچھا۔

"کیا پتا کب؟ —— اس نے کہا۔

"ہماری فصلوں کا کیا ہو گا؟ اگلے مہینے دھان کی فصل کٹنے والی تھی۔"

"ماں! جہاں جنگ ہو' وہاں فصلیں اُجڑ جاتی ہیں۔ انہیں ٹینک روند ڈالتے ہیں۔ کھیتوں میں گولے گرتے ہیں تو انہیں آگ لگ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ماجے! تم اتنی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟" بھا کے لہجے میں ذرا سا غصہ تھا —— ایک جھڑکی کا انداز ——

اس نے میری ماں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اماں! اللہ پر بھروسا رکھو۔ یہ سوچو کہ آج کی رات تو ہم کہیں نہ پہنچ سکیں گے۔ اگر کل بھی لائل پور جانے کا انتظام نہ ہوا تو ہم

ایک دو راتیں کہاں گزار سکتے ہیں؟"

ماں نے کچھ سوچ کر کہا "یاد آیا۔ شہر سے دکھن کی طرف ایک سڑک جاتی ہے۔ اس سے کچھ اُدھر ہٹ کر کوٹلی نام کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں ماسی اللہ رکھی کا گھر ہے۔ ایک دو راتیں اُن کے ہاں کیوں نہ گزار لیں؟"

"اماں! تم کبھی وہاں گئیں؟"

"ہاں! ایک بار گئی تھی جب ماسی کی بیٹی جیواں کا بیاہ ہوا تھا۔ کچی سڑک پر اتنی دُھول تھی کہ یکے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ بھوت بن گئے تھے، جب ماہنے کے باپ نے مجھے یکّے سے اُتارا تو میں اُسے دیکھ کر ہنس پڑی اور وہ مجھے دیکھ کر —— اُس نے کہا تھا "گوٹی والے کیا کہیں گے؟" میں نے کہا تھا "یہی نا کہ یہ بھوت اور بھتنی کہاں سے آ گئے——"

ہم ہنسنے لگے تو اُس نے کہا "ماہنے! تیرا باپ ابھی تک ہم سے نہیں مل سکا—— اُسے تلاش کرو۔"

ہم نے سیالکوٹ چھاؤنی سے ذرا مغرب کی طرف سے نالہ ہیکھو پار کیا۔ اُس میں بہت کم پانی تھا۔ یہ پانی جموں کی طرف سے آ رہا تھا اور اُدھر ہی سے دشمن نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ ہیکھو کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ہم تھک سے گئے اور ایک شیشم کے نیچے آرام کرنے کو بیٹھ گئے۔ لوگ ہمارے پاس سے گزرتے رہے۔ یہیں میرا باپ اور عبدالغفار ہم سے آ کر مل گئے۔ وہ اپنے سارے مویشیوں کو ہانک لائے تھے۔ وہ بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ مویشی نالے کے کنارے کی گھاس چرنے لگے۔ میرے باپ نے کہا "ماہنے! جب پچھلی لام لگی تھی تو تم چھوٹے سے تھے پر یہ لام ہم سے بہت دُور تھی۔ ہم نے نہ کسی توپ کی آواز سنی، نہ کوئی جہاز ہمارے سروں پر سے اُڑا—— یہ لام جو اب لگی ہے ابھی اس کا ایک دن پورا نہیں ہوا، اور ہم گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔"

"چاچا! کبھی کبھار ایسا وقت ہر قوم پر آتا ہے، فکر کی کوئی بات نہیں۔" بھا نے کہا "شکر کرو۔ مشرقی پنجاب میں جو قیامت گزری تھی وہ تم نے نہیں دیکھی۔ اُس وقت کوئی توپ ہماری حفاظت نہیں کر رہی تھی اور ہم تلواروں، چھویوں، ٹوکوں اور بندوقوں کی زد پر آ کر اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے جنگل میں کھدیڑا ہوا شکار۔"

بھا کے لہجے میں غم کی کسک ابھری تو میرے باپ نے کہا "اسلم! اب تم محفوظ ہو۔

گزرے دنوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ چلو اٹھو! پینڈا کھوٹا نہ کرو۔"

ہم چھاؤنی سے مغرب میں رہ کر چلتے رہے اور توپیں مسلسل گرجتی رہیں۔ چھاؤنی سے قریب کے گاؤں ابھی خالی نہیں ہوئے تھے۔ اُس دن ہم کوٹلی ارائیاں نہ پہنچ سکے۔ ہم نے وہ رات کوٹلی بہرام شاہ سے باہر گزاری جہاں اردگرد کے دیہات کے لوگوں نے ہمارے لئے کیمپ لگا رکھا تھا۔ ہمیں وہاں حصّہ بھی ملا اور مویشیوں کے لئے چارا بھی۔ اگلی صبح ہم نے کوٹلی ارائیاں کا رُخ کر لیا۔ اور شہر کے تحصیل بازار اور حلوائی پورہ —— سڑک پر پہنچے جو ڈسکے جاتی ہے۔ اُس دن شہر میں امن و سکون تھا۔ بازار کھلے تھے اور شہری چل پہل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ شہر میں بسیں آ رہی تھیں اور باہر جا رہی تھیں۔ شہر میں سے گزرتے ہوئے خطرے کا سائرن بجا۔ لوگ چند منٹوں کے لئے دکانوں کے چھجوں کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ جب سائرن نے "سب ٹھیک" کا اعلان کیا تو ہم پھر چل پڑے۔ ہم اُس دوپہر کو کوٹلی ارائیاں پہنچ گئے۔ کوٹلی ارائیاں میں لوگ معمول کے مطابق کام کر رہے تھے اور دُور سے توپوں کی آواز آ رہی تھی۔ ٹیوب ویل پھک پھک چل رہے تھے۔ دھان کی فصلیں سرسبز و شاداب تھیں۔ کبھی کبھار ہمارے سروں پر سے کوئی ہوائی جہاز زن سے گزر جاتا تو لوگ کام چھوڑ کر اُسے دیکھنے لگ جاتے۔ ماسی اللہ رکھی اور اُس کے گھر والوں نے ہمیں خوش آمدید کہی۔ بوڑھی ماسی ہم سب پر صدقے واری جا رہی تھی۔ رات کو لوگ ہمیں ملنے کے لئے ماسی کے گھر آئے۔ آدھی رات تک باتیں ہوتی رہیں۔

"سنا ہے، اس وقت چونڈے کے اردگرد سخت لڑائی ہو رہی ہے۔" گاؤں کے ایک نوجوان نے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں کیسے؟ اُڑتی سی ایک خبر ہے۔ صبح ریڈیو پر خبر آئے گی تو اس کی تصدیق ہو جائے گی۔"

صبح تک ریڈیو سے بھی اس کا اعلان ہو گیا اور چونڈے کی طرف سے لوگ ہماری طرح گٹھڑیاں سر پر رکھے ہوئے آئے تو اُن کی زبانی اس خبر کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اُس رات چونڈے کے کھیتوں میں دشمن کے سینکڑوں ٹینک دندناتے ہوئے آئے لیکن ہماری فوج نے اُن کا حملہ روک دیا۔ ان خبروں سے ہمارے حوصلے بہت بلند ہوئے۔ بھا اور میں اگلے دن شہر

گئے تو ہمیں پتہ چلا کہ لاریاں لائل پور جاتی بھی ہیں اور وہاں سے آتی بھی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ کوٹلی ارائیاں میں ایک دو دن اور گزار کر لائل پور چلے جائیں گے۔ پر جب ماسی اللہ رکھی نے سنا تو بہت ناراض ہوئی۔ اس نے کہا "موج دینا! تو نے ہمیں غیر سمجھا ہے، جو دو چار دن بھی یہاں ٹھہرنا تمہیں اچھا نہ لگا۔"

"نہیں ماسی! یہ بات نہیں۔ لام لگی ہے۔ کیا پتہ کب ختم ہو اور کب ہمیں گاؤں لوٹنا نصیب ہو۔"

"اللہ سے خیر مانگ۔۔۔۔ اس کی مرضی کے آگے کون دم مار سکتا ہے۔ تیرے یہاں رہنے سے ہمارا رزق تو ختم نہیں ہو گا۔"

"ماسی! لائل پور کے ضلعے میں میرے جوائی اسلم کا گاؤں ہے۔ وہاں ٹھیکے بٹائی پر زمین مل جائے گی۔ ہاڑی کی فصل ہاتھ سے نکل گئی تو اچھی بات نہیں ہو گی۔"

"اچھا! چلے جانا پر دو چار دن اور یہاں رہ لو تو کوئی انت تو نہیں آ جائے گی۔"

میرے باپ نے مسکرا کر ہتھیار ڈال دئے۔ کہتے ہیں انسان نئی جگہ سے مانوس ہونے میں بہت دیر لگاتا ہے پر کوٹلی ارائیاں میں دو چار دنوں کے بعد ہم اس کی دھرتی سے اور اس میں بسنے والے لوگوں سے پیار کرنے لگے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہاں کے لوگ بہت اچھے تھے اور وہاں کے ہر گھر میں محاذ کی طرف سے آنے والے لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی یا جب انسان پر کوئی سانجھی مصیبت پڑتی ہے تو وہ ایک دوسرے کے نزدیک آ جاتا ہے۔ یہاں سے چونڈے کا محاذ کچھ دور نہیں تھا۔ دن رات توپیں گرجتی تھیں اور ٹینکوں کی جنگ کے متعلق عجیب و غریب خبریں ملتی تھیں تو ہمیں یوں لگتا جیسے ہم ٹینک سے ٹینک کے ٹکرانے کی آواز سن رہے ہوں تاہم کوٹلی ارائیاں کے لوگ ڈرے ہوئے نہیں تھے۔ ان کے حوصلے بلند تھے۔

جب سیالکوٹ کے قلعے پر وہ بم گرا جس کی گونج ہم نے بھی سنی کیونکہ ہم شہر سے صرف پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھے، تو ہم ایک دوسرے سے اور قریب ہو گئے۔ ہم نے موت کے سائے تلے ایک دوسرے کی ہمدردی، محبت اور اپنائیت کا وہ مزہ چکھا جو امن و امان کے دنوں میں چھوٹی چھوٹی دشمنوں اور خود غرضیوں میں بدل جاتا ہے۔ اس سے ایک دن بعد بھا اور میں شہر گئے تو دور ہی سے تباہی کا منظر دیکھ کر ہماری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اس دن ہم نے شہریوں کے چہروں پر ڈر کی زردی دیکھی۔ وہ لوگ جو روپے پیسے، کوٹھیوں اور کاروں کے مالک تھے، شہر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ عجیب بات ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو سب سے پہلے انہیں لوگوں کے پاؤں اکھڑتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ حوصلہ ہار جاتے ہیں۔

ہم کوٹلی ارائیاں میں دو چار دن اور ٹھہرے۔ میں اور بھا عورتوں اور بچوں کے ساتھ بس میں بیٹھ کر لائل پور پہنچے۔ میرا باپ اور عبدالغفار پیدل چل کر لائل پور پہنچے کیونکہ مویشی ان کے ساتھ تھے۔ جب ہم بھا کے چک میں پہنچے تو اس کا چاچا ہمیں زندہ سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ دو چار دن بعد اس نے اپنے مکان سے ایک کوٹھا ہمارے لئے الگ کر دیا اور بھا کے حصے کا غلہ ہمیں دے کر کہا "چوہدری موج دین! میں تمہیں الگ اس لئے کر رہا ہوں کہ عورتوں کے دل بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اکٹھے رہنے میں لڑائی جھگڑے کا ڈر ہے۔"

کئی دنوں بعد جب ماں اپنا چولہا گرم کر کے روٹیاں پکانے بیٹھی تو وہ بہت خوش تھی۔ عورت کو اپنا گھر بسانے میں بڑا سکھ ملتا ہے۔ نجانے میرا باپ کیوں خوش نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ رہتا اور کسی سے ہنس بول کر اس کے چہرے پر رونق بھی نہ آتی۔ میں نے ایک دن وجہ پوچھی تو اس نے کہا "ماہنے! ہم جاٹوں میں دھی بہن کے ہاں کا پانی پینا بھی طعنے مہنے کی بات ہوتی ہے اور ہم تو اب گھر سے بے گھر ہو کر جوائی کے ٹکڑوں پر آ پڑے ہیں۔"

"بابا! بھا اسلم تمہارا جوائی ہی نہیں، بیٹا بھی ہے۔ جب ہم جنگ کے بعد اپنے گاؤں میں واپس پہنچیں گے تو ساری کسر نکال دیں گے۔ ہم اپنے زیور گروی رکھ کر اسلم کی دکان پھر سے چالو کریں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

میں نے جب بھا کو یہ بات بتائی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس نے کہا "ماہنے! چاچا پرانے زمانے کا آدمی ہے۔ ماں باپ کی خدمت بیٹوں پر ہی نہیں، بیٹیوں پر بھی فرض ہوتی ہے۔"

لائل پور کے اس چک کی زمین بہت زرخیز تھی۔ اسے نہری پانی لگتا تھا۔ یہاں کنویں نہیں تھے۔ ابھی تک ٹیوب ویل بھی یہاں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ نیچے کا پانی کھاری تھا۔ کماد، مکی اور جوار کی فصلیں بڑی اچھی تھیں پر وہ سرسبزی نہیں تھی جو برسات

کے موسم میں ہمارے علاقے کی چپہ بھر زمین کو بھی ننگا نہیں رہنے دیتی اور صبح اُٹھ کر دہ
پہاڑ بھی نظر نہ آتے ہو نیلے آسمان کے نیچے نیلم کی دیواریں بن کر یکایک اندھیرے سے ابھر کر اجالے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اور چوٹیوں پہ برف کو آگ لگ جاتی ہے اور جب دھوپ پھیلتی ہے تو ان پر چاندی کے کلس جگمگ جگمگ کرنے لگتے ہیں۔

اس چک میں بڑی خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ملک میں کہیں جنگ نہ ہو رہی ہو۔ کبھی کبھار کوئی جہاز ہمارے اُوپر سے گزرتا تو ہمیں جنگ کا احساس ہوتا پر سرحد کی طرف سے جنگ کی مسلسل گونج یہاں نہ سنائی دیتی۔ پہلے دو ایک دن یہ چپ چاپ زندگی بوجھل سی معلوم ہوئی۔ اتنے شور کے بعد اتنی خاموشی! جب ہم اس سے مانوس ہوئے تو اچانک ایک دن خبر آئی کہ جنگ بند ہو گئی ہے۔ ہمارا جی چاہا کہ پر لگا کر اُڑیں اور چک مراد پہنچ جائیں۔

میری ماں نے پوچھا "ماہنے! ہم چک مراد کب چلیں گے؟"

میں نے کہا "ماں! بہت جلد۔۔۔۔"

پر میں جانتا تھا کہ ہمارے علاقے میں جنگ ہوتی رہی ہے، ہمیں اتنی جلد وہاں جانا کیسے نصیب ہو گا۔ کیا پتا علاقہ دشمن کے قبضے میں آ گیا ہو۔ لوگوں سے ملنے اور ان سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ ابھی تو صرف عارضی فائر بندی ہوئی ہے۔ دونوں ملک ایک دوسرے سے صلح کریں گے تو اصل حقیقت کا پتہ چلے گا۔ گھر آ کر میں نے ماں کو ساری بات بتائی تو اُسے بڑی مایوسی ہوئی پر واپسی کے انتظار میں بھی تو ایک مزہ تھا۔ اب اُمید تو بندھ گئی تھی۔

اس چک کی دھرتی پرائی نہیں تھی پر ابھی اس نے اپنائیت کا پلو ہم پر نہیں ڈالا تھا۔ ہم نے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر اس سے ناطہ جوڑنا چاہا تو مٹی سے وہ بھیگی مہک نہ آئی جو برسات کے بعد ہمارے کھیتوں کی مٹی سے ابھرتی تھی پر مٹی مٹی ہوتی ہے اور کسان مٹی کا کیڑا ہے۔ ہم نے بھا اسلم کے کھیتوں میں ایک بار نہیں، دو تین بار ہل چلایا اور اس طرح مٹی سے ناطہ جوڑ لیا۔ گندم کی بوائی کے لئے کھیت تیار ہوئے تو آہستہ آہستہ موسم کا رُخ لنے لگا۔ ہوا میں ذرا سی سردی رچی تو ہم نے کھیتوں میں بیج ڈال دیا۔ نہری زمینوں پر کام م ہوتا ہے۔ بوائی کے بعد ہمیں کام کاج سے اچانک فرصت ملی تو چک میں ہمارا جی نہ لگا۔ دن میں نے اور بھا نے اچانک سیالکوٹ جانے کی ٹھان لی۔ لائل پور سے سیالکوٹ پہنچے

میں ہمیں یہی پانچ چھ گھنٹے لگے۔ فائر بندی ہوئے مشکل سے ایک ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا لیکن زندگی کے سارے کاروبار معمول پر آ گئے تھے۔ لائل پور شہر کی رونق بحال ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی دکانداروں کی فطرتی خود غرضی اور کمینگی بھی۔ انہوں نے پھر ترکڑی کی ڈنڈی ٹیڑھی کر لی تھی اور ڈنڈی مار کر بھی خوش نہیں ہوتے تھے۔ جنگ کے چند دنوں نے ہمیں جس بے غرضی کا سبق دیا تھا، اسے شاید فائر بندی کے پہلے لمحے ہی میں ہم نے بھلا دیا تھا یا اب ہم اس عارضی گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے ایک ایک لمحے کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے جو جنگ کے دوران ہم نے اچانک اُٹھایا تھا۔ آج سے ڈیڑھ مہینہ پہلے جب چک مراد سے لے کر لائل پور کے اس چک تک کے سفر میں ہم نے لوگوں سے بہت پیار پایا تھا۔ لوگ ہمیں بے گھر سمجھ کر مہربانی سے پیش آتے رہے تھے۔ حتیٰ کہ بسوں کے ڈرائیور اور کلینز بھی میٹھی زبان میں بات کرتے تھے۔ اب ہر ایک کے بولوں میں پھر وہی خود غرضی کا زہر بھر گیا تھا۔

"بھا! جو یہ لڑائی لمبی ہو جاتی تو اچھا نہ ہوتا؟" میں نے کہا۔

"کیوں؟" بھا نے پوچھا۔

"کیا پتا ہماری قوم کی فطرت بدل جاتی۔"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا ماہنے! جنگ نے ہمیں اچانک آ لیا تھا۔ موت سر پر منڈلا رہی ہو تو ہم یکایک ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال دیتے ہیں کیونکہ ہمارا دکھ درد ایک ہو جاتا ہے۔ اب خطرہ باقی نہیں رہا تو ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہو چکے ہیں۔"

"ابھی تو فوجیں آمنے سامنے مورچہ لگا کر بیٹھی ہیں۔ ہر سپاہی کا ہاتھ بندوق کے گھوڑے پر ہے۔ کیا پتہ کب گھوڑا دب جائے؟" میں نے کہا۔

سیالکوٹ کے اڈے پر لاری سے اتر کر میں نے بھا سے مشورہ کیا کہ اب ہمیں کہاں جانا چاہئے۔ بھا نے اُداس سے لہجے میں کہا "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" اس وقت اڈے سے قریب کی ایک مسجد سے دیگر کی اذان ابھری اور دھوپ سمٹ کر عمارتوں کی منڈیروں سے لپٹنے لگی تو میرے جی میں ایک سناٹا سا بھر گیا۔ جب شام کے اندھیرے لپک کر آئے تو مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے ہی شہر میں کسی دوسرے ملک کا مسافر ہوں۔ ایک اجنبی جسے رات کا ٹھکانا میسر نہیں۔ وہ رات ہم نے سٹیشن کے مسافر خانے میں سوتے جاگتے گزاری۔ صبح

اٹھ کر ہم نے قلعے کے پاس کا وہ محلہ دیکھا جہاں قریب ہی .مب گرا تھا۔ ایک .مب نے
پورے بازار کو کھنڈر بنا دیا تھا۔ اب تک بہت سا ملبہ ہٹایا جا چکا تھا لیکن زنگ بازار کے
ٹوٹے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کی ابھی پوری طرح مرمت نہیں ہو سکی تھی۔
ایک چھوٹی سی دکان سے ہم نے چائے پی اور بند کھائے۔ باتوں باتوں میں دکاندار
نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں اور سیالکوٹ کیوں آئے ہیں؟ اس طرح
بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے بتایا کہ جس رات شہر میں .مب گرا تھا' وہ محلہ
رنگ پورہ میں اپنے گھر سو رہا تھا۔ دھماکے سے پورا شہر گونج اٹھا تھا "بھائی صاحب! یوں
معلوم ہوا جیسے حشر کا میدان بپا ہے اور میں نیند سے نہیں کسی قبر سے اٹھایا گیا ہوں اور
میرا نامہ ء اعمال میرے ہاتھوں میں ہے۔ جب صبح کے وقت ہمیں معلوم ہوا کہ .مب قلعے
کے نزدیک گرا ہے تو میں دوڑتا دوڑتا اپنی دکان پر آیا۔ اس کے دروازے کے پٹ دور جا
گرے تھے اور چائے کے برتن باہر سڑک پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہی حال باقی دکانوں کا تھا
جیسے غصے میں آئے ہوئے کسی جن نے پورے بازار کو تہ و بالا کر ڈالا ہو۔" اس نے بتایا کہ
قلعے کی ان سیڑھیوں کے سامنے جہاں .مب گرا تھا' صرافوں کی گلی ہے۔ ان کے سونے اور
چاندی کے زیور باہر گلی میں بکھر گئے تھے اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا
تھا۔ دکانیں کئی دنوں تک دروازوں اور کھڑکیوں سے محروم رہیں لیکن ان کا سامان محفوظ رہا۔
ان دنوں لوگوں کے اخلاق بدل گئے تھے چور اچکے اور ڈاکو غنڈے دوسروں کے مال اسباب
اور عزت آبرو کے رکھوالے بن گئے تھے پر جونہی جنگ ختم ہوئی لوگوں کی فطرت بدل گئی۔
کئی محلوں میں بند مکانوں کے تالے ٹوٹ گئے اور پھر ایک کا ہاتھ دوسرے کے گریبان پر جا
پڑا۔ دکاندار کچھ دیر رکا۔ پھر ہنس کر بولا "بھائی صاحب! ہماری قوم بھی عجیب ہے۔ اس نے
جنگ کو تماشا سمجھا۔ ہوائی جہاز ہمارے سروں کے اوپر ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے
اڑتے تو لوگ پتنگ بازی کا تماشا سمجھ کر گلیوں اور بازاروں میں نکل آتے اور بو کاٹا۔ بو کاٹا" کا
شور مچاتے۔"

ہم نے سیدپور جانے والی سڑک پر پہلا قدم رکھا تو بھا نے کہا "اس شہریے نے
ہمیں اتنا مایوس کیوں کر دیا ہے ماسٹے؟"

"بھا وہ سچی بات کر رہا تھا اور سچ اکثر مایوس کرتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ ہم نے

جنگ کے سترہ دنوں میں جو خواب دیکھا تھا' وہ ٹوٹ رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ قوموں پر ایسے
وقت آتے ہیں اور توپوں کی گھن گرج' بموں کے دھماکے اور گولیوں کے زناٹے ان کا
حوصلہ بلند کرتے ہیں اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت اونچا اٹھ جاتی ہیں۔
"ہم تو سترہ دن کے بعد پھر وہیں پہنچ گئے۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔
"کہاں؟" بھا نے پوچھا۔
"کچھ نہیں بھا! یونہی ایک خیال آیا تھا۔"
شہر سے باہر نکلتے ہی دفعتاً" ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا' چھاؤنی کی بیرکیں خالی تھیں'
ساری چھاؤنی سنسان نظر آتی تھی کیونکہ فوج ابھی محاذ جنگ پر تھی۔ چھاؤنی کے ساتھ کے
گاؤں ابھی پورے طور پر آباد نہیں ہوئے تھے البتہ کنویں اور ٹیوب ویل چل رہے تھے اور
کسان گندم کی بوائی میں مصروف تھے۔ ہم سڑک سے ایک طرف ہٹ کر ایک ٹیوب ویل پر
پہنچے۔ ٹیوب ویل پھک پھک چل رہا تھا۔ چارپائی پر بیٹھا ہوا ایک کسان بڑے اطمینان سے
حقہ پی رہا تھا۔ ہم نے سلام دعا کے بعد کہا کہ ہم لائل پور سے آ رہے ہیں۔ اس نے
چارپائی کی پائنتی کی طرف کھسک کر کہا "بیٹھ جاؤ پہلے لسی پانی پیو۔ پھر باتیں کریں گے۔"
"مہربانی۔ پیاس نہیں ہے۔"
"کہاں جاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔
"چک مراد۔" میں نے کہا۔
"چک مراد!" اس نے چونک کر کہا "تم چک مراد کے رہنے والے ہو۔ سفید پوش
شرف دین کے گاؤں کے؟"
"ہاں! ہاں!" میں نے خوش ہو کر کہا۔
"وہ تو دشمن کے قبضے میں ہے۔ تم وہاں کیسے جاؤ گے؟"
"ہمارا بھی یہی خیال تھا پر تم جانتے ہو اپنے گاؤں کی مٹی میں کتنی کشش ہوتی ہے!
بس وہی یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ تمہارا گاؤں بھی تو اجڑا اجڑا سا نظر آتا ہے۔"
"جنگ میں کئی گولے ہمارے گاؤں پر بھی آن گرے تھے۔ ہم نے عورتوں اور
بچوں کو گاؤں سے نکال کر ذرا دور کے دوسرے گاؤں میں بھیج دیا۔ دیکھو چوہدری! عزت
سب سے پہلے ـــــ مال اسباب تو آنی جانی چیز ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"تم گاؤں چھوڑ کر کیوں نہ کہیں چلے گئے چودھری؟" بھا نے پوچھا۔

"یہی سمجھو کہ مٹی نے ہمارے پاؤں پکڑ لئے۔ سارے مرد گاؤں ہی میں رہے۔ ہم لوگ پورے سترہ دن گولوں کی زد پر رہے۔ گولے ہمارے سروں پر سے اڑتے رہے اور ہر وقت موت کا دھڑکا لگا رہا۔ ہمارے آگے پیچھے توپیں لگی تھیں اور فوج مورچوں میں جمی تھی۔ دشمن کے ہوائی جہاز بار بار آتے اور گولیاں اور بم برساتے رہے۔ ایک بم تو ٹیوب ویل سے اتنا نزدیک پھٹا کہ اس کے ٹکڑے اُڑ کر یہاں تک پہنچے اور میرا ایک بیل زخمی ہو گیا پر دو چار دنوں کے بعد دشمن کی یلغار رک گئی اور اُس کا زور ٹوٹ گیا تو ہم اپنے کام کاج میں لگ گئے۔ اب دیکھو کتنی خاموشی ہے! کبھی کبھار فائر بندی ٹوٹ بھی جاتی ہے اور توپیں دنادن چلتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے، لڑائی پھر سے شروع ہو گئی ہے ـــــ اچھا اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"لائل پور لوٹ جائیں گے۔ شہر سے شام تک بسیں چلتی رہتی ہیں۔"

"نہیں ـــــ ایک رات یہیں گزار لو۔ کل صبح چلے جانا۔"

اُس کسان کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس نے ہمیں اپنے ہاتھوں سے روٹی پکا کر کھلائی اور وہ رات ہم نے اُس کے ٹیوب ویل پر گزاری۔ ہم گاؤں سے اتنا قریب پہنچ کر بھی وہاں نہ جا سکے تھے، اس کا ہمیں افسوس تھا۔ رات کو چاند نکلا۔ چاندنی میں کھیتوں کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ کماد کے کھیت گھنا جنگل معلوم ہوتے ہیں اور ہوا انہیں سرسراتی ہوئی گزرتی ہے تو چاندنی لرز جاتی ہے۔ جن کھیتوں کو تازہ تازہ پانی ملا ہوتا ہے، اُن کی مٹی سے جو خوشبو نکلتی ہے، اُس میں ہری ہری کونپلوں کا رس ملا ہوتا ہے۔ وہی خوشبو جو دودھ پیتے بچے کے منہ سے آتی ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ رات میں نے اپنے ہی گاؤں میں گزاری ہو اور گاؤں میرے لئے ماں کی کوکھ بن گیا ہو۔ صبح کے اجالے میں شمال کی طرف نیلم کی دیواریں ابھریں تو میرے بچپن نے آنکھیں کھول دیں اور ابھی بچپن نے آنکھ بھی نہیں جھپکی تھی کہ مشرق سے سورج کی پہلی کرن پھوٹی اور یکایک میری زندگی کے بتیس سال بیت گئے ـــــ چک مراد کے بتیس سال ـــــ تب ایک عجیب سی حسرت میرے دل میں اتر گئی۔

باب ۲۴

○

ہم لائل پور کے چک میں تھے کہ تاشقند کا معاہدہ ہوا۔

یہ معاہدہ روس نے کرایا تھا جو دنیا کی بہت بڑی طاقت ہے۔ گاؤں میں کوئی معاملہ الجھ جائے تو گاؤں سے باہر کے کسی بڑے آدمی کو بلا کر ہم اُسے سرپنچ بنا لیتے ہیں۔ وہ جو فیصلہ کرے، ہم اُسے سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ ہم نے روس کا فیصلہ قبول کر لیا۔ ہم عام لوگوں میں اتنی سیاسی بصیرت کہاں ہے کہ اُس معاہدے کی تہہ تک پہنچ پاتے۔ صدرِ پاکستان نے ریڈیو پر جو تقریر کی، اُس سے معلوم ہوا کہ اس معاہدے سے پاکستان کو بہت فائدہ پہنچے گا اور جموں کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس جنگ سے ہم نے کیا پایا، جو خوشی کا اظہار کریں بلکہ ہم نے جیتی ہوئی جنگ ہار دی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ جنگ سے انسان پاتا کچھ نہیں، کھوتا بہت کچھ ہے۔ لوگ گھر سے بے گھر ہوتے ہیں، ان کی فصلیں اجڑ جاتی ہیں اور ان کی عزتیں برباد ہو جاتی ہیں۔ نجانے کیوں میں جس سے بھی یہ بات کرتا، وہ خوش نہ ہوتا۔ یوں لگتا جیسے ہر شخص کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے اور اس کا حوصلہ پست ہو گیا ہے۔

میں نے بھا سے کہا "یہ جنگ بھی اُسی قسم کی تھی، جس سے ہم اپنے گاؤں میں آئے دن دوچار ہوتے رہتے ہیں۔"

"میں نے نہیں سمجھا ماسٹر!"

"ہم نے چودھری کو قدم قدم پر شکست دی لیکن چودھری کی سیاست ہم سے زوردار تھی۔ ہر شکست کے بعد وہ پھر جیت جاتا۔ وہ ہار کر جیتتا رہا اور ہم جیت کر ہارتے رہے۔ کیوں بھا! ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے ـــــ"

"اس کی کیا وجہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چوہدری کے پاس ہم سے زیادہ زمین ہے۔ اس کا اثر و رسوخ بھی ہم سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ اس کا بیٹا وکیل ہے۔ اس کا سیدپور کے ذیلداروں سے رشتہ ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہیں جن میں ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم ہر جیت پر کچھ ہار جاتے ہیں، وہ ہر ہار پر کچھ نہ کچھ جیت لیتا ہے۔"

ہم نے چک کے جن کھیتوں میں گندم بوئی تھی، وہ اب ہرے بھرے نظر آتے تھے کیونکہ سردیوں میں ایک دو بارشیں بھی ہو گئی تھیں۔ ریڈیو اور اخباروں سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے کا علاقہ خالی کر رہی ہیں۔ ہم اپنے علاقے میں جانے کے لئے بے تاب ہو گئے تھے۔ آخر یہ اعلان بھی ہو گیا کہ ان علاقوں کے لوگ واپس جا سکتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ ابھی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے جانا اچھا نہیں۔ اس لئے میرے باپ نے فیصلہ کیا کہ بھا اسلم اور عبدالغفار چک میں ان کے پاس رہیں اور ہم باپ بیٹا گاؤں جا کر حالات دیکھیں اور جب مناسب ہوا، انہیں بلا لیں۔

سردیوں کا وہ دن نہایت خوشگوار تھا کیونکہ دھوپ چمک رہی تھی اور اس میں پچھلے دنوں کی بارش کی نمی بھی رچی ہوئی تھی۔ سیالکوٹ شہر میں چہل پہل لوٹ آئی تھی۔ چھاؤنی میں بھی کچھ کچھ آبادی نظر آ رہی تھی اور سیدپور جانے والی پکی سڑک پر یکے اور تانگے چلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم تانگے پر بیٹھنے لگے تو اپنے علاقے کے کچھ لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔ ان میں سے ایک دو آدمی اپنا علاقہ دیکھ آئے تھے۔ انہوں نے کہا "چوہدری موج دین! وہاں پہنچ کر تم جو کچھ دیکھو گے، اسے دیکھ کر تمہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔"

تانگہ چلتا رہا اور ہم اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔ سڑک کے دونوں طرف کی زمینیں آباد تھیں اور شیشم کے درختوں پر بور آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی ہمارا گاؤں تین چار میل کے فاصلے پر تھا کہ یکایک منظر بدل گیا۔ ہمارے سامنے کی سڑک گنج کنج تھی۔ اس کے دونوں طرف درختوں کے کٹے ہوئے ٹھنٹھ نظر آ رہے تھے اور دُور دُور تک کھیتوں میں بھی کوئی درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاں کھیتوں میں گھاس اُگ آئی تھی۔ بارش کی وجہ سے گھاس تر و تازہ تھی۔ اس کا رنگ نکھر گیا تھا پر کھیتوں میں سے درخت کٹ جائیں تو گھاس کا میدان بھی بنجر بنجر سا اور کٹا پٹا معلوم ہوتا ہے۔ اب سڑک کا جو حصہ شروع

ہوا تھا اس میں قدم قدم پر گڑھے پڑے ہوئے تھے اور تانگہ دھچکے لے رہا تھا۔

ہم بھٹے کے قریب تانگے سے اُترے۔ چھ مہینوں کے بعد گاؤں کی دھرتی پر پہلا قدم رکھا تو میں نے سوچا "اس دھرتی کو دشمن کے پاؤں روند چکے ہیں۔ اس کے سینے پر اُس کے ٹینک چلے تھے۔ یہاں قدم قدم پر گولے گرے تھے اور اس کا سینہ پھٹتا رہا تھا۔ دشمن نے اسے ننگا کیا اور اس کی بے آبروئی کی۔ وہ بھی تو اسی کا بیٹا تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے اپنے سوال کا جواب نہ ملا۔

بھٹے پر دشمن نے اپنا مورچہ لگایا تھا۔ اس کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ میری کُٹیا کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا۔ گاؤں تک جانے والی اینٹوں کی سڑک پس کر چورا ہو چکی تھی اور اس میں گڑھے پڑ چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ لگے بجلی کے کھمبے غائب تھے۔ گاؤں تک پہنچتے پہنچتے میرا دل سنسان اور ویران ہو چکا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے شام پڑ چکی ہو حالانکہ ابھی دھوپ تیز تھی اور اس میں ڈھلتے سورج کی زردی بھی نہیں رچی تھی۔ ابھی ہم گاؤں سے سو دو سو قدم کے فاصلے پر تھے کہ اس کی ویرانی نے ہمیں لپک کر آ لیا جیسے وہ ہمارا استقبال کر رہی ہو۔ دلوں میں اُتری ہوئی شام اور بھی گہری ہو گئی۔

میرا جی چاہا کہ میں یہیں سے لوٹ جاؤں۔

پر میں نے سوچا "میں لوٹ کر کہاں جاؤں گا؟"

جوہڑ کا گدلا سا پانی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ بھا اسلم کے مکان اور دکان کے ملبے نے گلی کے دہانے کو بند کر دیا تھا۔ گلی کے اردگرد کے مکان منہ پھاڑے ہمیں نگل جانے کو تیار نظر آتے تھے۔ ان کے دروازے غائب تھے، کھڑکیاں باقی نہیں رہی تھیں، چھتیں موجود نہیں تھیں، کڑیاں بالے اور شہتیر اُتار لئے گئے تھے۔ کچے مکانوں کے کھنڈر تو بہت بھیانک نظر آ رہے تھے۔ پکّے مکانوں کی سب اینٹیں، پتا نہیں کون سا جن اُٹھا کر لے گیا تھا۔ صرف ان کی بنیادیں باقی رہ گئی تھیں۔

میرے باپ نے پوچھا "ماجے! ہماری بستی پر عذاب کیوں نازل ہوا؟"

"مولوی صاحب جب گاؤں میں آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ گاؤں کے کھنڈر چپ چاپ تھے۔ ہم ان کھنڈروں کے دو وارث ان کے درمیان کھڑے پتھر بن چکے تھے۔ اس وقت گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی مسجد سے اذان کی آواز آئی تو پتھروں میں

جان سی پڑ گئی۔ ہم دونوں مسجد کی طرف لپکے۔ مسجد کے صحن میں مولوی صاحب کھڑے اذان دے رہے تھے اور کھنڈروں سے کچھ اور لوگ بھی برآمد ہو رہے تھے۔

"ہم اکیلے نہیں ہیں۔ اکیلے نہیں ہیں۔" میں نے سوچا۔

"موج دین تم؟—— ماہنے تم کب پہنچے؟" یہ بابا حیات کی آواز تھی۔

اُس نے آگے بڑھ کر ہمیں باری باری گلے لگایا۔ بابا حیات کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی تھے جو ہم سے بغل گیر ہوئے۔ اس وقت میں رو پڑا۔ بچھڑے لوگوں کے سینوں کی گرمی نے میرے دل کو پگھلا دیا تھا۔ مولوی جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "ماہنے! مرد لوگ رویا نہیں کرتے۔" میں نے سوچا' میں کب رویا' یہ تو دوسروں کے رُکے ہوئے آنسو تھے جو میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ "آؤ نماز پڑھیں۔ دل کو قرار مل جائے گا۔" دیگر کی نماز پڑھ کر ہم نے سلام پھیرا تو مولوی صاحب نے ہماری طرف منہ کر کے کہا "انسان بڑا سخت دل ہے۔ وہ عذاب سے نہیں ڈرتا اور عذاب اسے اچانک آ لیتا ہے۔ قرآن نے اجڑی بستیوں کو ہمارے لئے عبرت قرار دیا تھا۔ ہم نے انہیں قصے کہانیاں سمجھا۔ اب ہم اپنی آنکھوں سے اپنی ہی بستی کا عذاب دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ عذاب ہم پر کیوں نازل ہوا مولوی جی؟" میرے باپ نے پوچھا۔

"موج دینا! تم اتنے سیانے بیانے ہو کر بھی مجھ سے پوچھتے ہو کہ عذاب کیوں آیا۔ ذرا گردن جھکا کر اپنے گریبان میں دیکھو۔ تمہیں وہاں کچھ نظر آتا ہے؟"

"میں بہت گنہگار ہوں۔ یہ میرے گناہوں کی سزا ہے؟"

"نہیں!" بابا حیات بولا۔

مولوی صاحب نے اس کی طرف حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ عذاب نہیں' آزمائش ہے۔" بابا حیات نے کہا۔

"نام بدلنے سے کیا فرق پڑتا ہے چوہدری حیات!" مولوی صاحب بولے۔

"مولوی جی! بڑا فرق ہے۔ میں جب گاؤں سے ہو کر اپنے کنویں پر جا رہا تھا تو میرے جی پر بڑا بوجھ تھا۔ میں نے سمجھا' میری دُنیا تو میرا گاؤں ہے۔ یہ بستی اُجڑ گئی تو سمجھو ساری دُنیا اُجڑ گئی۔ اُجڑے ہوئے کنویں پر پہنچ کر میں نے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ مجھے دُور دُور تک اجاڑ بیابان نظر آیا تو میرا دل بنجر ہو گیا۔ کنویں پر اَن درختوں کے ٹھنٹھ مجھے بھتنے

لگے جن کو میں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ مال ٹوٹ کر کنویں میں گر پڑی تھی۔ ڈھول اور چرکڑ چر مُر ہو گئے تھے۔ منڈیروں سے اینٹیں اُکھڑ کر کنویں میں گر گئی تھیں اور میری ڈھاری کی چھت بیٹھ گئی تھی۔ جس علاقے میں درخت نہ رہیں' وہاں سے پنچھی اُڑ جاتے ہیں۔ چار کھونٹ سَنّاٹے تھے اور کسی چڑی جنور کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ڈھاری کے پیچھے بیری کا ایک مریل سا سوکھا سڑا پودا تھا۔ کبھی اتنے درختوں کے جھنڈ میں میں اُس کے وجود سے بھی واقف نہیں تھا۔ اُس کی ایک شاخ پر دو چار ہری بھری پتیاں تھیں اور آج مجھے اپنے علاوہ ساری دُنیا میں وہی پودا زندہ نظر آیا۔ پھر اچانک اُس کی شاخ پر ہرے رنگ کی ایک چڑیا آ بیٹھی اور شاخ جھولنے لگی۔ چڑیا نے چوں چوں کی' تو میں چونک گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اُس نے اپنی گول مٹول آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ کر پوچھا "چوں چوں چوں۔ تم آ گئے؟ تم آ گئے؟ اور مولوی جی! سچ جانو۔ اُس ایک پل کے اندر اندر میرا کنواں آباد ہو گیا۔ ڈھول اور چرکڑ چلنے لگے۔ پانی کی دھار بَل کھا کر کھیتوں میں پہنچی تو کھیت جاگ اُٹھے۔ ہری بھری فصلیں لہلہانے لگیں۔ میں نے گاؤں کی طرف دیکھا تو وہ یکدم آباد ہو گیا۔ میں نے اس کی گلیوں میں لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھا۔"

"چوہدری حیات! تم نے جاگتے میں خواب دیکھا۔" مولوی جی بولے۔

"ایک پیغمبری خواب۔" میں نے کہا۔

مولوی صاحب نے مجھے پہلے ذرا غصّے کی نگاہ سے دیکھا' پھر وہ مسکرانے لگے "چوہدری حیات! تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ عذاب ہوتا تو ہمارا ایمان گاؤں کے کھنڈروں میں دفن نظر آتا۔ چونکہ ایمان زندہ ہے! اس لئے یہ آزمائش ہے۔ ہم انشاء اللہ اس آزمائش میں پورے اتریں گے۔"

☆ ☆ ☆ ☆

باب ۲۵

○

اس وقت میں ۱۹۴۶ء کے آغاز سے نو سال کے فاصلے پر کھڑا ہوں!

میں ان نو سالوں کے متعلق کچھ نہیں لکھوں گا۔ اس لئے نہیں کہ میرے گاؤں کی کہانی ختم ہو چکی ہے۔ کہانی کا دوسرا نام زندگی ہے اور زندگی کہیں نہیں رکتی۔ اس کے دھارے کا رُخ بدل جاتا ہے۔ کبھی اس میں پانی کم ہوتا ہے، کبھی یہ کناروں سے چھلک جاتی ہے۔ کبھی طوفان آتے ہیں، کبھی پایاب پانی اتنے سکون کے ساتھ بہتا ہے کہ اس کی لہروں پر کوئی بلبلا بن کر پھٹتا نظر نہیں آتا۔ انسان بھی تو پانی کا بلبلا ہے۔ ان نو سالوں میں کئی بلبلے پھٹے اور اُن کی جگہ دوسروں نے لے لی۔ گاؤں آباد ہوا، کھیت سرسبز ہوئے، دھرتی کی کوکھ سے نئے پودوں نے جنم لیا اور اُس کی گود میں پروان چڑھے اور تپتی دوپہروں میں ان کی چھاؤں تلے تھکے ہارے کسانوں کو ٹھنڈی میٹھی نیند کا مرہم ملا۔ گاؤں کے ٹیوب ویل پھک پھک چلنے لگے اور بھا اسلم کی دکان پر پھر سے گاؤں والوں کی محفلیں لگیں۔ دوستیوں اور دشمنوں کا نیا دور چلا۔ ملک کی سیاست نے کئی رُخ بدلے۔ مداری تماشا دکھاتے رہے اور پتلیاں ناچتی رہیں۔ ایک اور جنگ ہوئی۔ اس میں کوئی ولولہ زندہ نہ ہوا۔ وطن کا ایک حصہ اس سے جدا کر دیا گیا۔ یہ اتنا بڑا حادثہ ہے کہ اس کے متعلق مجھے کچھ ضرور لکھنا چاہیے۔

پر میں ابھی کچھ نہیں لکھوں گا!

کیونکہ نو سالوں کا فاصلہ ابھی میرا ماضی نہیں بنا۔ ابھی میں اپنے حال کے میدان کے عین درمیان میں کھڑا ہوں اور میرے سر پر دوپہر کا سورج چمک رہا ہے۔ اس کی کرنوں میں ننگی برچھیوں کی چمک ہے اور میری آنکھوں میں چکاچوند ہے۔ میدان میں کہیں سبز گھاس کا فرش ہے، کہیں کلر پھیلا ہوا ہے۔ کسی جھاڑی میں کانٹے ہی کانٹے ہیں، کہیں ان کانٹوں میں اُلجھا ہوا کوئی پھول بھی ہے۔ کبھی لُو چلتی ہے اور کبھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔

کہیں گھاس سوکھ رہی ہے، کہیں اوس نے سوکھے تنکوں کے ہونٹ بھی تر کر دیے ہیں اور ابھی میں اس میدان کے عین درمیان میں کھڑا ہوں۔ نجانے کب میں اس کے دوسرے سرے پر پہنچوں گا اور کب حال میرا ماضی بن جائے گا اور اس سرے پر کھڑا ہو کر جب میں اس پر نظر دوڑاؤں گا تو بکھرے ہوئے پھول اور کانٹے ایک ہو جائیں گے۔ پھر میں ان کے متعلق لکھوں گا تو کہانی کا سلسلہ چل پڑے گا۔

پر یہ کہانی کہیں ختم نہیں ہو گی۔

کیونکہ کہانی کا دوسرا نام زندگی ہے۔

اور زندگی کے پرت بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے دن رات ایک ہی روپ کے دو رُخ ہیں۔ دن رات میں اور رات دن میں ڈوبتی رہے گی۔ آندھیاں چلیں گی، سیلاب اُمڈیں گے، گرمی سردی اپنا جوبن دکھائیں گی پر چاند وہی رہے گا اور سورج بھی اور زمین بھی۔

اور کہانی کا سلسلہ چلتا رہے گا!

☆ ☆ ☆ ☆

''میرا گاؤں''—ایک طائرانہ نظر

زیرِ نظر مقالہ دیہات میں رہنے والے ایک پروفیسر نے سپردِ قلم کیا ہے۔ یہ کوئی تنقیدی اور تحقیقی تحریر نہیں بلکہ ناول کی تفہیم میں معاونت کے لیے ایک توضیحی وتشریحی مقالہ ہے۔

☆

پاکستان کی کل آبادی کا تقریباً ستر فیصد حصہ دیہی علاقوں میں رہائش پذیر ہے۔ ماضی میں تقریباً اسی فیصد قومی پیداوار کا حصہ وہی لوگ زراعت سے پورا کرتے تھے۔ آج بھی صنعتی ترقی کے باوجود ہماری قومی پیداوار کا غالب حصہ وہیں سے فراہم ہو رہا ہے۔ دیہات میں زندگی جب بھی دشوار تھی اور اب بھی ہے۔ ملک کے اکثر دیہی علاقوں میں آج کے جدید دور میں بھی لوگوں کو بنیادی انسانی ضروریات میسر نہیں ہیں جن کی فراہمی کے لئے انھیں سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ انھیں شدید موسموں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ وہ قلیل مادی ذرائع کے باوجود صابروشاکر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ لہٰذا ان کی زندگی کا معاشی وثقافتی ڈھانچہ شہروں سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں زندگی کٹھن اور آمدنی کی شرح افزائش خاصی ست ہے۔ انھیں چار پانچ ماہ تک آمدنی کی توقع میں فصلوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ جبکہ اخراجات اتنا انتظار نہیں کر سکتے۔ اس طرح وہ صابر شاکر اور جفاکش ہو جاتے ہیں۔ وہ خود بھوکے رہ لیتے ہیں۔ جدید سہولتوں سے محروم رہ لیتے ہیں۔ وہ دگرگوں اقتصادی حالت میں زندگی بسر کر لیتے ہیں سادگی اختیار کرنا ان کی مجبوری ہے جو ان کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ اپنی اس جبلی کمزوری کے باوجود قومی پیداوار کی افزائش وفراہمی میں اپنا کلیدی کردار ادا کرنے میں مصروف وکھو ہیں۔

گاؤں سماجی اکائی کا دوسرا نام ہے جس کی معیشت کا انحصار زراعت پر رہا ہے۔ کسان کو اپنی سہولت وضرورت کے لئے مختلف خدمات درکار رہتی ہیں۔ اپنے آلات کو درست رکھنے کیلئے کاریگروں کی ضرورت ہوتی ہے جن کو وہ ششماہی بنیاد پر فصل کی کٹائی کے

وقت غلّہ کی صورت میں اجرت ادا کرتا ہے۔ یہی لوگ سیپی کہلاتے ہیں گویا یہ سارے لوگ معاشرے میں ایک دوسرے کے معین ہیں۔ تاہم بنیادی اور کلیدی کردار کسان کا ہے۔ جو اپنی پیداوار کم ہونے کے باوجود اپنے سیپیوں کی اجرت انھیں ادا کرتا ہے۔ کیوں کہ سارے لوگوں کا انحصار اس کی کمائی پر ہے۔ پروفیسر نقوی صاحب کے ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ (ماہنے کی زبانی)

''تین کھیت تین دنوں میں کٹ گئے تو ہم نے گاہی شروع کر دی اس میں بھی کچھ زیادہ دن نہ لگے۔ اڑائی کیلئے ہم نے صرف ایک آدمی لگایا۔ جب بھوسا الگ ہوا اور گندم کا چھوٹا سا ڈھیر لگا تو میرا جی بیٹھ گیا۔ بڑھئی' لوہار' نائی' دھوبی' مولوی اور دوسرے سیپیوں کا حصہ دینے کے بعد گندم کا ڈھیر اور بھی کم ہو گیا۔ تو میں نے سوچا ''کسان کی کمائی میں کتنے لوگ شریک ہیں؟'' مجھے ڈھوم ڈھاری' میراثی' شیخ' بھرائیں اور کھیت منگتے یاد آئے جو کٹتی فصل میں سے اپنے حصے لے جا چکے تھے اور سلا چگنے والیوں نے گراپڑا خوشہ اٹھا لیا تھا اور پنچھی پکھیرو بچے کھچے دانوں سے اپنے پوٹے بھر چکے تھے اور کسان کے حصے کا ڈھیر گھٹتا رہا۔ گھٹتا رہا حتیٰ کہ چھ مہینوں کی محنت' سردی' گرمی' بیماری' دکھ اور لہو پسینے کا ڈھیر اس سے بلند ہو گیا''۔

سیپی لوگوں کو تو اجرت سارے گاؤں کے لوگوں سے آ جاتی تھی لہٰذا ان کا گزارا بخوبی ہو رہا تھا۔ صرف کسان ہی کم یافت تھا۔ گویا انتہائے سادگی سے کھا گیا ''کسان'' مات۔ یہی سیپی شہروں کا رخ کرتے رہے۔ انھوں نے کارخانے لگا لئے اور رفتہ رفتہ وہ کسان، جس کے یہ سب دست نگر تھے اب ان کا دست نگر بن گیا۔ یوں اب دیہاتوں کا (Socio-economic Structure) یکسر تبدیل ہو چکا ہے۔ اس سے پچھلی صدی کے نصف آخر میں دیہی کلچر اور سٹرکچر میں بڑے دوررس نتائج کی حامل تیز تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ سائنسی ترقی کی بدولت اب ہماری زراعت جدید خطوط پر استوار ہو رہی ہے۔ فرسودہ طریقہ ہائے کاشت کاری کی جگہ جدید طریقوں کو اپنا لیا گیا ہے۔ آلاتِ کاشتکاری بھی نئے اور سریع الرفتار آ گئے ہیں۔ جن کی تیاری و مرمت ورکشاپوں میں ہوتی ہے۔ گاؤں کا لوہار اور ترکھان انھیں ٹھیک نہیں کر سکتا لہٰذا اس نے بے کاری کے خوف کے

پیش نظر شہروں کا رخ کر لیا ہے اور کارخانوں اور ورکشاپوں میں کام شروع کر دیا ہے۔ تاہم دیہاتوں میں ابھی کئی دوسرے لوگ مثلاً حجام وغیرہ کی بدولت سیپی کلچر تھوڑا بہت موجود ہے۔

زن' زر اور زمین کے باعث دیہاتوں میں کبھی کبھار جھگڑے شروع ہو کر نسل در نسل دشمنیاں پیدا کرتے ہیں۔ ان استثنائی واقعات کے علاوہ آج بھی دیہاتوں کا ماحول پیار و اخوت میں رنگا ہوا ہے۔ یہاں تمام لوگ باہم ایک زنجیر کی طرح آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ جس میں کبھی کبھار اپنے شملے کو اونچا کرنے کے لئے ایک غیر محسوس طریقے سے طبقاتی تصادم جنم لے لیتا ہے۔ اور خود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن آپس میں رشتوں کی زنجیر نہیں ٹوٹتی۔ اور تعلقات کی برابری کی سطح پر تجدید ہوتی رہتی ہے۔

پاکستان میں دیہی کلچر دو واضح حصوں میں منقسم ہے۔ جو اپنے اپنے مخصوص معاشی ڈھانچوں کے زیر اثر نمو پذیر ہو کر پروان چڑھے ہیں۔ دونوں کی اپنی علیحدہ علیحدہ شناخت اور علیحدہ علیحدہ خصائص ہیں۔ ان میں پہلی قسم جاگیردارانہ کلچر کی ہے۔ جس کی بھونڈی سی بازگشت ہمیں ٹی۔وی ڈراموں اور فلموں میں سنائی دیتی ہے۔ اس کلچر کے تحت تمام قابل کاشت زمین اور دوسرے ذرائع پیدائش کا مالک و مختار جاگیردار ہے۔ جو مہربانی اور بندہ پروری کرتے ہوئے بے زمین کاشتکاروں کو اپنی زمین بٹائی پر دے دیتا ہے۔ اس طرح اس گاؤں میں تمام کاشتکار اور غیر کاشتکار اس کے ماتحت ہیں۔ وہ شبانہ روز محنت کرتے ہیں۔ جاگیردار کے مفادات کا تحفظ بھی ان کی ذمہ داری ہوتی ہے، جس سے ذرا سا بھی اغماض قابلِ تعزیر جرم ہے۔ اس جرم کا فیصلہ صادر کرنے کے لئے اسی جاگیردار کا ڈیرہ بطور عدالت اور جاگیردار بطور مدعی و جج کے کردار ادا کرتا ہے۔ بطور سزا جاگیردار ان کو اپنی زمین سے موقوف کر کے ان کی قوتِ لایموت بھی چھین سکتا ہے۔ گاؤں سے نکال کر ان کی تذلیل بھی کر سکتا ہے۔ وہ ان کے جسموں کے علاوہ ذہنوں کو بھی اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہے۔ لہٰذا پیٹ کے ہاتھوں مجبور مزارعین گونگے اور بہرے بن جاتے ہیں۔ اس طرح ان دیہاتوں میں آجر اور آجیر کی محویت جابرانہ نظامِ معاشرت کو جنم دیتی ہے، جس کو پراپیگنڈہ کے شوقین ادباء و شعراء نے بڑی ہوا دی ہے۔ اور ادب میں اس کلچر کی مبالغہ آمیز عکاسی کی ہے۔ یہ کلچر ہمارے ملک کے وسطی اور جنوبی علاقوں میں موجود ہے۔

پنجاب کے شمالی اضلاع میں ہمارے دیہی کلچر کی ایک دوسری قسم پائی جاتی ہے۔ جس

ہیں لوگ برابری کی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں ہر کسان کی تھوڑی بہت اپنی زمین ضرور ہوتی ہے۔ تاہم وہ اپنی بڑھتی ہوئی معاشی ضروریات کے پیش نظر کسی دوسرے سے چند کھیت بٹائی یا ٹھیکہ پر لے لیتا ہے۔ ہر گاؤں میں ایک آدھ کسان کی زمین زیادہ ہوتی ہے جو وہاں کا چوہدری یا نمبردار ہوتا ہے۔ یہاں خواہ کسی کی زمین تھوڑی ہے یا زیادہ وہ آپس میں برابری کی بنیاد پر تعلقات قائم کرنا پسند کرتے ہیں۔ تاہم چوہدری اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کیلئے دوسروں کے حقوق کا استحصال کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ جس پر دوسرے کڑھتے ضرور ہیں اور موقع ملنے پر اس کا بدلہ بھی ضرور لینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی دوسری ہلکی پھلکی رقابتیں اس کلچر کا لازمی حصہ ہیں۔ ہمارے اردو ادب میں اس کی عکاسی بھی قدیم دور سے ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب ''اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش'' میں دیہات نگاری کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''دیہاتی افسانے کے اولین افسانہ نگار منشی پریم چند نے دیہات کو زمانی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور اس ماحول کو صحت مند اخلاقیات کے فروغ کیلئے استعمال کیا۔ پریم چند کے سامنے ایک واضح سماجی مقصد تھا۔ تاہم انھوں نے اس مقصد کو افسانے پر غالب نہیں آنے دیا۔ چنانچہ انھوں نے دیہات پر اتنے جاندار افسانے تخلیق کئے کہ تھوڑے عرصے میں ان کی تقلید بڑے پیمانے پر ہونے لگی .... افسانے میں دیہات نگاری کا دوسرا زاویہ کرشن چندر نے پیش کیا۔ انھوں نے کشمیر کے دیہات کو تاج محل کی مرمریں جالیوں کی نسبت دے دی۔ تاہم ان جالیوں سے غربت اور افلاس کی چیخیں بھی وافر مقدار میں بلند ہوتی ہیں۔ کرشن چندر نے واضح طور پر ترقی پسند تحریک کے اشتراکی نقطہ نظر کو پیش کیا ہے .... کرشن چندر نے جو تصویریں کشمیر میں اتاری تھیں احمد ندیم قاسمی نے ان کے نئے پرنٹ وادیٔ سون سکیسر کے دیہات میں اتارے اور قریباً یکساں تاثر پیدا کیا۔

دیہات کی پیش کش میں ایک اور زاویہ بلونت سنگھ نے پیدا کیا۔ اس کے ہاں دیہات

غیر تربیت یافتہ قوت کا خارجی مظہر ہے۔ بلونت سنگھ نے اس قوت کو لمحے سے مسرت اکتساب کرنے میں صرف کیا ہے .... غلام الثقلین نقوی کا دیہات یکسر خیر کی علامت ہے۔ اس نے اس دیہات کی تقدیس اور محبت کا زاویہ ابھارا ہے''۔

ان افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مطالعہ کریں گے تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ ان کے افسانوں کے پس منظری دیہات افسانہ نگار کے پیدائشی علاقوں سے مخصوص ہیں۔ مثلاً پریم چند ہمیں بنارس کے دیہی کلچر کی ہو بہو تصویریں پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ تو ان کی پیروی میں بلونت سنگھ صرف وسطی پنجاب کے سکھ کلچر کو پیش کر رہا ہے۔ کرشن چندر گو پنجاب میں پیدا ہوئے تاہم ان کی کہانیوں کا پس منظر ہمیشہ کشمیر ہی رہا۔ بے شک ان کی پیدائش کا ضلع کشمیر کا قریبی ضلع ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی کہانیاں وادیٔ سون سکیسر ضلع سرگودھا کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ جو کہ ان کا آبائی علاقہ ہے۔ جدید کہانی کار راجندر سنگھ بیدی کا آبائی تعلق تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ سے ہے۔ لہٰذا ان کی دیہاتی پس منظر کی حامل کہانیوں میں اس علاقے کی عکاسی ملتی ہے۔ جبکہ ان کا اکلوتا ناول ''اک چادر میلی سی'' کا پس منظر بھی یہیں کا ہے۔ اسی طرح پروفیسر غلام الثقلین نقوی کا آبائی تعلق بھی ضلع سیالکوٹ سے ہے لہٰذا ان کی کہانیوں کے پس منظر میں اس ضلع کے دیہاتوں کا آ جانا کوئی حیران کن بات نہیں۔

افسانے کے مقابلے میں ناول کا کینوس بڑا وسیع اور کشادہ ہوتا ہے۔ اگر ناول میں دیہات نگاری کی جائے تو اس میں دیہات پر ہمہ پہلو بات ہو سکتی ہے۔ اور کلچر کو بطریق احسن پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر غلام علی الانا نے اپنی کتاب ''زبان اور ثقافت'' میں ثقافت کے اجزا بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

> ''ثقافت کے دائرے کے اندر لوگوں کی روزانہ کی زندگی، خوراک، گزر و معاش، لباس، رہن سہن، زبان، رسم و رواج، زراعت اور اس کے ذرائع آ جاتے ہیں''۔

اگر ہم ان تمام اجزاء کو دیکھیں تو بزرگوں کی اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ ہر بارہ کوس پر ثقافت میں تھوڑی سی تبدیلی آ جاتی ہے۔ اس قاعدے کے مطابق سارے پاکستان کا کلچر ایک نہیں۔ ہر صوبے کا کلچر بھی ایک نہیں ہو سکتا۔ ہاں تھوڑے تھوڑے علاقوں کا کلچر ہو بہو ایک ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی ناول ان اجزاء میں سے زیادہ تر کسی علاقہ سے متعلقہ بیان کر رہا ہو تو

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول کا پس منظر فلاں علاقے پر مشتمل ہے۔ ضلع سیالکوٹ کے دیہی پس منظر میں لکھے جانے والے تین ناول اب تک میری نظر سے گزرے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ اس علاقہ کی ثقافت کو ان کا کس حد تک پس منظر بنایا گیا ہے؟ اور وہ کس حد تک کامیابی سے ہم کنار ہوا ہے؟

ان میں سب سے پہلا ناول راجندر سنگھ بیدی کا ''اک چادر میلی سی'' ہے جو ۱۹۶۰ء میں لکھا گیا اور رسالہ ''نقوش'' کے دو شماروں میں چھپا۔ کتابی صورت میں پہلی بار مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ جس میں ہندو معاشرت کے ایک اہم مسئلے بیوہ عورت کی دوسری شادی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ راجندر سنگھ نے اس ناول کو تحصیل ڈسکہ کے ایک گاؤں ڈیکی میں Locate کیا ہے۔ یہی گاؤں ناول نگار کا آبائی گاؤں ہے۔ جس کا ناول میں نام کوٹلہ رکھا ہے۔ جبکہ اس کے اردگرد کے دیہاتوں کے نام بالکل اصلی ہیں۔ مثلاً ستوکی' بڈھا گورائیہ اور جاکے وغیرہ۔ ناول میں گاؤں کے نام کی تبدیلی کی ضرورت تو مقام تخصیص کی بجائے تعمیم کرنے کے لئے پیش آئی۔ جبکہ دوسری وجہ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی کی زبانی سنئے جو انہوں نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں لکھی ہے' لکھتے ہیں:

''راقم الحروف نے ایک ملاقات کے دوران راجندر سنگھ بیدی سے اس جگہ کے بارے میں دریافت کیا جہاں اس ناول کو Locate کیا ہے۔ تو انہوں فرمایا کہ یہ سیالکوٹ کی تحصیل ڈسکہ میں ایک گاؤں ہے جس کا نام بڑا عجیب ہے ''ڈل لے کی''۔

راجندر سنگھ کا اولین مقصد تو سکھ کلچر کے ایک اہم مسئلے کا بیان تھا۔ تاہم انھوں نے اپنی کہانی کو پس منظر دینے کے لئے ان تمام لوازمات کو بخوبی فراہم کیا ہے۔ مثلاً اس میں ان تمام قسم کے کرداروں کو ابھارا ہے جن سے ایک مخلوط معاشرہ ترتیب پاتا ہے۔ ان میں رانو' منگل سنگھ' سلامتی' تلوکہ' چودھری مہربان داس' نواب' اسماعیل وغیرہ۔ ان کرداروں میں ارتقا بھی موجود ہے اور اپنے ماحول سے مطابقت بھی۔ ناول میں دیہی رسم ورواج کا بیان بھی۔ ذریعہ معاش کا ذکر بھی ہے تو زرعی فصلوں کا تذکرہ بھی۔ ناول کی زبان اردو ہے۔ مگر اس اردو میں ضلع سیالکوٹ میں بولی جانے والی پنجابی زبان کی بڑی آمیزش ہے۔ مثلاً لفظ ''کوڑما'' بمعنی خاندان' دو بڑے وغیرہ جیسے۔

چوڑے والی بانہہ کنڈ کے
منڈا موہ لیا تو یتاں والا
دمڑی دا سک مل مل کے
منڈا موہ لیا تو یتاں والا

قصہ مختصر راجندر سنگھ نے ہماری ثقافت کی خوب عکاسی کی ہے تاہم اس کا مقصد اولین کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ دوسرا ناول قاضی ذوالفقار احمد کا لکھا ہوا ''قدم قدم پاکستان'' ہے۔ جو ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۱ء تک سیارہ ڈائجسٹ لاہور میں ''قدم بہ قدم'' کے زیر عنوان بالاقساط چھپتا رہا۔ اور ۲۰۰۰ء میں موجودہ عنوان کے تحت ابلاغ پبلشرز لاہور کی طرف سے پہلی بار کتابی صورت میں پیش کیا گیا۔ اس میں تحریک پاکستان کی کہانی کو زمانی ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ اور پاکستان کے ایک علیحدہ ملک بن جانے کے ثمرات کا تذکرہ خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ قاسمی صاحب تحصیل ڈسکہ کے ایک مشہور گاؤں بیگووالہ میں پیدا ہوئے۔ جو ضلع سیالکوٹ کے ایک مشہور برساتی نالہ ''ایک'' کے کنارے آباد تھے۔ ناول کو اسی گاؤں میں Locate کیا ہے۔ تاہم وہاں اس کا نام بیگ پور ہے۔ ایک ملاقات میں راقم الحروف کو قاسمی صاحب نے خود بتایا کہ ناول میں گاؤں کے نام کی جزوی تبدیلی کے علاوہ باقی سب کچھ ٹھیک اور اصلی ہے۔ مثلاً:

ریتاں والا قبرستان' صوبہ پتی (خاندانی نام) اور لاہور سے اس کا باسٹھ میل کا فاصلہ اور اسی ڈویژن میں ہونا۔ سب باتیں درست ہیں۔ بلکہ ناول میں کئی داخلی شہادتیں بھی بیگ پور کو بیگووالہ ثابت کرتی ہیں۔ ناول کے کرداروں میں ارتقا کی بجائے مثالیت زیادہ ہے۔ تاہم ناول نگار نے اپنے گاؤں میں پیش آنے والے چند ناپسندیدہ قتل و غارت کے واقعات اور باہمی دشمنی کو اپنے ناول میں بڑی خوبصورتی سے سمویا ہے۔ ہندو ذہن کی مکارانہ چالوں کا پول کھولا ہے۔ لیکن علاقوں کے رسم ورواج اور دیگر باتوں سے اغماض برتا ہے۔ بلکہ اپنی کہانی کے بیان کو اولیت دی ہے۔ یوں ناول سے اس علاقے کی ثقافت معدوم ہوگئی ہے۔

تیسرا ناول ''میرا گاؤں'' ضلع سیالکوٹ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جس کو پروفیسر غلام الثقلین نقوی نے شہر سیالکوٹ کے شمال میں دریائے چناب کے کنارے سید پور اور چپراڑ روڈ پر واقع گاؤں ''گل بہار'' کے درمیان میں Locate کیا ہے۔ بے شک ناول نگار کے آبائی گاؤں بجڑ تھہ سے قریب ہی ایک گاؤں مراد پور کے نام کا موجود ہے۔ مگر ناول والا چک مراد شہر سیالکوٹ کا مضافاتی گاؤں مراد پور نہیں ہے۔ اور نہ ہی نقوی صاحب کا گاؤں بجڑ تھہ کا تبدیل

شدہ نام۔ کیونکہ بھڑتھ اور مراد پور سیالکوٹ کے مضافاتی گاؤں ہیں وہ کبھی بھی Typical گاؤں نہیں رہے۔ بلکہ وہ شہر کی قربت کے باعث شہر میں آنے والی جدید تبدیلیوں سے جلد اثر پذیر ہوتے رہے ہیں۔ خود نقوی صاحب نے وضاحت کر دی ہے۔

''میں نے اس ناول میں جس گاؤں کی تخلیق کی ہے اس کا حدود اربعہ اس گاؤں سے بالکل مختلف ہے جسے میں نے چک مراد کا نام دیا ہے۔ اس تصنیف کے دوران یہ گاؤں میرے تخیل میں آباد رہا۔ میں نے اس گاؤں میں پورے پاکستان کو آباد دیکھا ہے۔ یعنی قطرے میں دجلہ نظر آتا رہا۔ اس کی گلیوں میں چلنے پھرنے والے لوگ میرے ساتھ مصروف رہے ہیں۔ میں ان کے دکھ درد میں شریک رہا۔ وہ میرا دل بہلاتے رہے۔ اور میں اس چھوٹی سی دنیا میں کہیں مگن رہا''۔

(دیباچے سے اقتباس)

یہاں اس اقتباس سے یہ حقیقت عیاں ہوگئی ہے کہ چک مراد میں کرداروں کی کہانی بیان نہیں کی گئی بلکہ کرداروں کی زبانی گاؤں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہاں ناول نگار کا مقصد کسی مذہبی یا تاریخی پہلو کو اجاگر کرنے کے لئے دیہاتی پس منظر پیش کرنا نہیں۔ بلکہ خالصتاً دیہاتوں میں جدید دور کی ایجادات و افکار کے باعث رونما ہونے والی مثبت تبدیلیوں کے تسلسل کی تاریخ بیان کرنا ہے۔

''میرا گاؤں'' واحد ناول ہے جس کے نام ہی سے دیہی کلچر کی بو آ جاتی ہے۔ یہ ناول دسمبر ۱۹۷۰ء سے اپریل ۱۹۷۵ء کے درمیانی عرصہ میں لکھا گیا۔ اور ڈاکٹر وزیر آغا کے ادبی مجلّے ''اوراق'' میں قسط وار چھپتا رہا۔ مکمل ہونے پر پولیمر پبلکیشنز لاہور کے توسط سے پہلی بار کتابی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اس ناول کو مرکزی کردار عبدالرحمٰن عرف ماہنے کی زبانی بیان کیا گیا جو اپنی محدود تعلیم کے باوجود زمانی شعور رکھتا ہے۔ ہر باب میں وہ زمانے کا تعین کر دیتا ہے۔ ہم نے ابتداء میں دیہی کلچر کی دو واضح اقسام بیان کی تھیں۔ اس ناول کا تعلق دوسری قسم سے ہے۔ یعنی غیر جاگیردارانہ کلچر کی۔ خود نقوی صاحب لکھتے ہیں:

''چک مراد کسی جاگیردار کا گاؤں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے کسانوں کا گاؤں ہے۔ اس گاؤں کا بڑا چودھری بیس پچیس کھیتوں کا مالک ہے۔ لیکن دو دو تین کھیتوں کے مالک بھی سماجی لحاظ سے اپنے آپ کو اس کے برابر جانتے ہیں۔ تاہم ان دو طبقوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ موجود ہے اور طبقاتی تصادم اس فاصلے کی پیداوار ہے۔ ٹریکٹر اور ٹیوب ویل، بجلی اور کھاد کی وجہ سے ممکن ہے کہ یہ فاصلہ بڑھ جائے لیکن برادری اور اپنائیت کا رشتہ پھر بھی ختم نہیں ہوگا''۔

پھر ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے ایک پاکستان ناول قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں پچھلے سو سال سے پنجاب ہی اردو زبان اور ادب کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ جس کے شہروں میں ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ لہٰذا پریم چند کے بعد ''میرا گاؤں'' پہلی بار دیہی کلچر کو اس کی قرار واقعی شکل میں پیش کر رہا ہے۔

رسم دنیا ہے کہ ہر کسی کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کا مشاہدہ بڑا تیز ہے۔ میں یہاں نقوی صاحب کے لیے یہی بات کہہ رہا ہوں رسماً ہرگز نہیں بلکہ حقیقتاً...... انھوں نے اگر گاؤں کی کہانی لکھی ہے تو گلیوں کی نکڑوں میں ہونی والی ملاقاتوں اور بچی محبت کی گھاتوں کا ذکر بلا مبالغہ کیا ہے۔ پنجابی فلموں کی ہیروئنوں اور ولنوں کے ڈائیلاگ نہیں دہرائے۔ بلکہ ان گھاتوں اور ملاقاتوں پر تقدیس کا دبیز پردہ ڈالے رکھا ہے۔ کسی بات کو عریاں کر کے سماجی تذلیل کا موقع فراہم نہیں کیا۔ تاہم اخلاقی کمزوری ہر جگہ ہے۔ تو دیہاتوں میں بھی یہ خارج از امکان نہیں۔ علاوہ ازیں نقوی صاحب کے مشاہدہ کی اس وقت داد دینا پڑتی ہے جب دوسری زرعی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ محکمہ مال کی مخصوص اصطلاحات خسرہ نمبر، جمع بندی اور مربع بندی کا کما حقہٗ وہ شعور رکھتے ہیں۔ حالانکہ آج کل کسانوں کی اپنی ذریت تو ان ناموں سے نابلد ہے۔ بلکہ کاشتکاری میں مشینی عمل دخل بڑھنے کے باعث وہ زرعی عمل اور اس سے متعلقہ دوسری باتوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں ناولوں کے علاوہ آج تک اردو زبان میں جتنے بھی ناول لکھے گئے ہیں۔ دیہاتوں یا شہروں کو ناول نگار اپنے کرداروں کی کہانی بیان کرنے کے لئے بطور منظر استعمال کرتے ہیں۔ ''میرا گاؤں'' شاید پہلا ناول ہے۔ جس میں مرکزی کردار ایک گاؤں کی کہانی بیان کرتا ہے۔ گویا اس ناول میں گاؤں بھی ایک کردار ہے۔ بے شک اس میں چند ایک کردار اپنے ارتقا اور عمل کے باعث بے مثال حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ جن کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ دور نہیں صرف ناول کا واحد متکلم کردار

ماہنا کردار نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ چودھری' اس کا بیٹا صلی' شیماں' چاچا رحمت اور ریشم کے کردار بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن ناول نگار کی توجہ ان کی کہانی بیان کرنے کی طرف نہیں بلکہ ان کے ذریعے گاؤں کی کہانی بیان کرنے کی طرف مبذول رہی ہے۔

ہندوستان کی معلوم حد تک تاریخ میں کوئی ایک بھی دور ایسا نہیں آیا جس میں دیہی علاقوں کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دی گئی ہو۔ دیہاتوں اور دیہاتیوں کی صرف شہروں کو اناج مہیا کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا تھا۔ اور انہیں گنوار کہہ کر قابل التفات نہ سمجھا گیا۔ حالانکہ اس ملک کی آبادی کا غالب حصہ دیہاتوں میں رہ رہا ہے۔ یہاں صرف انگریز کے دور میں دیہاتوں اور دیہاتیوں کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دی گئی۔ زمینوں کے کاغذات تیار ہوئے۔ نہریں کھود کر زمین سیراب کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ مالیہ کی وصولی کو باضابطہ بنایا گیا۔ مگر پاکستان بننے کے بعد دیہاتوں کو پھر درخور اعتنا نہ سمجھا گیا۔ ہر حکومت زبانی دعوے کرتی رہی۔ دیہات سدھار قسم کے منصوبے بنتے رہے مگر عملی طور پر کبھی کچھ نہ ہوا۔ بیسویں صدی کا نصف آخر جدید سائنس کی ترقی کا دور ہے۔ مگر ہمارے علاقے میں ساٹھ کی دہائی دیہی ترقی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں جدید سائنس کے ثمرات دیہاتوں میں پہنچے۔ دیہاتوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے کئی اہم اصلاحات کو نافذ کیا گیا' ملکی معاملات میں دیہاتیوں کی شرکت کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ یہ اور اس جیسی دوسری کئی ایک اصلاحات کو اس ناول میں بیان کیا گیا ہے۔ جسے ہم بجا طور پر دیہی ترقی کی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ وہ یوں ہے:

اس داستان ترقی کا عرصہ ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۷۵ء کا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں عبدالرحمٰن عرف ماہنا چوتھی جماعت میں تھا جب اس کے گاؤں میں آٹا پیسنے والی مشین لگی۔ اور چک مراد نے ترقی کی طرف پہلا قدم اٹھایا۔ دیہاتوں میں ہماری مائیں بہنیں کبھی آٹا ہاتھ سے گھمانے والی چکی پر پیستی تھیں۔ جو خاصا وقت طلب کام تھا۔ بعد ازاں خراس لگے جن پر بیل جوتے جاتے تھے۔ اور اب انجن سے چلنے والی چکی نے تو کئی مسائل ہی حل کر دیئے۔ انجن چلا اور منوں آٹا تھوڑے عرصے میں پیس ڈالا۔ لیکن ہر نئی چیز کی طرح چکی کے بارے میں لوگوں میں تشکیک پائی جاتی تھی۔

پاکستان کا بطور ایک آزاد ملک ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آنا ایک ناقابل

فراموش واقعہ ہے۔ جس کے باعث دنیا میں پہلی مرتبہ غیر منظم طور پر اتنی بڑی تعداد میں تبادلہ آبادی ہوا۔ کل کے ہمسائے آج کے دشمن بن گئے۔ ملک میں کسی قانون کا وجود نہ رہا۔ لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا لوگوں کے خون سفید ہو گئے۔ خون آشامی نے یہ رنگ دکھایا کہ ناحق گردنیں ماری گئیں۔ نئے آنے والوں کو اکثریت نے بادل نخواستہ قبول کیا۔ چک مراد میں صرف ایک مہاجر "بھا اسلم" آیا۔ جسے چودھری نے ہندوؤں کی متروکہ جائیداد بڑی مشکل سے دی۔

ساٹھ کی دہائی میں اشتمال اراضی کا قانون اب تک زرعی شعبہ میں ہونے والی اصلاحات میں سب سے زیادہ انقلاب آفریں تھا۔ پورے گاؤں کی زمین کی مربع بندی کر کے ایکڑوں میں تقسیم کر کے اور کسانوں کی باہم رضامندی سے ہر کسان کی ملکیتی زمین ایک جگہ اکٹھی اُسے دے دی گئی۔ تمام گاؤں کی مشترکہ زمین سے راستوں' قبرستان اور سکول کے لئے زمین کاٹ کر علیحدہ کر دی گئی۔ اب نہ ٹیڑھے میڑھے کھیت رہے نہ بل کھاتی پگڈنڈیاں۔ نہ چھوٹے چھوٹے کھیت باقی رہے اور نہ کسی کسان کے دور دور بکھرے ٹکڑے۔ زمین ایک جگہ آنے سے لوگوں نے ٹیوب ویل لگانے شروع کر دیئے۔ کھاد دیہاتوں میں متعارف ہوئی۔ پانی اور کھاد کے ملاپ سے خوب فصلیں پیدا ہونے لگیں اور کسانوں میں خوشحالی کا دور شروع ہو گیا۔ لیکن جہاں اس قانون سے دیہی ترقی کا نیا باب کھلا وہاں کچھ حیا سوز واقعات بھی رونما ہوئے۔ اشتمال اراضی کا سارا عمل پٹواریوں کے ہاتھوں سرانجام پاتا رہا۔ جن کی اکثریت پہلے ہی اخلاقی گراوٹ کا شکار تھی۔ نقوی صاحب کے بقول:

> "اشتمال کا کام بہت لمبا ہوتا ہے۔ پٹواری جوں کی چال چلتا ہے اور چھچھوندر کی طرح اندر ہی اندر سرنگ لگاتا ہے۔ اس لئے گاؤں کا ہر کسان اس سے ڈرتا ہے۔ اور اس سے دوستی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جس کنوئیں پر جاتا ہے لوگ اس کے سامنے بچھ بچھ جاتے ہیں۔ وہ سب کا دوست ہوتا ہے اور کسی کا دوست نہیں ہوتا"۔

پٹواری کے پاس گاؤں کی زمین کا حساب ہے۔ وہ دیہی معاشرے کا ایک اہم کردار ہے۔ نیم خواندگی کے باوجود بھی اپنے آپ کو علاقے کا آفیسر کہتا ہے۔ اشتمال کے وقت اس کی حیثیت تقدیر یزداں بنی ہوئی تھی۔ گویا کسانوں کا آئندہ کا سارا رزق ان کے ہاتھ میں تھا

لہٰذا وہ ان سے مال بٹورتا رہا بلکہ ان کی عزت پر بھی مجرمانہ حملے کرتا رہا مگر وہ چپ رہے یہاں تک کہ ایک لڑکی کو بھگا کر لے گیا مگر وہ پھر بھی چپ رہے کیونکہ وہ جبریت کا شکار تھے۔

۶۲۔۱۹۶۱ء ہی میں ملک کے اندر بنیادی جمہوریتوں کا نظام متعارف کروایا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب دیہاتیوں کے ووٹ کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ ورنہ قبل ازیں حکومت سازی میں ہمیشہ شہریوں کے کردار کو عمل دخل رہا تھا۔ اس نظام کے تحت دیہاتوں کو یونین کونسلوں میں تقسیم کر کے وہاں بی ڈی ممبرز کے الیکشن کروائے گئے۔ جن کے ذمے چیئرمین کا انتخاب اور دیہاتوں کے اجتماعی مسائل کا مقامی سطح پر حل کرنا تھا۔ دوران الیکشن لوگوں نے جو بدحواسیاں کیں ان کا دلچسپ بیان بھی ناول میں موجود ہے۔ دوسرے امور کی انجام دہی کے علاوہ بی ڈی سسٹم نے لوگوں میں بیداری کا شعور پیدا کر دیا۔ جس سے دیہاتوں میں ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی اور اکثر دیہاتوں میں غریب کسانوں نے متحد ہو کر سال ہا سال سے چودھریوں کے بنائے ہوئے مضبوط جابرانہ حصار کو ووٹ کی پرچی کے زور پر توڑ کر رکھ دیا۔ یوں ان نام نہاد چودھریوں کو دیہاتوں میں اپنی اہمیت کا اندازہ بھی ہو گیا اور ان کا بے جا غرور بھی خاک میں مل کر رہ گیا۔

دوسری بار بی ڈی الیکشن ۱۹۶۴ء میں ہوئے۔ لہٰذا چودھریوں نے حیلہ سازیوں کے ذریعے بی ڈی ممبرز منتخب ہونے میں عافیت سمجھی۔ صدر ایوب خاں نے ۲؍جنوری ۱۹۶۵ء کے دن صدارتی الیکشن کروانے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے بدنیتی کے تحت ملک کی پوری آبادی سے رائے لینے کے بجائے انہی بی ڈی ممبرز کے ووٹ لینا آسان خیال کیا۔ ایوب خان خود بھی صدارتی امیدوار تھا اور اس کا انتخابی نشان گلاب کا پھول تھا۔ اس کی مخالف تمام سیاسی جماعتوں نے ایک اتحاد تشکیل دے کر مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کو اپنا مشترکہ صدارتی امیدوار مقرر کیا جن کو لالٹین کا انتخابی نشان الاٹ ہوا۔ عوام کی خواہشات کے برعکس ایوب خاں سرکاری مشینری اور ناعاقبت اندیش بی ڈی ممبرز کے بل بوتے پر جیت گیا۔ نقوی صاحب کے ناول کا اس بارے میں اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''کچھ دنوں بعد صدارتی انتخاب منعقد ہوا۔ لالٹین اور گلاب کے پھول میں معرکہ ہوا۔ چونکہ ووٹ بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کے ہاتھ میں تھے۔ اس لئے لالٹین ہار گئی۔ اور گلاب کا پھول جیت گیا۔ لوگوں کو دکھ ہوا کہ قوم کی ماں کو جنھوں نے ملک کے چپے چپے کا دورہ کیا تھا، شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ووٹ ذیلدار کے بیٹے سلیمان جیسے لوگوں کے ہاتھ میں تھے۔ ہمارے ہاتھ میں ہوتے تو ہم انہیں ہارنے سے بچا لیتے''۔

دیہاتوں کو یکے بعد دیگرے جدید سہولتوں کی فراہمی جاری تھی۔ دیہاتوں میں بجلی کا پہنچ جانا دیہی ترقی کا ایک دوسرا روشن باب تھا۔ اب گھر روشن ہو گئے۔ انجنوں سے چلنے والے ٹیوب ویل بجلی کی موٹروں سے چلنے لگے۔ لوگوں کو سہولت میسر آ گئی۔ دیہاتوں سے پکی سڑکوں تک لنک روڈ تعمیر ہونے شروع ہو گئے۔ اس طرح فالتو غلہ کھیتوں سے منڈیوں تک آنے لگا۔ تانگے چلنے لگے یوں دیہاتوں سے شہروں کا فاصلہ کم محسوس ہونے لگا۔ ریڈیو کی نشریات وہاں سنائی دینے لگیں۔ اخبارات وہاں تک پہنچنے لگے۔ یوں دیہاتیوں کو بھی ملکی حالات کا پتہ چلنے لگا۔ اور انھیں بھی ملک کی سیاسی اور اقتصادی حالت سے آگاہی حاصل ہونے لگی۔ اس طرح دیہی زندگی بڑی تیز رفتاری سے ترقی کی منازل طے کر رہی تھی سبھی لوگ خوش و خرم تھے کہ اچانک ۶؍ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے اچانک سیالکوٹ ضلع کے دیہی سرحدی علاقے پر حملہ کر کے اس پر اپنا غاصبانہ قبضہ جما لیا۔ اس علاقے کے لوگ گھروں سے بے گھر ہو گئے۔ رشتہ داروں کے ٹکڑوں پر پلنے لگے۔ ان کی اقتصادی حالت یک دم تباہ ہو گئی۔ ان کے گھر تباہ ہو گئے۔ فصلیں اجڑ گئیں۔ جنگ نے سب کچھ تباہ کر کے رکھ دیا۔ چھ ماہ بعد معاہدہ تاشقند طے پانے کے بعد علاقے خالی ہوئے۔ اور لوگ واپس لوٹے۔ وہاں سب کچھ جل چکا تھا۔ بارود کی آگ نے زمین کا رنگ سیاہ کر دیا تھا۔

جلی مٹی کو دیکھ کر کسان حوصلہ ہار بیٹھے۔ کسان کا مٹی سے ماں کا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ اس سے رزق حاصل کرتا ہے۔ جب انھوں نے مٹی کو کریدا اور اسے زندہ دیکھا تو نئے حوصلے کے ساتھ از سر نو زندگی کا آغاز کر دیا۔ اور ان صابر و شاکر لوگوں نے جنگ کو ایک آزمائش سمجھ کر برداشت کر لیا۔

نقوی صاحب اردو زبان و ادبیات کے استاد تھے۔ اور ان کی عمر کا غالب حصہ تدریس زبان میں گزرا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جس زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے تو وہ زوال آمادہ تصور کی جاتی ہے۔ اردو زبان میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ بحیثیت استاد اردو زبان کو دیہی کلچر کے قریب لانے کی

غرض سے پنجابی زبان کی بے شمار تراکیب و اصطلاحات کو بے دھڑک اردو زبان میں استعمال کر جاتے ہیں۔ بیان کی عبارت آرائی کا کمال ہے کہ وہ قارئین کو کھٹکنے کے بجائے عبارت میں سلاست و بلاغت کی موجود خوبی کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ جدید مشینی طریقہ کاشتکاری نے بے شمار زرعی اصلاحات کو معدوم کر دیا ہے۔ جس کے باعث خود کاشتکاروں کی اولادان کے مفہوم سے نابلد محض ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کلاسک کا درجہ حاصل کر جانے والے ناول میں آنے والے زرعی و دیہی الفاظ کی مختصر فہرست تیار کر کے ان کا مفہوم بیان کر دیا جائے۔ تاکہ ناول کی تفہیم کماحقہ ہو سکے۔

الفاظ	معنی
اوتر نکھتر	بے اولاد
بتھوا	چوڑے پتے والے جڑی بوٹی۔ جس کا ساگ بھی پکتا ہے
پڑچھتی	لمبے لکڑی کے پھٹے پر ڈیزائن لگا کر کمرے کے اندر ذرا اونچا لگانے والی چیز جس پر گھر کے اضافی برتن رکھ کر تزئین کی جاتی ہے۔
پسار	گھر میں بڑا کمرہ جسے اب ڈرائنگ روم بولتے ہیں۔
پولا	گندم کا گٹھا
پیپے	لوہے (ٹین) کے کنستر کا منہ کاٹ کر بالٹی وغیرہ کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے
پہل چھلا	مئی جون میں برسات کے آغاز کی پہلی بارش
پچھاڑی	فصلوں کو نہر یا ٹیوب ویل سے سیراب کرنے کے لیے ہر کسان کی کی باری باندھی جاتی ہے۔ جس کی باری آخر میں آئے وہ پچھاڑی کہلاتا ہے۔
پھلے	گندم کے گٹھوں میں سے دانے نکالنے کے لیے درختوں کی باریک ٹہنیوں پر مشتمل ایک وزنی ٹھیلا
تربک	اچانک ڈر جانا
جمنا	کپڑے اور خورد نوش کا سامان جو بیٹی والے اپنے نواسے/نواسی کی

الفاظ	معنی
	پیدائش پر بیٹی کے سسرال لے کر جاتے ہیں
جوگ	بیلوں کی جوڑی
جھلار	کسی نالے سے پانی نکالنے کیلئے کنوئیں کا سامان نصب کر لینا۔
جھلنگا	ڈھیلی ڈھالی چارپائی جس کا بان ڈھیلا ہو کر زمین سے لگ رہا ہو۔
جھلانی	گھر میں چھوٹا کمرہ جسے دیہاتی بعض اوقات بطور باورچی خانہ استعمال کرتے ہیں۔
جھلونگی	چلتے پھرتے بھینسوں کا چارہ وغیرہ یا کوئی اور چیز ساتھ ساتھ اٹھائے رکھنے کے لئے ایک کپڑے کو کندھے اور کمر کے ساتھ باندھ لینے کو جھلونگی کہتے ہیں۔
چنگیں	آٹا مشین پر پسوائی کے لئے آنے والی گندم کی گھٹڑیاں
چنڈی	ہاتھ پاؤں پر مسلسل گھسنے سے جلد کا سخت نشان
چرخ کا تکا	لوہے کا ٹکڑا جو کنویں کو الٹا چلنے سے روکتا ہے
چک پھیریاں	گھومنا
ڈل	وہ کنواں جو زیر استعمال نہ ہو اور اس پر پانی نکالنے کا سامان نہ ہو۔
ڈھاری	چھوٹا اور کم اونچا برآمدہ
سہاڑ	ہل کی مدد سے کھیت میں بننے والی زمین دوز لکیر
سرلاٹا	بارش کی تیز بوچھاڑ
سلا	گندم کی کٹائی کے وقت گرے پڑے خوشے خواتین اکٹھے کر لیتی ہیں۔ ان جمع شدہ خوشوں کو سلا کہتے ہیں
سیپی	دیہاتی کاریگر جو کسان کے اوزار وغیرہ درست کرتے ہیں اور فصل کی کٹائی پر انھیں اجرت ملتی ہے
ساونی	فصل خریف جو اسوج' کاتک میں پک کر تیار ہوتی ہے۔ چاول' مکئی وغیرہ
کیارا	فصل کو آسانی سے سیراب کرنے کے لئے بوائی کے وقت وٹیں بنا کر کھیت چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ہر حصہ کیارا کہلاتا ہے۔

لفظ	معنی
گالا	آٹا پینے والی چکی میں ڈالے جانے والے دانے
لڑ	تہبند کو کمر سے باندھنے کیلئے کپڑے کے کونوں کو دوطرفہ پہلوؤں میں اڑس لیتے ہیں اور باقی کنارا نیچے کو لٹکایا جاتا ہے جو لڑ کہلاتا ہے۔ یہ غرور کی علامت بھی ہے
لاوے	فصل کی کٹائی کے وقت لگائے جانے والے مزدور جن کو روزانہ ایک گٹھا مزدوری ملتی ہے
ماہل	لوہے کے برتنوں کا باہم بندھا ہوا سلسلہ جو کنویں سے پانی باہر لاتا ہے
مینہ	فروری مارچ میں اگنے والی جڑی بوٹی
منجر	مونجی کے پودے پر لگنے والا خوشہ
ہاڑی	فصل ربیع جو مارچ اپریل میں پک کر تیار ہو جاتی ہے

ان الفاظ کے علاوہ بھی شاید کئی الفاظ رہ گئے ہوں۔ آخر میں اشارہ کرتا چلوں کہ نقوی صاحب نے تلمیحاً پنجاب کی رومانی داستانوں مرزا صاحباں اور رانجھے مہینوال کا ذکر بھی بڑے اچھے انداز میں کیا ہے۔

پروفیسر غلام غوث چیمہ
موضع تاجو کے ڈسکہ ضلع سیالکوٹ

☆☆☆

انتظار حسین کا ناول "بستی" اور غلام الثقلین نقوی کا ناول "میرا گاؤں" اپنے موضوع اور ماحول کے فرق کے باوجود ایک ایسے حادثے سے دوچار نظر آتے ہیں جو ان میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ حادثہ ہے "ہجرت"۔ ان دونوں ناولوں میں ایک اور مشترک پہلو "جنگ" کا بھی ہے۔ انتظار حسین کی "بستی" جب جنگ کی زد پر آتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک ایسے کھنڈر میں تبدیل ہو گئی ہے جس کے نیچے دب کر زندگی آہستہ آہستہ مر رہی ہے۔ دوسری طرف جب غلام الثقلین نقوی کا گاؤں جنگ میں برباد ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو ملبے کے نیچے دبنے کے باوجود مرنے نہیں دیتا اور سانس لیتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے۔ ان دونوں ناولوں کو اس پہلو سے بھی پرکھا جا سکتا ہے کہ ان میں سرحد پار سے آئے ہوئے دو مہاجروں کی داستان بھی اُبھری ہے۔ "بستی" کا مہاجر جب لُٹ پِٹ کر آتا ہے تو اُسے ترکے میں اوراقِ پارینہ کے ٹکڑے اور سرحد پار کی حویلی کا چابیوں کا گچھا ملتا ہے۔ وہ ان چابیوں سے اپنے ماضی کے زنگ آلود تالے تو کھول سکتا ہے مگر نئی بستی کے تالوں کو کھولنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ دوسری طرف "میرا گاؤں" کا مہاجر خالی ہاتھ گاؤں میں آتا ہے تو زندگی کے ہاتھ میں ہاتھ تھما دیتا ہے اور زندگی اس کے بدلے میں اُسے ایسی چابیوں کا گچھا عطا کرتی ہے جس سے اُس کی زندگی کے بند تالے از خود وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دونوں ناول شہری اور دیہی زندگی کے بنیادی مزاج کو سمجھنے میں بھی مدد دیتے ہیں: وہ یوں کہ انتظار حسین کی "بستی" ذاکر کو برس ہا برس اپنے پاس رکھنے کے باوجود اجنبی سمجھتی ہے جب کہ غلام الثقلین نقوی کا "میرا گاؤں" چند لمحوں کے لیے آئے ہوئے پردیسی اسلم کو یوں سینے سے لگا لیتا ہے جیسے ان دونوں کا جنم جنم کا ساتھ ہو۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

ایک اوریجنل تخلیقی ناول انسانی مشاہدے، حافظے اور تاریخی مطالعے کو عبور کر کے خود زندگی کے اندر مستور امکانات کو بروئے عمل لاتا ہے اور یوں زندگی کو احساس اور عمل اور سب سے بڑھ کر رشتوں کی ایک نئی آگہی دیتا ہے۔ یہ آگہی زندگی پر سے یکسانیت اور روٹین کے لگے زنگ کو اُتار پھینکتی ہے۔ نیز ناول کا یہ تخلیقی عمل زندگی کو خود اپنی داخلی قوتوں کے ساتھ فطری آزادی کی رہنمائی میں عمل آرائی کی سعادت بخشتا ہے۔ "میرا گاؤں" اُردو کے اُن معدودے چند ناولوں میں سے ہے جس میں مذکورہ اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

ناصر عباس نیّر

غلام الثقلین نقوی ۱۲ر مارچ ۱۹۲۳ء کو مقبوضہ جموں کشمیر کے ایک گاؤں "چوکی ہنڈن" ضلع نوشہرہ میں پیدا ہوئے، جہاں اُن کے والد سیّد امیر شاہ بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ سکول ریکارڈ کے مطابق، اُن کی تاریخِ پیدائش ۲۱ر مئی ۱۹۲۳ء ہے۔ آبائی گاؤں کا نام "بھڑتھ" ہے جو سیالکوٹ شہر سے شمال کی طرف تین میل کے فاصلے پر ہے، یہیں اُن کے بچپن اور لڑکپن کا بیشتر حصہ گزرا۔ پرائمری سکول بھڑتھ، سکاچ مشن سکول سیالکوٹ چھاؤنی، ڈی بی ہائی سکول دیپال پور، مرے کالج سیالکوٹ اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیمی قابلیت ایم اے (اُردو) بی ٹی تھی۔ سینتیس سال تک درس و تدریس کے پیشے سے منسلک رہ کر، ۲۰ر مئی ۱۹۸۳ء کو گورنمنٹ کالج لاہور سے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔
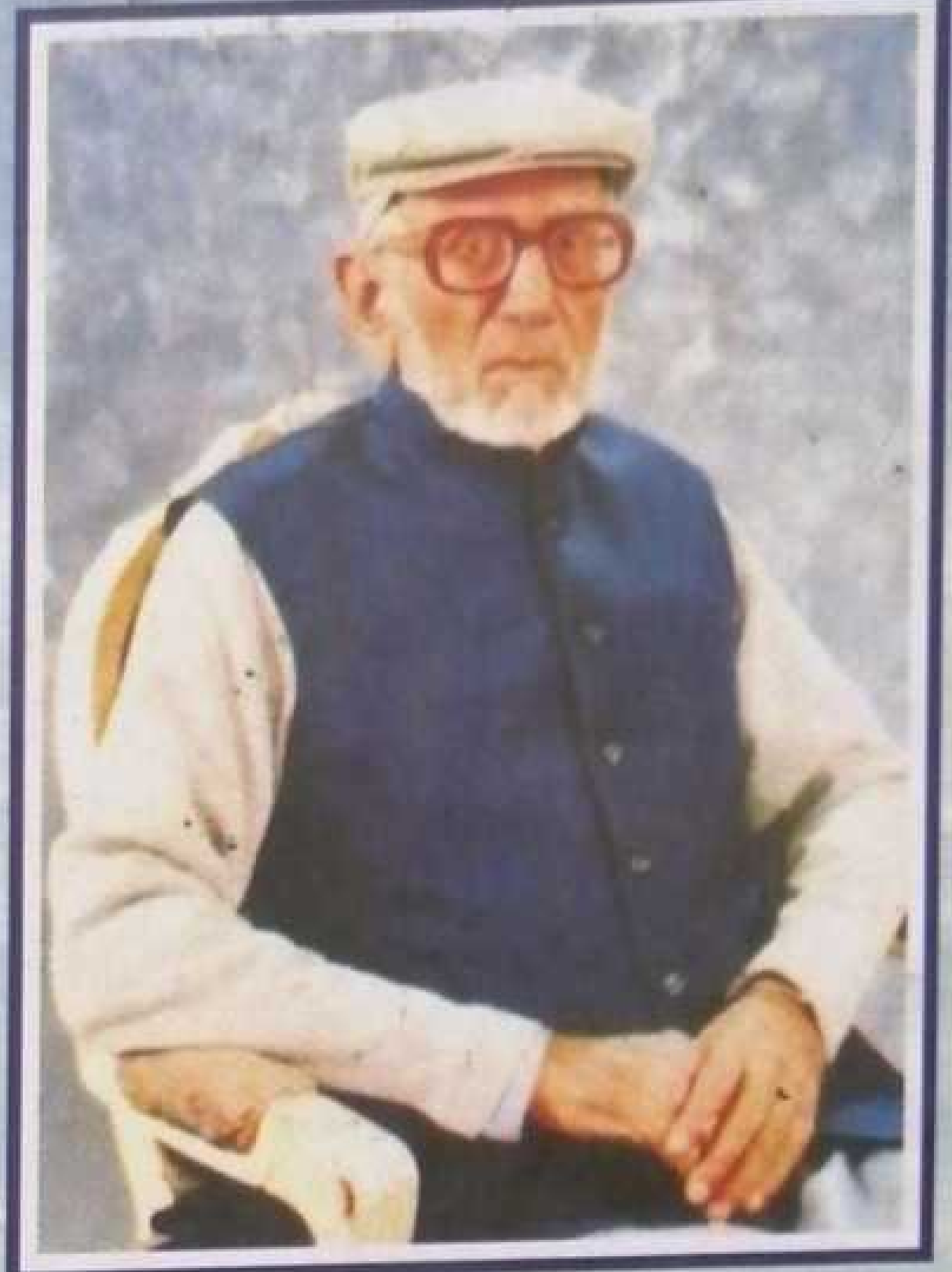
غلام الثقلین نقوی نے تیرہ تخلیقی کتابوں سے اُردو ادب کو مالا مال کیا۔ ۶ر اپریل ۲۰۰۲ء کو ۷۹ سال کی عمر میں، وفات پائی۔ چار بیٹے اور ایک بیٹی سوگوار چھوڑے۔ وقتِ مرگ، مکان نمبر ۱۰۰، بلاک اے ۴، پنجاب گورنمنٹ ایمپلائیز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور میں مقیم تھے۔

مصنّف کی تخلیقات

- بند گلی (افسانے)
- لمحے کی دیوار (افسانے)
- نغمہ اور آگ (افسانے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں)
- شفق کے سائے (افسانے)
- دُھوپ کا سایہ (افسانے)
- سرگوشی (افسانے)
- اک طُرفہ تماشا ہے (مزاحیہ مضامین)
- میرا گاؤں (ناول)
- عرضِ تمنّا (مکہ و مدینہ کا سفرنامہ)
- چل بابا اگلے شہر (لندن اور ویلز کا سفرنامہ)
- ٹرمینس سے ٹرمینس تک (سفرنامہ)
- تین ناولٹ (چاندپور کی نینا، شمیرا، شیر زمان)
- نقطے سے نقطے تک (افسانے)

IBLAGH PUBLISHERS

Grafixart